شاہجہاں کے ایّامِ اسیری

اور

عہدِ اورنگ زیب

مشہور فرانسیسی سیّاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ سالہ روزنامچہ (سنہ ۱۶۵۶ء ـ سنہ ۱۶۶۸ء)

جس میں

شاہ جہاں کے آخری دَور کا حال، اورنگ زیب کی بھائیوں سے کشمکش، مغل شہنشاہیت کے پسِ پردہ واقعات، اور اس دَور کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے

مُترجمہ

خلیفہ سیّد محمد حسین مرحوم

میر مُنشی ریاست پٹیالہ

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ، کراچی ۲

قیمت مجلد بارہ روپیہ

ناشر:- چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری
مالک نفیس اکیڈمی
بلاسس اسٹریٹ، کراچی

طبع اوّل: ـــــــــــ نفیس اکیڈمی، کراچی۔ اپریل ۱۹۶۰ء

کتابت: ـــــــــــ انوری بیگم دہلوی

مطبوعہ: ـــــــــــ انٹرنیشنل پریس، کراچی

عہدِ اورنگ زیبؒ کے چشم دید حالات

از محمد اقبال سلیم گاھندری

ڈاکٹر برنیر ایک فرنچ طبیب تھا جس نے محض ذوق جہاں بینی میں اپنی عمر کے بارہ سال ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء تک مغل دربار میں گذارے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں شہاب الدین محمد شاہجہان صاحبقران ثانی کا دور حکمرانی ختم ہوتا ہے اور محی الدین محمد عالمگیر ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ زمام شہنشاہی اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے وہ عالمگیر جس کی شمشیر جہانگیر کبھی قندھار و کابل میں چمکتی ہے اور کبھی برصغیر پاک و ہند کے آخری جنوبی گوشوں میں، اور جس کی مقناطیسی طاقت حکمرانی نے تاریخ کے وسیع و طویل دور میں سب سے پہلی مرتبہ اور مابعد کے واقعات گواہ ہیں کہ سب سے آخری مرتبہ بھی اس برصغیر کے حدود متعین کئے ۔ اتنے وسیع اور اس قدر عظیم الشان حدود جن کی پہنائیوں میں موجودہ دولت افغانستان، دولت پاکستان، آج کا بھارت، اور ملحقہ جزائر سب ہی داخل تھے۔

یہی وہ زمانہ ہے جس کو مغل تاریخ کا طالب علم "جنگ برادران" کے نام سے یاد کرتا ہے شاہجہاں کو نظر بند کردیا جاتا ہے۔ دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد یعنی ہر چہار برادران کے مابین شاہی و شہنشاہی کے لئے آویزش ہوتی ہے۔ بڑی پرانی مثل ہے۔ "دہ فقیر در گلیمے بہ خسپند و دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجند"

ایک کمبل میں دس فقیر تو گذران کر سکتے ہیں، لیکن ایک ملک میں دو پادشاہوں کی سمائی ممکن نہیں "جنگ برادران" کا حقیقی سبب تو یہی کلیہ ہے جس میں شاید چشم فلک نے بھی کبھی کوئی استثنا نہیں دیکھا۔ دارا شکوہ اور عالمگیر کے مابین آویزش ایک لازمی اور لابدی چیز تھی۔ اور اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ اس کائنات آب و گل کے تمام حوادث کا یہی نتیجہ نکلا کرتا ہے۔ فطرت عالم ہمیشہ سے بقائے اصلح کے اصول پر قائم ہے جو سب سے بہتر ہوگا وہی کامیاب ہوگا اور وہی باقی رہے گا۔ دوسرے اور تیسرے درجہ کی ہر چیز مٹ کر بہتر اور اصلح کیلئے اس جہان میں جگہ خالی کرتی ہی رہتی ہے "جنگ برادران" کا نتیجہ بھی یہی نکلا۔ ڈاکٹر برنیر کو بھی اس کا اقرار ہے کہ سب سے بہتر صلاحیت رکھنے والا ان چاروں بھائیوں میں شہزادہ اورنگ زیب ہی تھا۔ لیکن ڈاکٹر برنیر اپنے مزاج سے مجبور ہے وہ طبعاً کچھ حزب مخالف کی ذہنیت کا حامل ہے! اس لئے کامیاب و کامران فریق کی طرف سے اس کے دل میں ایک قسم کی نفرت سی ہے، اسے عالمگیر کے اعمال و افکار میں عیوب دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے سفرنامے میں جا بجا اس پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ اس کی نظر سے اسباب و وجوہ کہیں کہیں چھپ جاتے ہیں۔ اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ محض بے رحمی اور قساوت قلبی تھی، حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی، بلکہ جو کچھ ہوا ان حالات میں وہی ہونا چاہیے تھا، اگر نہ ہوتا تو برا ہوتا۔

فاضل ڈاکٹر برنیر نے جو رائیں قائم کی ہیں، ان کے پیچھے علاوہ ڈاکٹر کی افتاد طبع کے ایک اور چیز بھی ہے، وہ یہ کہ وہ ایک

غیر ملکی اور غیر مانوس آدمی ہے۔ نہ مغل اصولِ حکمرانی کو جانتا ہے نہ پاک وہند کی اجتماعی صورتِ حال سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہے، اس لئے بھی وہ اکثر جگہ اپنی رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔ اور صحیح اسباب و وجوہ تک اس کی نظر نہیں پہنچتی، پھر ایک سب سے بڑی دقت اُسے یہ بھی تھی کہ وہ مقامی زبان سے ناواقف تھا۔ بہت سی باتیں اُس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکیں۔

لیکن بہرحال! آراء و افکار کیلئے نہیں بلکہ حوادث و واقعات کیلئے یہ سفرنامہ تاریخ پاک وہند کے مطالعہ کیلئے انتہائی اہم اور بے مثال کتاب ہے۔ اس سفرنامہ میں ہمیں بعض ایسی جزئی تفصیلات اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات ملتے ہیں جو ملکی مورخ عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک غیر ملکی مبصر کے نزدیک روزمرہ کے معمولی واقعات بھی عجیب نظر آتے ہیں اور وہ اُنھیں اپنی یادداشت میں نوٹ کرتا ہے حالانکہ معاصر مورخ اسی ملک کا پروردہ ہونے کے ناطے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا ہے۔ ایسے سفرنامے مطالعہ کیلئے بہت ہی مکمل اور نہایت ہی کارآمد مواد مہیا کرتے ہیں اور ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں

اُردو ترجمہ بڑی مدت ہوئی کہ اس سفرنامہ کا انگریزی سے اُردو ترجمہ جناب سید محمد حسین صاحب میر منشی ریاست پٹیالہ نے کیا تھا۔ اور نہ صرف ترجمہ کیا تھا بلکہ اصل کتاب سے کہیں زیادہ قیمتی تشریحات کے فٹ نوٹ کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ تشریحی نوٹ اتنے معلومات آفریں اور اتنے قیمتی ہیں کہ حقیقتہً ایک اعلیٰ درجہ کی تحقیقی کتاب اپنے موضوع پر معلوم ہوتی ہے۔ ایسے نوٹ بہ کثرت ہیں۔ اور نہایت کارآمد تفصیلات مہیا کرتے ہیں

یہ کتاب مترجم کی زندگی میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اور ملک کے ارباب علم وبصیرت کی نظر میں بڑا کارنامہ قرار پائی تھی۔ اب اس کے نسخے کمیاب اور کمیاب سے نایاب ہوگئے تھے۔

نفیس اکیڈیمی جس نے بہتر سے بہتر علمی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اور جو اس سے پہلے مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی ضخیم تاریخ اسلام تین جلدوں میں، آئینہ حقیقت نما، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی معرکۃ الآراء کتاب حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی اور دوسری، بہت سی ضخیم اور کارآمد کتابوں کے جدید ایڈیشن بہتر لکھائی چھپائی سے مزین کرکے آپکے سامنے پیش کرچکی ہے اب اس مشہور و کارآمد سفرنامہ کا جدید ایڈیشن بہترین طباعت وکتابت کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

ہمیں یہ خوشی ہے کہ اہلِ علم جن کتابوں کے نسخے حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اہل دانش کو جن کتابوں کی تلاش رہتی ہے اور اعلیٰ تحقیقی کام کرنے والے اساتذہ اور اسکالرس جن کتابوں کے حصول کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ ہم اپنی مساعی سے ان کتابوں کو قابلِ حصول بنانے کی خدمت نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اور خداوند تعالیٰ کے شکرگذار ہیں کہ اُس نے ہمیں توفیق عطا فرماکر اور اسباب وضروریات مہیا کرکے ہمارے لئے یہ خدمت آسان فرمادی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

آئندہ کے چند مہینوں میں انشاء اللہ تعالیٰ ہم اسی طرح سفرنامہ ابن بطوطہ کا اردو ترجمہ، اقبال نامہ جہانگیری مصنفہ معتمد خاں بخشی کا اُردو ترجمہ، تاریخ ابن خلدون کا مکمل ترجمہ اور البرامکہ۔ و نظام الملک طوسی مصنفہ مولانا عبدالرزاق کانپوری اور خلافت اندلس، کارنامہ نواب ذوالقدر مرحوم بھی پیش کر رہے ہیں۔

اورنگ زیبؒ کی سیاسی زندگی

از جناب ڈاکٹر ریاض الاسلام ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی

برصغیر ہندو پاکستان تاریخ کے آغاز سے ہی دنیا کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی دولت کی شہرت دور دراز ممالک کے فاتحین اور تجار کو یہاں کھینچ کر لاتی تھی۔ بدھ مت کی توسیع نے ہندوستان کو ایشیا میں ایک نئی مرکزی حثیت دی۔ چین اور دیگر ممالک سے بدھ یاتری ہزاروں میل کا دشوار گذار راستہ طے کرکے ادھر آنے لگے۔ پھر جب اسلام نے اس دیار میں قدم رکھا تو ہندوستان عالم اسلام کا حصہ ہو گیا۔ اور تمام مشرق وسطیٰ یہاں کا دیوار بیچ پڑوسی بن گیا۔ اور آمد و رفت کے تمام بحری اور بری راستے آباد رہنے لگے۔ اور جب یورپ میں بیداری کی تحریک شروع ہوئی اور وہاں کے دلیر ملاح نئے دیاروں اور نئی راہوں کی کھوج میں نکلے تو کولمبس ہندوستان کو ہی تلاش کرتا ہوا امریکہ جا نکلا۔

ہندو پاکستان سے اس عالمگیر دلچسپی کا کچھ اندازہ اس ضخیم سیاحتی ادب سے ہو سکتا ہے۔ جو یہاں کے بارے میں موجود ہے۔ میگا ستھنیز اور فاہیان سے لے کر برنیر اور منوچی تک بے شمار سیاح سفیر اور تاجر یہاں آئے اور ان میں سے بہتوں نے یہاں کے حالات اور اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ سیاحتی ادب کا ایک وقیع حصہ مسلمانوں کا ہی مرہونِ منت ہے۔ مسلمان سیاحوں کی طویل فہرست میں مسعودی اور ابن بطوطہ کے نام سب سے ممتاز ہیں۔ سیاحت نگاری کی وسیع اصلاح میں کئی قسم کی تحریرات شامل ہیں۔ اولاً وہ کتب جن میں سیاحوں نے اپنے چشم دید حالات قلم بند کئے ہیں۔ دوسرے وہ تحریرات جن میں مؤلفین نے مسافروں تاجروں اور دوسرے آنے جانے والوں سے مختلف ممالک کے حالات اہتمام اور احتیاط کے ساتھ جمع کئے اور انھیں ترتیب دیا۔ اس کی ایک اچھی مثال مسالک الابصار ہے۔ جس کا مؤلف شہاب الدین ابن فضل اللہ العمری خود ہندوستان نہیں آیا۔ لیکن اُس نے یہاں کے حالات معتبر تجار سے جو ادھر آتے جاتے رہتے تھے، جمع کئے۔ تیسرے بعض کتابیں ایسی بھی ہیں۔ جو مجموعی طور سے تو نہیں البتہ ان کے بعض حصے سیاحت نگاری کے ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً البیرونی کی کتاب الہند اور بابر کی تزک اسی نوعیت کی ایک غیر معروف لیکن اہم کتاب بحرالاسرار ہے۔ یہ توران کی تاریخ ہے۔ اور ۱۶۴۰ء کے قریب لکھی گئی۔ کتاب کے آخر میں تتمہ کے طور پر اس کے مصنف محمود بن امیرولی نے اپنے سفر کا حال لکھا ہے۔ جس کے دوران میں وہ سندھ۔ لاہور۔ دہلی۔ متھرا۔ آگرہ۔ پٹنہ۔ دکن اور لنکا وغیرہ گیا۔ اس کتاب کا ایک نادر الوجود

نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے ۔

ہند و پاکستان کے تاریخی مواد میں سیاحت ناموں کو ایک الگ مقام حاصل ہے ۔ ایران ۔ توران ۔ ممالک عرب شمالی افریقہ فرانس ۔ اٹلی ۔ انگلستان ۔ روس اور چین وغیرہ سے آنے والے سیاحوں نے اپنی تحریرات میں یہاں کے متعلق بڑا متنوع اور دلچسپ مواد مہیا کیا ہے ان کی تحریرات میں سیاسی تاریخ کے بعض اہم اور مفید حوالے بھی ملتے ہیں ۔ لیکن ان کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے ۔ کہ وہ یہاں کی معاشرتی اور معاشی حالات کو اُجاگر کرتے ہیں ۔ رسم و رواج بود و باش کے طریقے اور مقامی حالات کے مطالعہ کے لئے ان سے اہم شاید ہی کوئی ماخذ ہو ۔ عہد وسطیٰ کی لکھی ہوئی تاریخی کتب عموماً سماجی حالات کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہیں ۔ اس کمی کو سیاحتی ادب ایک حد تک پورا کر دیتا ہے ۔ چنانچہ بعض یورپی سیاحوں کی تصانیف میں جنوبی ہند کے سماجی حالات کی بھرپور تفصیل ملتی ہے ۔ سیاحتی ادب کے بیش قیمت مواد سے بعض جدید مورخین نے اپنی تحقیقات میں پوری طرح استفادہ کیا ہے ۔

ہر عہد کے سیاحتی ادب میں بعض مشترک خوبیاں اور خامیاں ہیں سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ باتیں جو اہلِ وطن کے لئے روزمرہ دیکھتے رہنے سے لائق توجہ نہیں رہتیں ، دور دیس سے آنے والوں کے لئے نادر اور عجیب ہوتی ہیں ۔ اگر اہلِ وطن ان کو پائمال سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں تو غیر ملکی سیاح انھیں دلچسپی اور حیرت سے دیکھتے ہیں اور ان کی جزئیات کو بالتفصیل تحریر کرتے ہیں ۔ سب سے نمایاں خرابی یہ ہے کہ سیاح اپنے مختصر دوران قیام میں عموماً صرف سطحی باتیں دیکھ پاتے ہیں اور وہ اپنے مشاہدات کو ان کے تاریخی پس منظر اور تمدنی ماحول کی روشنی میں سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں ۔ ایک اور نقص جو کم و بیش سب سیاحت ناموں میں پایا جاتا ہے ۔ یہ ہے کہ سیاحت نگار سنی سنائی باتوں اور بازاری افواہوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ مصدقہ حقیقت ہوں ۔ مارکوپولو اور منوچی کے سیاحت نامے ان بے بنیاد باتوں سے بھرے پڑے ہیں ع جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

سرزمین پاک و ہند کے اسلامی عہد میں جتنے یورپی سیاح آئے ان میں غالباً سب سے زیادہ ذہین اور باعلم شخص ڈاکٹر برنیر تھا ۔ وہ سند یافتہ ڈاکٹر تھا فلسفہ سے اُسے غیر معمولی شغف تھا ۔ وہ فلسفی گیسنڈی کا بڑا مداح تھا ۔ اسی کی صحبت میں برنیر کی صحیح معنوں میں ذہنی تربیت ہوئی تھی گیسنڈی کا انداز فکر ناقدانہ تھا ۔ اور اس کے حلقہ میں شریک ہونے والے اس کے تنقیدی رجحان سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ۔ برنیر کا علم محض کتابی نہ تھا ۔ وہ چل پھر کر دنیا کو دیکھنے کا خواہش مند تھا ۔ طبی تربیت کی تکمیل سے پہلے ہی وہ یورپ کے بیشتر ممالک کا سفر کر چکا تھا ۔ دستار بندی کے دو سال بعد وہ دنیا کی سیاحت کے لئے چل پڑا فلسطین ۔ شام اور مصر ہوتے ہوتے وہ ۱۶۵۸ء کے اواخر میں بحری راستہ سے سورت پہنچا ۔ برصغیر میں آٹھ نو سال مقیم رہا ۔ اور کشمیر سے گولکنڈہ اور بنگال سے گجرات تک سب اہم مقامات اس کی نظر سے گذرے بحالہ ۱۶۶۸ء میں اُس نے اس سرزمین کو الوداع کہا اور ایران کے راستہ سے عازم وطن ہوا ۔ ۱۶۸۸ء

میں اڑسٹھ سال کی عمر میں برنیر سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔

برنیر جب ہندوستان پہنچا تو شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت و تاج کی جنگ آخری مراحل میں تھی۔ دارا گجرات میں پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ برنیر کی بھی اس سے ملاقات ہوئی اور چند روز کے لئے وہ شہزادہ کے ساتھ معالج کی حیثیت سے رہا۔ برنیر نے اپنی کتاب کا آغاز اس جنگ کے بیان سے کیا ہے۔ اور ایسی تفصیل کے ساتھ کہ کتاب کا پہلا ربع اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ بقیہ کتاب شاہی دربار کے حالات آگرہ اور دہلی کے شہروں اور کشمیر اور بنگال کے صوبوں کے بیان، شاہی فوج کے نقشہ، سلطنتِ مغلیہ کے نظم و نسق اور معاشی حالات اور اہلِ ہنود کے رسوم و عقائد کے بیان پر مشتمل ہے۔ برنیر کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے جن معاملات سے بحث کی ہے انھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیتا ہے۔ انیسویں صدی کے انگریز مورخوں نے سلطنتِ مغلیہ کے نظم و نسق کو یورپی قرونِ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام FEUDALISM کی اصلاحات میں بیان کیا ہے اور یہ ایک نبیادی غلطی ہے۔ بیسویں صدی کے مورخین نے اس غلطی کا ازالہ کیا۔ لیکن برنیر نے سترھویں صدی ہی میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی کہ سلطنتِ مغلیہ کا نظام جاگیردارانہ نہ تھا۔ ہندوستانی فوج کے نقائص، صفوی ایران کی داخلی کمزوری اور دولتِ عثمانیہ کے آنے والے زوال کے بارے میں بھی برنیر نے جو کچھ کہا اُسے وقت نے صحیح ثابت کر دکھایا۔ ان باتوں سے اُس کی غیر معمولی ذہانت اور تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس ذہانت کے باوجود برنیر نے معاصرانہ واقعات اور مغلیہ اداروں کو سمجھنے میں کئی جگہ ٹھوکر کھائی ہے شاہجہاں کے نجی کردار پر جو اُس نے ناروا حملے کئے ہیں وہ اب درخورِ اعتنا نہیں۔ کوئی ثقہ مورخ اب انھیں لائق توجہ نہیں سمجھتا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے سیاسی طرزِ عمل پر جو اُس نے جا بجا نکتہ چینی کی ہے ان میں سے بیشتر باتوں کا جواب مولانا شبلی نعمانی اور ظہیر الدین فاروقی دے چکے ہیں۔ اور یہاں ان کا دُہرانا بے محل ہوگا۔ سیاحت نگاروں کو بازار کی چاشنی دار افواہوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرنے کا جو لپکا ہوتا ہے، برنیر اُس سے یکسر بری نہیں۔ پھر بھی وہ دوسرے سیاحوں سے زیادہ محتاط تھا۔ منوچی کے من گھڑت افسانے اس کے یہاں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ اورنگ زیب کے نام شاہِ ایران کے ملامت آمیز خط کے بارے میں افواہ بیان کر کے وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اُسے اس پر یقین کرنے میں تامل ہے۔ شاہجہاں کے دربار میں ایرانی سفرا کی گستاخیوں کے قصے سنا کر وہ ان قصوں کی بے بنیادی کی طرف اشارہ بھی کر جاتا ہے۔ اورنگ زیب پر وہ کہیں کہیں نکتہ چینی کرتا ہے لیکن اس کی خوش خلقی اس کی تن دہی اور مدبرانہ دریا دلی کا مداح بھی ہے۔ سلطنتِ مغلیہ میں امن و امان کی کمی اور عمال کی بے عنوانیوں کا شاکی ہے۔ لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ یہاں دیہات میں ذخیروں اور فصلوں کی لوٹ کھسوٹ نہیں ہوتی:- کیونکہ ہندوستان میں ایک ایک لسوہ زمین خاصہ شریفہ سمجھی جاتی ہے۔ اور رعیت پر دست درازی اور تعدی کرنا گویا بادشاہ کے مال میں دست اندازی کرنا

M. Shafi

زندہ پیر

از جناب مرزا علی اظہر بی، اے۔ بی، ایل

ڈاکٹر فرانسس برنیر نے بارہ سال (۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء) تک ہندوستان میں رہ کر یہاں کی سیاسی اور معاشی حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہجہاں تخت طاؤس پر جلوہ افروز تھا اور آخر میں اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو شکست دے کر سلطنت حاصل کر لی تھی۔ چونکہ یہ زمانہ تاریخ ہندوستان میں بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے برنیر کے وقایع کو بھی خاص امتیاز حاصل ہے۔

یورو پین مصنفین برنیر کے سیاحت نامہ کو زیادہ اہمیت اس لئے دیتے ہیں کہ وہ بحیثیت وقائع نویس کے تاریخی واقعات کو صحیح خدوخال میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے خاندان تیموریہ کی تاریخ پر گہری نظر ڈالی ہے اور واقعات کے مختلف عوامل کو پیش نظر رکھکر کسی نتیجہ پر پہنچنے کے عادی ہیں وہ برنیر سے اکثر متفق الرائے نہیں ہو سکتے۔

برنیر کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں اجنبی تھا، ملکی زبان اور معاشرے سے بھی ناواقف تھا۔ اسی لئے باوجود ذہانت وکدوکاوش اُس نے اکثر تاریخی واقعات میں غلطیاں کی ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ برنیر بھی مثل دیگر اہل یورپ کے 'احساس برتری' میں مبتلا تھا، مشرق کے مقابلے میں مغرب کو بہتر سمجھتا تھا اور یورپین تہذیب و تمدن کے تفوق کا داعی تھا۔ اکثر مقامات پر اُس نے واقعات کے سمجھنے میں غلطی کی اور غلط نتائج پر پہنچا۔

یہ ہر شخص مانتا ہے کہ اورنگ زیب اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ قابل، حوصلہ مند اور خوش فکر تھا۔ فطرتاً جفاکش اور دماغ سوزی کا عادی تھا اور جس کام کا بیڑا اٹھاتا تھا اُس کو انتہائی حزم و احتیاط سے انجام دیتا تھا۔ جو مہم درپیش ہوتی اُس پر ہر پہلو سے غور و فکر کر کے نقشہ تیار کرتا اور مثل ایک شاطر کھلاڑی کے دشمن کی کوئی چال ایسی نہ ہوتی جس کی کاٹ کے لئے وہ تیار نہ ہوتا۔

جذبات پر اورنگ زیب کو چونکہ پورا قابو حاصل تھا اس لئے جب کبھی دل و دماغ میں آویزش ہوتی تو دلی جذبات و محسوسات کو کچل کر دماغی کدوکاوش اور واقعات کی منطقی رَو کا وہ ساتھ دیتا۔ اُس کے زہد و تقوے اور مذہبی عصبیت نے اُس کی سادہ زندگی کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ وہ "زاہد خشک" مشہور ہو گیا۔ بدقسمتی سے "دورِ جہانگیری"

ہے۔ اسلام کے خلاف برنیر کو جو تعصب تھا اس کا وہ کئی جگہ اظہار کرتا ہے۔ اس بارے میں اس کی کم نظری کو اس کی ضلالت پر محمول کر کے اُسے معذور تصور کیا جا سکتا ہے۔ ستی کی رسم جگن ناتھ کی پوجا اور سورج گرہن کے موقعہ پر ہندوؤں کی عبادات کا ذکر کرنے کے بعد وہ ایک کلیہ بیان کرتا ہے: "کیسے ہی فضول اور بے معنی خیال کیوں نہ ہوں پھر بھی انسان کے دل میں جگہ پاتے ہی ہیں" لیکن اس کلیہ کا اطلاق غالباً وہ اپنے عقائد پر نہیں کرتا تھا۔ شعبدہ بازی کا برنیر سخت دشمن تھا۔ اور جب بھی اُسے پنڈتوں وغیرہ نے کوئی بات از قسم کرامات دکھائی تو وہ کھوج لگا کر معلوم کر لیتا کہ اس کے پیچھے کیا راز ہے۔ اور ان کی کرامات کو شعبدہ ثابت کر دیتا۔

مجموعی طور سے برنیر کی کتاب دنیا کے بہترین سیاحت ناموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ تاریخ کے طلبا اور عام قارئین سب کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہے۔ اصل سیاحت نامہ فرانسیسی میں ہے۔ یورپ کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کے کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اور اُردو میں اس کا ترجمہ سب سے پہلے کرنل ہنری مور نے ۱۸۶۵ء میں کیا۔ یہ ترجمہ زبان کے لحاظ سے ناقص تھا۔ خلیفہ سید محمد حسین میر منشی ریاست پٹیالہ نے کرنل مور کے مسودہ کو پیش نظر رکھ کر برنیر کے سفر نامہ کا از سر نو ترجمہ کیا۔ پھر اس پر مزید نظر ثانی اُن کے بھائی خلیفہ سید محمد حسن وزیر اعظم ریاست پٹیالہ نے کی۔ اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں امرتسر اور مراد آباد سے بالترتیب ۱۸۸۶ء اور ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ کتاب کے اصل مترجم خلیفہ محمد حسین نے اُسے اپنے خرچ پر چھپوایا اور اس کی تمام تر آمدنی مدرسۃ العلوم (محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج) علی گڑھ کے سپرد کر دی۔ ۱۹۰۶ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ڈیوٹی بک ڈپو نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن آگرہ میں طبع کرا کے شائع کیا۔ یہ کتاب اب ایک عرصہ سے نایاب ہے۔ چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری صاحب مالک نفیس اکیڈیمی تحسین کے مستحق ہیں کہ ان کی کوشش سے برنیر کا سیاحت نامہ پھر شائع ہو رہا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے بعد چوہدری صاحب کی توجہ ہند و پاکستان کے دوسرے مشہور سیاحت ناموں کے ترجمے شائع کرنے کی طرف منعطف ہو گی۔

اور عہد شاہجہانی کے بعد "عالمگیر زندہ پیر" کا تخت طاؤس پر بیٹھنا قیامت ہوگیا۔

اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں جن قوموں نے بھی مغلوں[۱] کے مقابلے میں سر اٹھایا وہ کچل دیے گئے۔ ۱۵۵۶ء[۲] (جنگ پانی پت) سے لے کر ۱۶۵۸ء تک یعنی پورے ایک سو سال تک ہندوستان میں کوئی طاقت ایسی باقی نہ رہی تھی جو مغلوں کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتی۔ حکومت و طاقت کے ساتھ ساتھ دولت و ثروت حکمران طبقے میں سمٹ کر آگئی تھی۔ آلِ تیمور میں گھن لگ چکا تھا مگر اثرات چونکہ نمایاں نہ ہوئے تھے اس لیے روبہ انحطاط ہونے کے باوجود وہ اپنے تنزل کو محسوس نہ کرتے تھے۔ بگڑے ہوئے معاشرے میں خرابیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ امرا عیش پسند ہوگئے اور متوسط طبقہ نے رئیسوں کی دیکھا دیکھی اپنی بساط بھر تعیش میں زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ پورا معاشرہ رنگ رلیاں منانے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں کوئی "زاہد خشک" مقبول نہیں ہو سکتا اور جب کہ وہ تختِ شاہی پر بیٹھ کر ایک باجبروت بادشاہ کی حیثیت سے مسموم فضا کو درست کرنا چاہتا ہو تو خاص و عام کا ممدوح ہونا محال ہے۔

بخلاف اس کے دارا شکوہ، شاہ شجاع اور مراد بخش تینوں بھائی کم و بیش اپنے زمانے کی پیداوار تھے۔ دارا شکوہ ولی عہد اور پنجاب و دہلی کا صوبیدار تھا مگر اپنے والد شاہجہاں کے ساتھ رہا کرتا تھا جو ۱۶۵۷ء میں آگرے بغرض تبدیل آب و ہوا چلا آیا تھا۔ شجاع بنگال کا اور مراد گجرات کا صوبیدار تھا اور یہ تینوں شہزادے اپنے اپنے صوبے میں بیٹھ کر دادِ عیش دیتے تھے۔ اُس زمانے کے مذاق کے مطابق شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے اور خاص و عام کی نظروں میں محبوب تھے۔

شاہجہاں کی علالت کی خبر سنتے ہی شہزادوں نے اپنی اپنی قسمت آزمائی کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ اورنگ زیب نے حسب عادت سوچ سمجھ کر نقشہ جنگ تیار کیا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ دارا شکوہ ولی عہد ہونے کی وجہ سے اُس پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور اُس کی ذاتی قوت کے ساتھ ساتھ شاہی قوت بھی اُس کی ممد و معاون ہے۔ لہٰذا دارا شکوہ کو پریشان کرنے کے لیے دوسری تدبیروں کے علاوہ ایک خاص تدبیر یہ اختیار کی کہ شاہ ایران کو ورغلایا کہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے جو اُس وقت سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ تھا۔ غرضیکہ مختلف سیاسی چالوں سے اورنگ زیب اس مقولے پر عامل تھا کہ "جنگ و محبت میں ہر چیز جائز ہے" اور اپنی ہمت و جرأت سے جس کا اُس نے ہر میدان کارزار میں

---

[۱] میں نے لفظ "مغل" یہاں انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جو اُس زمانے میں مستعمل تھے۔ جیسا برنیر کہتا ہے۔ اب لفظ مغل اُن سب غیر ملک کے رہنے والوں پر بولا جاتا ہے جو فی زمانہ ہندوستان پر جس کے معنی ہیں ہندوؤں یا ہندوؤں کا ملک، حکومت کرتے ہیں" (ص۳) ورنہ آل تیمور نسبتاً ترک لاس تھے۔ مزید تحقیق کیلیے میرے مضامین "تیمور اور اُس کا نسب" مطبوعہ اخبار "ڈان" مورخہ ۱۲ اور ۱۹ اپریل ۱۹۵۹ء ملاحظہ ہوں۔

[۲] ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو میدان پانی پت میں اکبر نے ہیمو کو شکست دے کر ہندوستان میں مغلوں کا جھنڈا گاڑ دیا اور ۳۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو اورنگ زیب دہلی میں تخت نشین ہوا۔

مظاہرہ کیا، تینوں بھائیوں کو شکست دے کر ۳۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو دہلی میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

عام طور پر مورخین اورنگ زیب پر اپنے باپ کو گرفتار کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ مگر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ شاہجہاں نے داراشکوہ کی حمایت میں کیا کچھ نہیں کیا۔ اگر اورنگ زیب مجبور ہو کر شاہجہاں کو معطل نہ کر دیتا یا یوں کہیئے کہ قلعہ میں نظر بند نہ کر دیتا تو ظاہر ہے کہ داراشکوہ کی نجی فوجی طاقت اور بادشاہ وقت کی پوری پشت پناہی اورنگ زیب کو یقیناً شکست فاش دیتی جس کے معنی لازمی موت کے تھے۔ لہٰذا جب کبھی اورنگ زیب پر باپ کو گرفتار کرنے کا الزام لگایا جائے۔ (میرے خیال میں شاہجہاں "نظر بند" تھا گرفتار نہ تھا)، تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ شاہجہاں کی اُن حرکتوں پر بھی نظر رکھنا چاہیئے جنھوں نے اورنگ زیب کو اِس اقدام پر مجبور کیا۔ ع عیب اُو جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو،

خود برنیر جو اورنگ زیب کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا ہے کہیں کہیں اُن باتوں کے ذکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ کے ساتھ سختی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مثلاً جب اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور شاہی ملازمین مغلوب ہو گئے تو شاہجہاں نے نوجوان شہزادے (محمد سلطان) کو تخت اور قرآن مجید کی قسم کھا کر سلطنت کی لالچ دی اور اُس کو باپ (اورنگ زیب) کے خلاف اُبھارا۔ اگر محمد سلطان اس لالچ میں آجاتا تو اورنگ زیب کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ جس واقعہ نے اورنگ زیب کو شاہجہاں کی طرف سے متنفر کر دیا اور اُس کو یقین ہو گیا کہ بادشاہ مجھکو تباہ کرنا چاہتے ہیں وہ شاہی خط کا پکڑا جانا تھا۔ قلعہ پر محمد سلطان کے قبضہ کے بعد شاہجہاں اور اورنگ زیب میں پیام وسلام ہونے لگے۔ ایک روز اورنگ زیب اپنے باپ کے سلام کے لئے جانے لگا۔ اتفاقاً اُسی روز اُس کے سامنے وہ شاہی رقعہ پیش ہوا، جو شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے داراشکوہ کے نام لکھا تھا اور چھپا کر اُس کے پاس روانہ کیا تھا۔ اس خط کو دیکھتے ہی اورنگ زیب نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جو کچھ بھی لگاؤ باپ سے تھا وہ ختم ہو گیا اور شاہجہاں کی نگرانی میں زیادہ سختی ہونے لگی۔

اورنگ زیب کی زندگی پر اگر شروع سے نظر ڈالی جائے تو اُس کی لیاقت، تدبّر اور حکمرانی کی اہلیت تسلیم کرنا پڑتی ہے بعض وجوہ سے دس سال کی عمر میں اورنگ زیب کی تعلیم شروع ہوئی مگر فطری ذہانت کی بنا پر تھوڑے ہی عرصہ میں عربی فارسی ترکی اور ہندی میں کافی استعداد حاصل کر لی۔ قرآن وحدیث میں چونکہ خاص شغف تھا اس لئے علم القرآن وعلم الحدیث میں اچھا خاصا عالم مانا جانے لگا۔ سولہ سال[۱] کی عمر میں ۱۶۳۴ء میں وہ منصب دار ہوا۔ اور بوندیلوں کے خلاف فوج کشی کی۔ بعد کو دکن کا صوبیدار مقرر ہوا۔ (۱۶۴۴ء-۱۶۳۶ء) اور بحیثیت سپاہی اور سیاست داں کے کافی شہرت حاصل کی انتظامی اُمور میں بھی اُس نے اپنا سکہ لوگوں پر بٹھا دیا۔ ۱۸ رمئی ۱۶۳۷ء کو اُس کی شادی مرزا بدیع الزماں شاہ نواز خاں کی بیٹی دلرس بانو بیگم سے ہوئی ۱۶۴۴ء میں داراشکوہ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اُس نے دکن کی صوبیداری سے استعفا دیدیا۔ فروری ۱۶۴۵ء

---

[۱] اورنگ زیب ۳ر نومبر ۱۶۱۸ء کو (اُجین کے قریب) جہانگیر کے عہد میں پیدا ہوا تھا۔

میں گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا اور ۱۶۴۷ء تک اس عہدے پر نیک نامی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ وہاں سے یہ بلخ[1] کی مہم پر بھیجا گیا۔ اور واپسی پر ملتان کی صوبیداری پر ۱۶۵۲ء تک فائز رہا۔ ۱۶۴۹ء میں شاہ عباس ثانی شاہ ایران نے قندھار پر، جو اُس وقت مُغلوں کی حکومت میں تھا۔ قبضہ کرلیا۔ اورنگ زیب نے[2] دو مرتبہ ۱۶۴۹ء اور ۱۶۵۲ء میں قندھار واپس لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاہجہاں نے دوسری مرتبہ پھر اورنگ زیب کو ۱۶۵۲ء میں دکن بھیج دیا، جہاں وہ ۱۶۵۷ء تک نہایت خوش اسلوبی سے کام کرتا رہا۔ ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں بیمار ہوا۔ اُس کی علالت کی خبر سنتے ہی شہزادوں نے قسمت آزمائی کے لئے تیاریاں شروع کردیں۔

داراشکوہ میں بعض خوبیاں ضرور تھیں اسی لئے اُس کو اورنگ زیب کا سب سے بڑا حریف مانا جاتا تھا مگر بعض کمزوریاں بھی ایسی تھیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ ڈاکٹر مانکی (Manucci) جو وینس (Venice) کا باشندہ تھا اور داراشکوہ سے وابستہ تھا اُس نے اپنی کتاب میں دارا کے متعلق اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ وہ صاف صاف لکھتا ہے کہ "دارا اچھائیوں اور بُرائیوں کا ایسا مجموعہ تھا کہ وہ مغل امیر کی حیثیت سے زیادہ بہتر تھا بہ نسبت سلطنت کے نظم ونسق[3] سنبھالنے کے"۔ دارا کے مذہبی عقائد کے بارے میں مانکی لکھتا ہے کہ جلاّد نے اُسے آخر وقت یہ کہتے سُنا کہ "محمدؐ نے مجھے تباہ کردیا، مسیح مجھے بچائیں گے"۔

مانکی کی شہادت کے بعد، جو داراشکوہ کا خاص آدمی تھا، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاہجہاں کے چاروں[4] بیٹوں میں اورنگ زیب ہر لحاظ سے بادشاہت کے لئے موزوں ترین تھا۔ اگر بعض سیاسی غلطیاں اُس سے سرزد نہ ہوتیں تو شاید سلطنت مغلیہ اُس کے زمانے میں پہلے سے زیادہ مستحکم ہوجاتی۔

بہرحال برنیئر، مانکی اور ٹورنیئر کے قلم سے لکھے ہوئے ہندوستان کے حالات پڑھنے میں ایک ندرت ضرور ہے۔ اُن کے بیانات میں غلطیاں بہت ہیں مگر پھر بھی اگر فارسی تاریخوں کے ساتھ ساتھ یہ سیاحت نامے پڑھے جائیں تو ایک تجربہ کار مورخ صحیح نتائج تک پہنچ سکتا ہے۔

وقائع برنیئر کے لائق مترجم نے بہت ہی قابل قدر حواشی لکھ کر کتاب کی افادیت میں کافی اضافہ کردیا ہے۔

---

[1] جس وقت اورنگ زیب بلخ میں اُزبک سردار عبدالعزیز کے خلاف لڑ رہا تھا تو عین میدان جنگ میں نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب فوراً گھوڑے پر سے کود پڑا اور وہیں نماز عصر ادا کی۔ جب ہی سے اُس کا نام "عالمگیر زندہ پیر" ہوگیا۔ (؟)

[2] تیسری مرتبہ ۱۶۵۳ء میں داراشکوہ نے بھی کوشش کی مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوا۔

[3] صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲ سیاحت نامہ برنیئر (انگریزی)، کانسٹبل ایڈیشن ۱۹۱۶ء

[4] شجاع اور مراد بخش کے حالات بخوفِ طوالت درج نہیں کئے۔ اور عام طور سے یہ مسلّمہ ہے کہ علمی استعداد و دیگر صلاحیتوں

(باقی اگلے صفحہ پر)

جہاں جہاں برنیر نے غلطی کی ہے اس کی تصحیح مستند تاریخوں سے کردی ہے۔

قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ مترجم صاحب مرحوم یعنی مشیرالدولہ ممتازالملک خاں بہادر خلیفہ سید محمد حسین صاحب کے ضروری حالات زندگی کا بھی اضافہ کردیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں یہ سمجھ سکیں کہ مسلمانوں کے دور انحطاط میں بھی بعض علم دوست اور ادب نواز ہستیاں ایسی تھیں جو ریاستی جھمیلوں میں پھنس کر بھی کچھ وقت علمی کاوشوں کے لئے نکال لیا کرتی تھیں۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے چونکہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ علی گڑھ (۱۹۰۵) کی صدارت کی تھی اس لئے میں نے اپنے قدیم دوست وکرم فرما جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی سکرٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سے رجوع کیا اور انھوں نے ازراہ دوست نوازی حسب ذیل حالات سید محمد اسلم صاحب پٹیالوی نبیرۂ خلیفہ صاحب مرحوم[1] کے مقالے سے ماخوذ کرکے بھیج دیئے۔ میں اُن کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے اس فراخ دلی سے میری مدد کرکے اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔

حالات مشیرالدولہ ممتازالملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین صاحب مرحوم

پیدائش ۱۸۳۹ء - وفات ۱۹۰۸ء

مرحوم خلیفہ محمد حسین صاحب کے بزرگ سید جلال الدین حسین صاحب المعروف بہ "سید جلال بخاری" بخارا سے شہر ملتان میں ۶۳۵ھ ہجری میں تشریف لائے۔ "حضرت جلال بخاری" کا مزار (اُچ شریف) ریاست بھاولپور میں اس وقت تک مرجع خاص و عام ہے۔ اور ریاست کی طرف سے اس کے انتظام کے لئے ایک معقول جاگیر مقرر ہے۔ سید جلال بخاری کے پوتے سید جلال الدین ثانی المعروف بہ "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" نہایت باخدا بزرگ گذرے ہیں جن کے محاسن کریمہ آج تک پنجاب و ہندوستان بھر میں معروف و مشہور ہیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سید نظام الدین صاحب دہلی سے ۸۰۲ھ میں آکر سامانہ میں آباد ہوئے یہ ایک پرانا اور مشہور قصبہ ہے جو پٹیالہ سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

انھیں بخاری سادات سامانہ میں سے حکیم سید غلام حسن جو اپنے زمانہ کے ایک مشہور طبیب گذرے ہیں خلیفہ

---

[1] خطبات عالیہ حصہ اوّل ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۱ (مطبوعاتِ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- میں اگر کوئی اورنگ زیب کا حریف ہوسکتا تھا تو وہ داراشکوہ تھا۔ اورنگ زیب کو بھی اگر فکر تھی تو داراشکوہ کی۔ اسی لئے اُس نے پوری فراست ذہانت اور تدبر سے داراشکوہ کے خلاف تیاری کی تھی۔ شجاع اور مراد کی وہ زیادہ اعتنا نہ کرتا تھا اور واقعات نے اُس کے فیصلے کو صحیح ثابت کیا۔

سید محمد حسین کے دادا تھے۔ ان کے بیٹے حکیم سید سعادت علی صاحب عرصہ دراز تک طبیب شاہی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی مہاراجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی خدمت میں بجالاتے رہے! اس کے بعد مہاراجہ موصوف نے مرحوم کی علمی قابلیت اور لیاقت پر نظر کرکے ان کو اپنے ولی عہد مہاراجہ نرندر سنگھ کا اتالیق مقرر فرمایا۔ اس نسبت سے سید صاحب موصوف کا خاندان اب تک "خلیفہ" کے لقب سے مشہور ہے۔ لفظ (خلیفہ) سے مراد اتالیق کا بیٹا ہے۔ سید سعادت علی کے بعد اتالیق کا عہدہ ان کی اولاد میں مختلف ولی عہدوں کے لئے سلسلہ وار قائم رہا اس لئے لفظ "خلیفہ" اس خاندان کے لئے عام طور سے استعمال ہونے لگا۔

خلیفہ سید محمد حسین مسلمانوں کی قدیم تہذیب اور شائستگی کا بہترین نمونہ تھے جو فضیلتِ علمی کے ساتھ نہایت باوقار اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے نامور اسلاف کے قدم بہ قدم ریاست پٹیالہ کی اہم خدمات نہایت وفاداری اور تدبر کے ساتھ انجام دیں، جس کے صلہ میں باوقاتِ مختلف مہاراجگان سے انعامات ملے اور جاگیریں عنایت ہوئیں۔ برٹش گورنمنٹ نے بھی ان کی نمایاں حیثیت، قابلیت اور عمدہ کارگذاریوں کے اعتراف میں خطابات مشیر الدولہ، ممتاز الملک اور خان بہادری سے مخاطب کرکے سرفراز کیا۔ اور پنجاب کی سب سے پہلی لیجسلیٹو کونسل میں ریاست پٹیالہ کے بہترین عہدہ دار کی حیثیت سے کونسل مذکور کا آپ کو ممبر منتخب کیا۔

خلیفہ صاحب کو اپنی قوم کی علمی ترقی سے بدرجۂ اتم ذوق و شوق تھا۔ وہ اور اُن کے بڑے بھائی خلیفہ سید محمد حسن المخاطب وزیر الدولہ، مدبر الملک ابتداء سے سرسید احمد خاں کی تحریک تعلیمی کے دست و بازو اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نامور ٹرسٹی تھے۔ ان کے اثر سے اور ان کی توجہ سے بیش بہا عطیات کی امداد مختلف زمانوں میں مدرسۃ العلوم کو حاصل ہوتی۔ وہ مذہباً راسخ العقیدہ شیعہ تھے لیکن انھوں نے شیعہ سنی کے اتحاد و اخوتِ باہمی کے رشتہ کو قومی ترقی کا نصب العین سمجھ کر ہمیشہ سلوک اور اتحاد کی سخت کوشش کی۔ وہ تعصبات مذہبی کی طرف سے نہایت فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ ان کی طبع سلیم مدت العمر نہ صرف اپنی قوم کی ہوا خواہی میں گذری بلکہ پنجاب یونیورسٹی کو بھی اُنھوں نے بہت سے وظائف اور تمغہ جات قابلیت اپنی طرف سے بلا امتیاز قومی عطا کئے جن سے اب تک کامیاب طلبہ فیض پا رہے ہیں۔

جب پنجاب میں سر چارلس ایچیسن لفٹیننٹ گورنر کے زمانہ میں اردو ہندی کا سوال اٹھا تو اس تجویز کی نہایت قابلیت کے ساتھ خلیفہ صاحب نے پر جوش طریقہ سے مخالفت کی اور عدالتوں میں بجائے اُردو کے ہندی کا رسم الخط جاری ہو جانے سے جو نقصان پہنچتا اُس سے ان کو محفوظ رکھا۔

جب مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں شیعوں اور سُنیوں کے واسطے جداجدا دو مسجدیں تعمیر کرنے کی تجویز اراکین کمیٹی کے سامنے پیش تھی تو اس تجویز کی خلیفہ صاحب اور اُن کے بڑے بھائی خلیفہ وزیر الدولہ نے سختی کے ساتھ مخالفت کی اور سرسید کو لکھا کہ یہ تجویز اس اتحاد و یک جہتی کے اُصول کے

منافی ہوگی جس کے قائم کرنے کے لئے ہم سب نے کالج کی بنیاد قائم کی ہے چنانچہ مذکورہ بالارائے کا جملہ ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے احترام کرکے ایک مسجد تعمیر کرنے پر اتفاق رائے کیا۔ مرحوم کو تصنیف وتالیف کا بھی شوق تھا۔ اعجاز التنزیل، اور ترجمہ سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر دو مفید کتابیں آپ کے علمی شغف کی یادگار باقی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بہ عہد نواب محسن الملک ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس کے علی گڑھ میں صدر منتخب ہوتے۔ مجلس ہٰذا کی ترقی سے اور اس کے ذریعہ سے ہر صوبہ کے مسلمانوں میں اتحاد باہمی کی وسعت کو دیکھکر اور عام طور پہ تعلیمی خواہش کا رجحان دیکھکر آپ کو خصوصیت کے ساتھ دلچسپی تھی اور اس لحاظ سے انھوں نے اجلاس کے لئے کانفرنس میں شریک ہونے کے واسطے باوجود کبر سنی کے لمبے لمبے اور دور دراز مقامات مثلاً ۱۹۰۶ء میں پٹیالہ سے ڈھاکہ اور کراچی کے سفر کئے۔

بالآخر ہمارے رازوالے، بزرگوں اور بزرگ زادوں کی یہ آخری یادگار بھی جو اپنی ذاتی خوبیوں اور اوصاف انسانی کے لحاظ سے سچائی، ہمدردی، نیکی، بلند ہمتی، علمی اور عملی اخلاق کا ذخیرہ تھی۔ ۱۹۰۸ء میں لباس فنا پہن کر اس شمع حیات کو جس کے نور سے ایک عالم فیضیاب تھا ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔

بالآخر یہ بیان کردینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کے لئے میں کیوں چُنا گیا۔ میرے شفیق محترم مولانا محمد سلیمان صاحب بدایونی عجیب مجموعۂ صفات وکمالات ہیں۔ بعد مغرب اُن کا "بیت البدایوں" مختلف مسائل پر احباب کے بے لاگ و بے لوث نقد و تبصرہ سے دانشکدہ بنا رہتا ہے۔ مخلصین کے اس جھرمٹ میں ایک روز ایک نئے چہرے پر نظر پڑی۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ آپ محمد اقبال سلیم گاہندری مالک نفیس اکیڈیمی ہیں۔ ایک روز جناب اقبال سلیم صاحب نے وقائع برنیئر کے لئے مقدمہ لکھنے کو کہا۔ اپنی بے بضاعتی و عدیم الفرصتی کا ہر چند عذر کیا مگر سلیم صاحب نے نہ مانا اور

مصرعہ۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

معلوم نہیں اپنی ذمہ داری سے کہاں تک عہدہ برآ ہوسکا ہوں، مگر مجھے یقین ہے کہ اورنگ زیب کی سیاسی زندگی اور تخت وتاج کے لئے نبرد آزمائی پر جو حضرات آئندہ قلم اٹھائیں گے وہ اُن نقوش کو زیادہ اُبھار کے پیش کرسکیں گے۔ جن کی طرف میں نے صرف اشارہ کیا ہے۔

دیباچہ وقائع سیر وسیاحت ڈاکٹر برنیر

از جناب کرنل ہنری مور صاحب بہادر سی. بی (و) سی۔ آئی. ای
ترجمان ہز اکسیلنسی کمانڈر انچیف صاحب بہادر

ڈاکٹر برنیر کے وقائع سیر وسیاحت کا اُردو ترجمہ ۱۸۷۵ء میں اس غرض سے میں نے کیا تھا کہ اس کتاب کے ذریعہ جو ایک غیر جانب دار اور محض اجنبی شخص کی عینی شہادت ہے شاید لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے پُر حوادث عہد میں سلطنت اور حکومت کا طرز اور رعایا کی حالت وکیفیت ٹھیک ٹھیک کس طرح پر اور کیا تھی۔ اور مغلیہ سلطنت کی بے حد فیاضی۔ انصاف پسندی اور رعایا کی عام خوش حالی اور فارغ البالی کی نسبت بہت سے غلط خیالات جو ملک میں پھیلے ہوئے ہیں وہ دور ہو جائیں گے۔ جن کو اُس وقت کے مورخوں اور شاعروں اور خوشامدیوں اور بادشاہوں کے انعام یافتہ لوگوں کی تحریروں نے عوام میں اس طرح پھیلا دیا اور ان کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ وہ آج تک عوام الناس کے دلوں میں اس یقین کے ساتھ قائم ہیں کہ گویا یہ اوصاف محض اُسی سلطنت سے مختص تھے۔

ہم لوگ جو بالفعل ہندوستان پر متسلط ہیں ڈاکٹر برنیر چونکہ ہمارا ہم قوم نہ تھا اس لئے جو حالات کہ اُس نے اپنے چشم دیدہ لکھے ہیں امید ہے کہ وہ اس زمانہ کے ہندوستانی رؤسا اور اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک اعتماد کے لائق سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ وہ اس قسم کے بیانات کو جو ایک ایسے غیر جانب دار اور بے غرض شخص کی طرف سے ہوں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو ملک کی موجودہ حالت کا اُس زمانہ کی حالت سے مقابلہ نہایت مفید اور دلچسپ ہوگا۔ منشی احمدالدین صاحب جو ایک ذی علم شخص ہیں اور اس کتاب کے ترجمہ کے وقت نواب کمانڈر انچیف بہادر سپہ سالار افواج ہند کے ترجمان فارسی کے دفتر میں مامور تھے اُنھوں نے مجھے اس کام میں بہت مدد دی تھی اور میں اُن کا بہت مرہون منت ہوں۔

جب ترجمہ ہو چکا تو میں نے اُس کی ایک نقل ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم اضلاع شمالی ومغربی کے پاس جہاں زیادہ تر اردو زبان بولی جاتی ہے روانہ کی۔ مگر اُنھوں نے مجھے یہ لکھا کہ "اگرچہ ترجمہ اچھا ہے لیکن نظر ثانی کی ضرورت ہے اس لئے مناسب ہے کہ کسی ایسے مستند اور زبان دان شخص کو دکھایا جائے جو اس اردو کا ماہر ہو جسے اہل دہلی کی

اُردو کہتے ہیں۔ میں نے اس رائے پر عمل کیا اور کتاب کو دہلی کے ایک مشہور و معروف معزز شخص کے سپرد کر دیا جو اُردو کا مشہور زباں داں تھا۔ لیکن یہ کتاب اگرچہ ایک برس تک اُس کے پاس رہی۔ مگر اُس نے صرف چند ہی اوراق میں کچھ اصلاح کی اور پھر ویسی کی ویسی میرے پاس بھیج دی۔ بظاہر یہ کام بسبب پیرانہ سالی وہ انجام نہیں دے سکے۔

کچھ دنوں بعد یہ تمام سرگذشت میں نے اپنے دوست خلیفہ سید محمد حسین صاحب میر منشی ریاست پٹیالہ سے بیان کی۔ جو اُردو۔ عربی۔ فارسی اور انگریزی زبان کے جاننے میں مشہور ہیں اور جن کو کچھ عرصہ ہوا کہ گورنمنٹ عالیہ قیصریہ کی حضور سے "مشیر الدولہ ممتاز الملک" کا خطاب مرحمت ہوا ہے۔ انھوں نے نہایت مہربانی سے اس کتاب پر دوبارہ نظر ڈالنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور نہ صرف اول سے آخر تک اُس کی اصلاح پر اکتفا کیا بلکہ جن مقامات کا ترجمہ میں نے مصنف کی فلسفیانہ تحقیقاتیں سمجھکر اس خیال سے چھوڑ دیا تھا کہ ناظرین اہل ہند کے لئے شاید کچھ دلچسپ نہ ہوں اُن کا بھی ترجمہ کر ڈالا۔ اور اس غرض سے کہ یہ کتاب زیادہ مشرح اور زیادہ دلچسپ ہو جائے بہت سے مفید حاشیے بھی اضافہ کر دیئے۔

جب خلیفہ صاحب موصوف جیسا کہ میں بیان کیا ہے اس کتاب کی ترمیم اور اصلاح سے فارغ ہو چکے تو میں نے ہز ایکسیلنسی سر فریڈرک صاحب بہادر "جی۔ سی۔ بی" "جی۔ سی۔ ایس۔ آئی" وغیرہ سے جو اُس وقت ہندوستان کے کمانڈر انچیف" تھے اور جن کے پرسنل سٹاف میں میں مامور تھا یہ درخواست کی کہ میری اس کتاب کو گورنمنٹ عالیہ ہند کے حضور میں اس غرض سے بھیج دیں کہ مجھے اتنی مدد حاصل ہو جائے جس سے میں اِس کو چھپوا سکوں اور منشی احمد الدین صاحب کو اُن کے تعاون کا صلہ دے سکوں۔ اور یہ بھی عرض کر دیا کہ اس میں میں اپنی ذات کے لئے کچھ روپیہ کا متمنی نہیں ہوں۔ چنانچہ نواب ممدوح نے از راہ کرم میری درخواست کو گورنمنٹ ہند کی خدمت میں بھیج دیا اور تھوڑے عرصہ کے بعد صاحب فارن سکرٹری گورنمنٹ موصوف نے زبانی وعدہ فرمایا کہ اس معاملہ پر توجہ کی جائے گی مگر کچھ ظہور میں نہ آیا جس کی شاید کوئی وجہ ہو گی اور غالب تو یہ ہے کہ کوئی بھی وجہ نہ ہو۔

جب میں اس طرف سے مایوس ہوا تو میں نے صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی خدمت میں تحریر کیا۔ اور صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا کہ ہم اس کتاب کو صاحبان سنڈیکیٹ پنجاب یونیورسٹی کی خدمت میں پیش کریں گے۔ مگر میں اس اثنا میں ایک برس کی رخصت لے کر ولایت چلا گیا۔ اور وہاں سے واپس آتے ہی مصر کی لڑائی پر بھیج دیا گیا۔ اور جب مصر سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کتاب کے بارہ میں ابھی کچھ بھی ظہور میں نہیں آیا۔ حالانکہ کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اس معاملہ میں ذاتی توجہ ظاہر فرماتے تھے۔ جس سے بوجہ معقول مجھکو یہ اُمید ہوتی تھی کہ سال کے اختتام سے پہلے کچھ نہ کچھ منظور ہو جائے گا۔

اگر کچھ عرصہ نہیں گذرا کہ میرے حامی اور دوست نہایت صاحب فضل و کمال دوست خلیفہ محمد حسین صاحب

نے (جو اس کتاب کی تصحیح اور نظر ثانی میں بہت ہی تکلیف اٹھا چکے تھے اور جن کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ یہ اُن کے ہم وطنوں کے لئے مفید ثابت ہوگی اور اس کی اشاعت میں مدد دینے سے گویا وہ ایک طرح سے سرکار عالیہ قیصریہ کی ایک خدمت بجا لائیں گے) اس کی اشاعت میں زیادہ تساہل اور تامل کو گوارا نہ فرمایا اور مجھکو یہ لکھا کہ میں اس کتاب کو خاص اپنی ذمہ داری اور اپنے ہی خرچ سے چھپوانے کے لئے آمادہ ہوں' اس تحریر کے پہنچتے ہی میں نے اُن کی اس ہمت فیاضانہ اور ارادہ افادہ عام سے کرنل ہالرائڈ صاحب کو آگاہ کیا اور اُن کے مشورہ سے آخر یہ قرار پایا کہ کتاب خلیفہ صاحب ممدوح کی خدمت میں بھیج دی جائے۔

کسی یوروپین زبان کی کتاب کا ایک مشرقی زبان میں ترجمہ کرنا شاید بعض لوگوں کو ایک آسان سا کام معلوم ہوتا ہو مگر ایسی صحت کے ساتھ ترجمہ کرنا کہ مطلب اور معنی تو ہو بہو وہی ادا ہو جائیں اور بایں ہمہ ٹھیٹھ لفظی ترجمہ بھی نہ ہو اور حتی الامکان وہ زور بھی قائم رہے جو مصنف کے اصل بیان میں پایا جاتا ہو اور مشرق کے طرز انشا کی خوبی و لطافت بھی ہاتھ سے نہ جانے ہرگز آسان نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی کتاب کے ترجمہ میں طرز بیان اور اس قسم کے امور کی نسبت کہ ترجمہ کس ڈھنگ پر کرنا چاہیے اور اس میں مصنف کے الفاظ کی پابندی وغیرہ کس حد تک کرنی یا نہ کرنی چاہیے معترضین کو (جو اپنے اپنے مذاق کے موافق اعتراض کیا کرتے ہیں) مطمئن کرنا بہت مشکل ہے مگر بہرحال چونکہ کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر نے یہ رائے دی کہ اس ترجمہ پر ایک دفعہ اور بھی نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہے۔ اس لئے میرے عنایت فرما جناب خلیفہ صاحب نے نہایت خوشی سے اُس کو بھی منظور کر لیا ہے کہ وہ اپنے لائق فائق اور صاحب علم و فضل بھائی جناب وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی مدد سے ایک دفعہ اس کتاب کو پھر بغور دیکھ ڈالیں گے۔ چنانچہ نظر ثانی کے بعد یہ کتاب ہر طرح مکمل و مرتب ہوگئی ہے اور ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس کو غیر جانب دارانہ و منصفانہ مطالعہ کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے یہ عام دلچسپی اور افادہ کا باعث ہوگی فقط

راقم

ہنری مور

دیباچہ

از خلیفہ سیّد محمد حسین میر منشی ریاست پٹیالہ

یہ کتاب جس حالت اور حیثیت میں میرے پاس پہنچی تھی وہ میرے معزز دوست جناب کرنل ہنری مور صاحب بہادر نے اپنے "انٹروڈکشن" میں مشرحًا لکھدی ہے۔ کرنل صاحب نے اصل کتاب کے بعض مضامین کا ترجمہ بھی نہیں کیا تھا کیونکہ مقصد زیادہ تر انھیں مطالب کے ترجمہ سے تھا جو سلطنت مغلیہ سے کچھ تعلق رکھتے تھے۔ لیکن میرا خیال یہ تھا کہ جو واقعات ہندوستان سے متعلق ہیں وہ سب ترجمہ ہو جائیں اس لئے ایسا ہی کیا گیا۔ البتہ ڈاکٹر برنیر کی ایک چٹھی کا جو اُس نے شیراز سے اپنے ایک دوست کو لکھی تھی ترجمہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اُس میں صرف مسئلہ جزلایتجزیٰ کی فلسفیانہ اور عام بحث ہے جس کو ہندوستان سے کوئی خصوصیت نہ تھی اور چونکہ نفس کتاب میں بعض مطالب قابل تصحیح تھے۔ یا روایات مسلمہ و مشہورہ عام کے برخلاف معلوم ہونے کی وجہ سے مصنف کا بیان توثیق طلب تھا۔ یا ناظرین کی مزید واقفیت اور بصیرت کے لئے کسی تشریح و تفصیل کی احتیاج تھی یا مقابلہ کے لئے موجودہ زمانہ کی بعض حالتوں کا دکھانا مفید تھا اس لئے معتبر کتابوں اور صحیح ماخذوں سے جہاں کہیں موقع تھا حاشیوں کا لکھنا مناسب سمجھا اور چونکہ زمانہ حال کے یوروپین مصنفوں کے دستور کے موافق عبارت میں عنوانات نہ تھے جس سے کسی مضمون کی تلاش اور حوالہ دینے میں بڑی دقت تھی لہٰذا اس کو بھی رفع کیا گیا۔ اور نظم و ترتیب کے لحاظ سے کچھ ایسے تغیرات بھی کئے گئے کہ بعض مضامین کو ایک جلد سے دوسری جلد میں منتقل کیا گیا۔ اگرچہ ان امور کے باعث خصوصًا حاشیوں کے التزام سے محنت بہت ہی بڑھ گئی مگر الحمدللہ کہ یہ کام جناب برادر معظم وزیرالدولہ مدبرالملک خلیفہ سید محمد حسن خان صاحب بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی اعانت سے باوجودیکہ مجھے اپنے منصبی کاموں سے فرصت کم تھی انجام کو پہنچ گیا۔ اور یہ دلچسپ کتاب جس کو اُس وقت کی طرز حکومت اور حالت ملک کی ایک صحیح اور بے نظیر تصویر کہنا چاہیئے نہ صرف ترجمہ بلکہ ایک طور کی تالیف کی صورت میں چھپ کر تیار ہو گئی۔ اس کی جلد ثانی اخیر ۱۸۸۵ء میں تیار ہو گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ جلد اول کے کام میں بسبب کم فرصتی اور حاشیوں کے التزام کے خلاف توقع ایسی تاخیر ہوئی کہ اس وقت سے پہلے تیار نہ ہو سکی۔ اس لئے بعد تکمیل اب دونوں جلدیں ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں۔

اس کتاب کے ترجمہ کرنے اور چھپوانے سے جو امور مجھکو مدِ نظر تھے اُن کا بیان کرنل مور صاحب بہادر نے

اپنے انٹروڈکشن میں مشروحًا لکھدیا ہے مگر اس کے علاوہ میرا ایک اہم مطلب یہ بھی تھا کہ اس ذریعہ سے راقم اور جناب موصوف کی خالص اور بے غرض دوستی کی ایک دیرپا یادگار قائم رہے۔ اس موقعہ پر اگر میں کچھ مختصر حال اپنے معزز دوست کا بیان کروں تو یقین ہے کہ بے محل نہ ہوگا۔

پس واضح ہو کہ جناب ممدوح فنون سپاہ گری کے علاوہ بڑے صاحب کمال زبان دان ہیں اور اُن کی لیاقت اور قابلیت اسی سے ظاہر ہے کہ اپنی انگریزی زبان کے علاوہ فرانسیسی۔ اٹالین۔ زمانہ حال کی یونانی ترکی عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ سندھی۔ مرہٹی۔ اور ہندوستان کی اور مختلف چھوٹی چھوٹی بولیوں سے جو علیحدہ زبانیں تصور نہیں کی جاتیں بخوبی واقف و ماہر ہیں۔ ماسوائے اس کے فن نقاشی میں بھی عمدہ دست گاہ رکھتے ہیں چنانچہ جب کبھی فرصت پاتے ہیں تو مظاہر قدرت کے نقشے بھی کھینچا کرتے ہیں۔ اور علاوہ اور جنگی کارگذاریوں کے چونکہ جنگ ایران۔ حبش۔ افغانستان۔ اور مصر کے واقعاتِ عظیم اور مشہور ہیں وہ اپنی سلطنت کی عمدہ خدمات بجالاتے ہیں اس لئے پیش گاہ علیاحضرات ملکہ معظمہ قیصر ہند سے کمپینین آف دی موسٹ نوبل آرڈر آف دی باتھ۔ اور کمپینین آف دی موسٹ ایمی نینٹ آرڈر آف دی انڈین ایمپائر کے خطابوں سے معزز و ممتاز ہیں۔

صاحب ممدوح کا اصل تعلق بمبئی پریذیڈنسی کی افواج سے ہے مگر بہ لحاظ اپنی لیاقتوں اور کمال زبان دانی کے لارڈ نیپیر آف مگڈالا اور فریڈرک ہنس اور سر ڈانلڈ اسٹورٹ صاحبان کمانڈر انچیف بہادر افواج ہند کے ایام حکومت میں متواتر پندرہ برس تک اُن کے پرسنل اسٹاف میں پرشین انٹرپریٹر کے عہدہ پر رہے ہیں۔ اور باوجودیکہ ہر صاحب کمانڈر انچیف کو "پرسنل سٹاف" کے عہدہ داروں کی نسبت یہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنے پنجسالہ ایام حکومت میں جس کو وہ افسران فوج میں سے چاہیں منتخب کرکے اپنے پاس بلالیں مگر بہ لحاظ اُن کی مسلمہ قابلیت کے تینوں صاحبان موصوف الصدر نے ان ہی کو پسند فرمایا اور اپنے پاس سے علیحدہ ہونے نہیں دیا۔

لقب پرشین انٹرپریٹر کے لفظی معنی ہیں "ترجمانِ فارسی" شروع سلطنت انگریزی میں جب کل کاروبار زبان فارسی میں ہوتا تھا اور اس قدر اردو اور انگریزی کا زور نہ تھا اور حکام انگریز اکثر بات چیت بھی زبان فارسی ہی میں کیا کرتے تھے۔ یہ لقب اُس وقت کا مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر دراصل یہ عہدہ دار بطور پرائیویٹ اور پولٹیکل سکرٹیری کے ہوتا ہے۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ جو مراسلات کسی مشرقی زبان میں کسی والی ملک کی طرف سے یا جو عرضی پرچہ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں اور سرداروں کی جانب سے صاحب کمانڈر انچیف کے پاس آتے ہیں اپنے دفتر سے اُن کا ترجمہ کراکر پیش کرانا اور اُن کا جواب وغیرہ بھجوانا۔ اور رئیسوں اور امیروں کی ملاقاتیں صاحب کمانڈر انچیف سے کرانا اور اُن کے مدارج مختلفہ کے موافق اُن کے مراسم تعظیم و تکریم کا بندوبست کرنا (جو ایک بڑا نازک کام ہے) اور ماسوا اُن کے اور صاحب کمانڈر انچیف کے حق کے لئے زبان ہندوستانی کا جاننا کوئی امر

لازمی نہیں۔ عند الملاقات ترجمانی کرنا صاحب ممدوح نہایت خوش اخلاق وسیع الملاقات خوش تقریر اور متواضع اور بڑے جفاکش شکار دوست ہیں۔ اور ہندوستانی امراد شرفا سے بہت محبت وارتباط رکھتے ہیں۔ اور دل ان کے بہی خواہ ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ صاحب ممدوح نے علاوہ اپنے اس شوق و رغبت کے جو اُن کو مشرقی زبانوں سے ہے ہندوستان کے والیان ملک اور اُمرا و شرفا کے فائدہ کے لئے باوجود مشاغل کار سرکار اس کتاب کے ابتدائی ترجمہ کرنے کی تکلیف اپنے اوپر گوارا کی تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اُن کی اور ہماری برسوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ اب یہ دعا ہے کہ میرے اہلِ وطن اور ہندوستانی والیانِ ملک عموماً جن کے لئے یہ کتاب گویا سرمایۂ بصیرت ہے اِس کے مطالعہ سے فائدہ پائیں۔ اور خصوصاً بندگان حضور فیض گنجور ہز ہائنیس فرزند خاص دولتِ انگلشیہ منصور زمان امیر الامرا مہاراجہ دھراج راجیشر سری مہاراجہ راجگان راجندر سنگھ مہندر بہادر فرماں روائے ریاست پٹیالہ دام اقبالہم کی نظر اشرف سے گذرے جن کے خوانِ نعمت سے میں نے اور میرے بزرگوں نے پرورش پائی ہے۔ اور جن کی قدیمی رعایا اور نمک خوار ہونے کا مجھے افتخار حاصل ہے۔ اور حضور ممدوح الشان اِس کی مورخانہ اور دلچسپ حکایات اور حکیمانہ اور عبرت خیز بیانات کے ملاحظہ سے محظوظ اور متمتع ہوں۔

خاتمہ پر ناظرین اہلِ زماں کی خدمت میں التماس ہے کہ چونکہ خاکسار نہ لکھنو کا رہنے والا ہے اور نہ دہلی کا۔ بلکہ پٹیالہ اور سامانہ میرا اور میرے بزرگوں کا مولد و مسکن ہے۔ جہاں زبانِ اُردو صحیح طور سے بولی نہیں جاتی پس اگر کسی محاورہ میں کوئی غلطی معلوم ہو تو معذور تصور فرمائیں۔

اَلْعُذْرُ عِنْدَ کِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ

شاہجہاں کے ایّامِ اسیری اور عہدِ اورنگ زیب

حصّہ اوّل

ضمیمہ ۲

حصہ دوم

ڈاکٹر برنیر کے خطوط کا مجموعہ

برنیر کے خطوط مانشیو روی مرویلسن کے نام

(جو اورنگ زیب کے کشمیر کے سفر سے متعلق ہیں)

ڈاکٹر برنیر کی ہندوستان میں آمد
شاہجہاں، اُس کی اولاد اور اُسکے بیٹوں کی باہمی لڑائیاں
اورنگ زیب کی تخت نشینی کے دلچسپ حالات

میں ہندوستان کس طرح پہنچا

چونکہ دنیا کی سیر کا مجھے نہایت شوق تھا۔ اس لئے ملکِ شام اور مصر کے دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنے دل میں یہ ٹھیرایا کہ اپنی اِس سیاحت کو کچھ اور وسعت دوں اور دریافت و تحقیق حالات کے لئے اس سرے سے اُس سرے تک بحرِ احمر کا سفر کروں۔ چنانچہ اپنے اس ارادہ کے پورا کرنے کے لئے ملک مصر کے دارالسلطنت قاہرہ[1] سے کہ جہاں میں ایک برس سے زیادہ مقیم رہا تھا روانہ ہوا اور بتیس گھنٹے کے عرصہ میں (کارواں کے سفر کے حساب سے) شہر سوئیز میں آ پہنچا اور یہاں سے ایک جہاز پر سوار ہو کر سترہ دن میں بمقام جدہ جو مکہ (معظمہ) سے قریب دو پہر کی مسافت پر ہے پہنچ گیا۔ میرا یہاں پہنچنا توقع کے برخلاف تھا۔ اور اُس وعدہ کے بھی جو مجھے بحرِ احمر کے ترکی حاکم[2] کی طرف سے دیا گیا تھا۔ لیکن مجبوری ہے مسلمانوں کی اُس مقدس زمین پر جہاز سے اترا جہاں کوئی عیسائی تاوقتیکہ غلام نہ ہو قدم رکھنے کی جُرأت نہیں کر سکتا۔ الغرض ایسی حالت میں اُس جگہ پانچ ہفتے قیام کر کے میں ایک چھوٹے سے جہاز پر سواحل یمن کو جا رہا تھا

---

[1] اس شہر کو ۳۵۸ھ تین سو اٹھاون ہجری مطابق ۹۴۱ء نو سو اکتالیس عیسوی میں المعز لدین اللہ خلیفہ فاطمی مغربی کے سپہ سالار جوہر نے (جن کی سلطنت پہلے پہل افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی تھی اور جو اپنے خاندان میں تیسرا خلیفہ تھا) آباد کیا تھا۔ اور مصر کو قہر و غلبہ سے فتح کرنے کی وجہ سے قاہرہ نام رکھا تھا۔ س م ح

[2] اصل کتاب میں پی آف دی ریڈ سی ہے۔ س م ح

سوار ہولیا اور پندرہ دن کے عرصہ میں بمقام مخا جو آبنائے باب المندب کے نزدیک ہے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر میرا یہ قصد تھا کہ مصوع اور ارکی کو کے جزیروں سے جو راستہ میں ملیں گے گذرتا اور اُن کو دیکھتا بحالتا ملکِ حبش کے پائے تخت گونڈار کو چلا جاؤں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ حبش میں رومن کیتھلک مذہب والوں کے لئے (جس کے ہم فرانسیس پیرو ہیں) سخت خطرہ ہے۔ یہاں یہ صورتِ حال اُس وقت سے پیدا ہوئی جب سے کہ بادشاہ حبش کی ماں نے اپنی کارسازیوں سے پرتگیزیوں کو قتل کرا دیا تھا اور باقی ماندہ کو فرقہ جیسوئیٹ[1] کے اس بڑے پادری سمیت جس کو پرتگیز گوا[2] سے اپنے ساتھ لائے تھے خارج کرا دیا تھا پس اُس وقت سے حبش میں رومن کیتھولک محفوظ اور بے خطر نہیں رہے تھے۔ بلکہ میں نے یہ بھی سُنا کہ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ بمقام سواکن ایک بیچارے بدنصیب رومن کیتھلک درویش تک کا اس جرم میں سر کاٹا گیا۔ کہ اُس نے اُس ملک میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا اس لئے یہ تدبیر مناسب اور کم خطر معلوم ہوئی کہ میں ایک یونانی یا ارمنی[3] کا

---

[1] جیسوئیٹ کے معنی ہیں منسوب بہ جی زس یا جی سس جو فرنگی زبانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے۔ یہ ایک شاخ فرقہ رومن کیتھلک کی ہے۔ جس کو ۱۵۳۴ء میں ہسپانیہ کے رہنے والے اگناتیوس لائلا نامی ایک مشہور شخص نے جو ۱۴۹۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۵۶ء میں مرا تھا قائم کیا تھا۔ س م ح

[2] گوا ہندوستان کے ساحل مالا بار پر بمبئی سے جنوب کے رخ تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو کئی سو برس سے معہ مختصر سے علاقہ کے پرتگیزوں کے قبضہ میں ہے اور جس کو آج کل انگریزی اصطلاح میں پورچوگیز انڈیا یعنی ہندوستان مقبوضہ اہلِ پرتگال کہتے ہیں۔ یہاں ان کا ایک گورنر رہتا ہے۔ اور ان کی نسبت اسی کتاب کے ایک اور مقام میں مفصل ذکر آئے گا۔ س م ح

[3] میرے دوست کرنل ہنری مور صاحب بہادر جنھوں نے اس ملک کو دیکھا ہوا ہے میرے نام کی ایک چٹھی میں مصنف کے اس ارادہ کی نسبت اپنا خیال یوں لکھتے ہیں کہ اگرچہ حبش کے نصرانیوں کو کلیسائے ارمنی یا یونان سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ بلکہ حبشی کلیسا پندرہ سو برس سے بجائے خود علیحدہ چلا آتا ہے مگر چونکہ ارمنی عیسائی تجارت پیشہ ہونے کے سبب سے ممالک مشرقی میں کہیں نہ کہیں ہمیشہ دکھائی دیتے رہے ہیں اور زمانہ دراز تک فرنگیانہ لباس بھی نہیں پہنتے تھے اس وجہ سے کسی فرنگستانی لباس والے یورپین عیسائی کی طرح ایسے اجنبی مقامات میں مشتبہ یا تعجب انگیز نہیں ہو سکتے تھے۔ س م ح

بھیس بنالوں۔ جب بادشاہ کو یہ اطمینان ہوجائے گا کہ میں اُس کے واسطے کچھ مفید اور کار آمد ہو سکتا ہوں تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ مجھے کچھ زمین دے دیگا اور حسب مقدور میں غلام خرید کر اس کا بندوبست کرسکوں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ اس صورت میں مجھے وہاں شادی بھی ضرور کرلینی پڑے گی جیسے کہ ایک یوروپین راہب کا جس نے اپنے آپ کو یونانی باشندہ اور طبیب ظاہر کیا تھا۔ جبراً بیاہ کر دیا گیا تھا۔ اور پھر اس حالت میں مجھے اس مُلک کے چھوڑنے کی اُمید قطع کرلینی ہوگی۔

ان اندیشوں اور چند وجوہ کی بناء پر جن کا ذکر آگے کیا جائے گا، میں نے گونڈار جانے کا ارادہ چھوڑ دیا اور ایک ہندوستانی جہاز پر سوار ہوکر آبنائے باب المندب کی راہ سے بائیس دن میں بمقام سورت جو سلطنت مغلیہ میں ہندوستان کی ایک بندر گاہ ہے آپہنچا۔

شاہجہاں اور اُس کا نسب

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بادشاہ وقت کا نام شاہجہاں ہے جو جہانگیر کا بیٹا اور اکبر کا پوتا اور ہمایوں کا پڑپوتا ہے اور ہمایوں سے اوپر اُس کا سلسلۂ نسب تیمور لنگ سے جا ملتا ہے جس کو ہم فرنگستانی عموماً تمرلین کہتے ہیں۔ شاہجہاں سلسلہ وار تیمور سے دسویں پشت[1] میں ہے۔

---

[1] یعنی شہاب الدین محمد شاہجہاں صاحبقران ثانی کا باپ نور الدین محمد جہانگیر۔ اُس کا جلال الدین محمد اکبر اُس کا نصیر الدین محمد ہمایوں اُس کا ظہیر الدین محمد بابر اُس کا عمر شیخ مرزا اُس کا سلطان ابو سعید مرزا اُس کا سلطان محمد مرزا اُس کا جلال الدین میران شاہ مرزا اُس کا امیر تیمور گورگان صاحبقران اول جو تیمور تیمر اور تمرلنگ مشہور ہے۔ اس کے لنگڑے ہونے کی وجہ کتاب عجائب المقدور فی احوال التیمور میں جو اُس کی ایک سخت ہجو آمیز تاریخ ہے یہ لکھی ہے کہ ابتدائے حال میں کسی شخص کی بکری کی چوری کرتے ہوئے تیر کے زخم سے اُس کی ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی تھی۔ اور چونکہ اُس نے ترکوں کے اکثر خاندانوں میں اپنی شادیاں کرلی تھیں اس لئے اُس کے ہم قوم اُس کو گورگان کہنے لگ گئے تھے جو ترکی میں داماد کو کہتے ہیں ــــ اور تمر کے معنی ہیں لوہا۔ اور صاحب قران کہلانے کی یہ وجہ تھی کہ اس کے بادشاہ ہوجانے کے بعد خوشامدیوں نے اس کا زائچہ طالع بنا کر اس میں یہ لکھدیا تھا کہ زہرہ و مشتری جو نجومیوں کے عقیدے میں دو بڑے سعد ستارے ہیں اپنے طالع میں قران کی حالت میں ہیں۔ س م ح

ہندوستان میں لفظ مغل کا اطلاق

تیمور جس کی ملک گیری کے واقعات مشہور و معروف ہیں۔ اُس نے اپنی ایک رشتہ دار عورت یعنی اُس بادشاہ کی اکلوتی بیٹی سے شادی کرلی تھی جو اُس وقت تاتاریوں کی اس نامور قوم کا جن کو مغل کہتے تھے فرماں روا تھا۔ مگر اب لفظ مغل اُن سب غیر ملک کے رہنے والوں کے

۵ے کتاب ظفر نامہ میں جو تیمور کی ایک نہایت خوشامد آمیز تاریخ ہے اُس کے عروج کا حال یوں لکھا ہے کہ ۱۳۳۳ء میں لیسور اظلن کا بیٹا قزان سلطان جو چغتائی خاں کی اولاد سے تھا ترکستان اور ماوراء النہر میں ایک ایسا جابر اور خوں ریز بادشاہ تھا کہ سردار لوگ دربار میں جاتے ہوئے کنبہ والوں کو وصیتیں کرکے رخصت ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ آخرکار امیر قزغن نے جو اُس سرداروں میں ایک نہایت قابل اور دانا شخص تھا تنگ آکر اُس یعنی قبیلہ چغتائی کے امیروں وغیرہ سے اتفاق کرکے بغاوت کی اور ۷۴۷ھ میں فتحیاب ہوکر اُسے مار ڈالا۔ مگر سلطنت کی یہ صورت رہی کہ اگرچہ حقیقتاً حکومت امیر قزغن اور اُس کی اولاد کے قبضہ میں تھی۔۔۔ لیکن تاہم بادشاہی خاندان میں سے برائے نام کسی کو خان یعنی بادشاہ بنائے رکھتے تھے مگر جب قزغن کے بیٹے عبداللہ نے اپنے ہم عصر نام نہاد بادشاہ کو بے گناہ قتل کر ڈالا اور اسی علت میں خود بھی تباہ و برباد ہوا تو ملک میں کچھ عرصہ طوائف الملوکی کی صورت رہی۔ مگر امیر قزغن کا پوتا امیر حسین جو امیر مسلا کا بیٹا تھا پھر ایک ذی اقتدار فرماں روا ہوگیا۔ اور اپنے دارالحکومت شہر بلخ کے پاس ایک پرانے قلعہ کو جو قلعہ ہندوان کے نام سے مشہور تھا از سر نو تعمیر کرکے اُس میں رہنا شروع کیا۔ اور چونکہ اُس کی بہن کی شادی تیمور سے ہوئی تھی۔ ابتدائے حال میں اُس کا اور تیمور کا نہایت اتحاد تھا مگر رشک و حسد کے باعث آخر کار عداوت ہوگئی۔ اور چونکہ امیر حسین کی بہن بھی مرچکی تھی تیمور نے اپنی جائے قیام کش معروف بہ شہر سبز سے جو سمرقند کے قریب اب روسیوں کے قبضہ میں ہے قلعہ ہندوان پر فوج کشی کی اور امیر حسین ۷۷۱ھ میں گرفتار ہوکر معہ اپنے دو بیٹوں کے قتل ہوا۔ اور باقی دو بیٹے ہندوستان کو بھاگ آئے۔ اور تیمور نے اُس کی زوجہ سرائے ملک خانم دختر قزان سلطان اور تین اور بیگموں کو غالباً ذی عزت قبائل ترک کی بیٹیاں سمجھکر مصلحتاً گھر میں ڈال لیا۔ اور اُس کی بڑی بیگم کو معہ اس کی بیٹیوں اور بیگموں کے اپنے بڑے بڑے سرداروں میں تقسیم کردیا اور قلعہ ہندوان اور اُس کے محلات وغیرہ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیئے اور اس طرح امیر حسین کا نام و نشان مٹا کر خود بادشاہ بن گیا اور آخر کار ایسا نامور ہوا کہ آج تک اُس کا نام مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برنیر نے اپنی تحریر میں غالباً اسی سرائے ملک خانم زوجہ سابق امیر حسین کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ اُس کو کتاب حبیب السیر میں خان زادہ یعنی شاہزادی اور دختر قزان سلطان لکھا ہے ورنہ تیمور کے اٹھارہ بیبیوں اور بائیس حرموں کی تفصیل میں جو بہت سے ترک اور مغل سرداروں کی بیٹیاں

لئے بولا جاتا ہے جو فی زمانہ ہندوستان پر (جس کے معنی ہیں ہندوؤں یا ہندیوں کا ملک) حکومت کرتے ہیں۔ مگر یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ سلطنت مغلیہ میں بڑے بڑے معزز اور معتبر منصب صرف مغلوں ہی کو ملتے ہیں یا صرف یہی لوگ فوج میں عہدے پاتے ہیں۔ بلکہ یہ منصب اور عہدے مغلوں اور سب ولائتوں کے نو وارد مسلمانوں کو بلاکسی امتیاز و خصوصیت کے دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اکثر تو ایرانیوں کو اور بعض بعض عربوں کو اور کچھ ترکوں کو۔

جن لوگوں کو آج کل یہاں مغل کہا جاتا ہے اُن کی پہچان کے واسطے یہ نشان کافی ہے کہ چہرہ کا رنگ گورا ہو اور مذہب اسلام۔ اور یورپ کے عیسائیوں کی جن کو یہاں فرنگی کہتے ہیں یہ پہچان ہے کہ رنگ سفید ہو اور مذہب عیسائی۔ اور ہندوؤں کی یہ علامت ہے کہ رنگ[1] گندمی ہو اور مذہب بُت پرستی۔

شاہجہاں کی ضعیفی اور اُس کے بیٹوں کی باہمی آویزش

مجھے یہاں آکر یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہجہاں کی عمر اس وقت قریب ستر برس کے ہے اور اس کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور چند سال ہوئے کہ اُس نے چاروں بیٹوں کو اپنی نیابت اور قائم مقامی کے طور پر ہندوستان میں بڑے بڑے چار صوبے جن کو سلطنت کہنا چاہیئے دے دیتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہ ایک سال کے عرصہ سے بیمار رہتا ہے کہ جس سے اُس کی زندگی کو خطرہ ہے۔ اور اُس کے بیٹوں نے باپ کی یہ حالت دیکھکر حصولِ سلطنت کے لئے منصوبے باندھنے اور چالیں چلنی شروع کر رکھی ہیں اور اُن کی باہمی جنگ و جدال جاری ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہیں خان زادہ کا لفظ اور کسی کی نسبت نہیں لکھا۔ مگر برنیر کی تحریر سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ تیمور کی اس بیگم کا باپ جو تمام تاتاریوں کا بادشاہ تھا۔ جن کو مغل کہتے تھے۔ اُس وقت کی تاریخوں سے غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس زمانہ میں بلخ اور بخارا وغیرہ میں قران سلطان خاں فرماں روا تھا اُسی زمانہ میں تغلق تیمور خاں ترکوں اور مغلوں کی قوم جٹہ میں علیحدہ بادشاہی کر رہا تھا اور ایران میں سلطان ابوسعید بہادر خاں جو مغلوں کے ابوالآبا چنگیز خاں کی اولاد سے تھا بہت بڑا بادشاہ تھا اور یہ اشارہ بھی غلط پایا جاتا ہے کہ تیمور لنگ اس مذکورہ بالا رشتہ کے سبب سے مغلوں کی قوم میں داخل ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ اُلوس جغتائی کی شاخ برلاس سے تھا جو اپنے تئیں سلسلہ نسب میں مغلوں سے علیحدہ نہیں سمجھتے۔ س م ح

[1] اصل انگریزی میں لفظ براؤن ہے۔ یعنی کھورا س م ح

شاہی ملازمت

چونکہ میں اس ملک میں پہنچ کر غارت گروں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا اور پانچ ہفتہ کے سفر کے کثیر اخراجات کی وجہ سے جو سورت سے آگرہ اور دہلی تک پہنچنے میں پیش آئے تھے، تنگ دست ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے طبیبوں کی ذیل میں سرکار شاہی میں نوکری اختیار کرلی تھی اور پھر تھوڑی مدت بعد دانشمند خاں[1] کی سرکار سے میرا تعلق ہوگیا جو اول میر بخشی کے عہدہ پر مامور تھا۔ اور نہایت ذی اقتدار اور ممتاز ترین امرائے دربار میں سے ہوگیا تھا۔ یہ شخص تمام ممالک ایشیا میں بہت بڑا عالم و فاضل سمجھا جاتا تھا۔ آٹھ برس کے طویل تعلقات کے سبب سے جو دربار مغلیہ سے رہے تھے۔ میں نے اس جنگ وجدال کے بعض اہم واقعات بچشم خود دیکھے تھے اس لئے میں اُن کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

شاہجہاں کی اولاد

شاہجہاں کے بڑے بیٹے کا نام دارا شکوہ، دوسرے کا سلطان شجاع تیسرے کا اورنگ زیب، چوتھے کا مراد بخش اور دونوں بیٹیوں میں سے بڑی کا نام بیگم صاحب[2] اور چھوٹی کا روشن آرا بیگم تھا۔ اس ملک میں یہ دستور ہے کہ خاندان شاہی کے سلاطین اور بیگمات کے نام ایسے رکھتے ہیں جو شان و شوکت سلطنت پر دلالت کریں۔ چنانچہ شاہجہاں کی بیگم جو حسن و جمال میں مشہور تھی اس کا نام تاج محل[3] تھا۔ یہی

---

[1] شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد کی فارسی کتابوں میں دانشمند خاں کا نام اُن صاحب کمال لوگوں کی فہرست میں لکھا ہوا ہے جو اُس وقت اس سلطنت میں علم و فضل کے لئے مشہور تھے۔ یہ ایرانی عالم شہر یزد کا رہنے والا تھا اور کمالِ علمی کے باعث ملا شفیعائے یزدی کے نام سے مشہور تھا۔ اور ہندوستان میں تجارت کی تقریب سے آیا تھا۔ لکھا ہے کہ جب یہ اپنے وطن کو واپس جانے لگا تو شاہجہاں نے اُس کے علم و فضل کا چرچا سُن کر ازراہِ قدردانی بندر سورت سے واپس بلاکر امرائے دربار میں داخل کرلیا۔ اور تا عہدِ سلطنت اورنگ زیب معزز و مکرم رہا اور سنہ ... میں مر گیا۔ یہ شخص فلسفہ ہئیت اور ہندسہ میں بہ تخصیص مشہور تھا۔ اور ایسا عالم تھا کہ نعمت خاں عالی سا شخص اس کا شاگرد تھا۔

[2] عہدِ شاہجہاں کے مورخوں نے اس کا نام جہاں آرا بیگم بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ بیگم صاحب تو اس کا لقب تھا۔

[3] یہ نام نہ تھا بلکہ خطاب تھا جس کو مصنف نے عوام کے محاورہ کے موافق ممتاز محل کی جگہ تاج محل لکھ دیا ہے۔ اور نام ارجمند بانو بیگم تھا۔ س م ح

کا وہ عالی شان اور عجوبہ روزگار مقبرہ آگرہ میں ہے جس کے مقابلہ میں اہرامِ مصر[1] جو منجملہ عجائبات دنیا سمجھے جاتے ہیں محض ناتراشیدہ پتھروں کے ڈھیر اور ناموزوں

---

[1] مصر کے مخروطی نما چوپہل مینار اہرام کہلاتے ہیں۔ ان پر جو کتبے ہیں وہ ایسے حروف میں ہیں جن کو اس زمانہ میں ہر شخص نہیں پڑھ سکتا۔ اور مصر کے قدیمی باشندے ان کو اپنی مقدس چیزوں میں استعمال کرتے یا اسرارِ الٰہی کو چھپانے کے لئے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ اہلِ عرب ان میناروں کو بہ لحاظ ان کے نہایت دیرینہ سال اور پرانا ہونے کے اہرام کہتے ہیں جو ہرم سے مشتق ہے اور جس کے معنی بڑھاپے کے ہیں مگر محیط المحیط نے جو لغت عربی کی ایک نو تالیف مستند کتاب ہے، لکھا ہے کہ اہرام ہرم کی جمع ہے جو اصطلاح اہل مساحت و ہندسہ میں کسی ایسی مخروطی شکل کی عمارت کو کہتے ہیں جس کا قاعدہ مربع یا مثلث یا کثیر الاضلاع ہو۔ ان میں سے تین مینار بہت مشہور ہیں جن میں ایک چھوٹا اور دو بڑے ہیں۔ دونوں بڑے مینار جن کو عرب بہ صیغہ تثنیہ الہرمان کہتے ہیں چی آپس اور کیفرینس کے نام پر مشہور ہیں۔ اور چی آپس والا مینار زیادہ عمدہ ہے کیونکہ عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ عمارت ایک چوکھونٹے چبوترے پر بنی ہوئی ہے جس کا ایک ضلع سات سو چھیاسی فٹ لمبا اور چار فٹ آٹھ انچ اونچا ہے اور اس کے اوپر کچھ گھٹا کر ایک اور چبوترہ ہے۔ اور اسی طرح دوسرے تین چبوترے اوپر تلے بنے ہوئے ہیں۔ یہ مینار ساڑھے سولہ بیگھہ زمین میں ہے اور اس کی بلندی چار سو چھیاسی فٹ اور چوٹی دس گز مربع کا چبوترہ ہے مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس جو سنہ عیسوی سے چار سو برس پیشتر مصر کی سیر کو آیا تھا لکھتا ہے کہ یہ مینار چی آپس بادشاہ کے عہد میں بیس برس کے عرصہ میں تیار ہوا تھا اور اس پر ایک لاکھ آدمی کی مدد ہمیشہ لگی رہتی تھی۔ اور اس پر مصری حروف میں لکھا ہوا ہے کہ کاریگروں کی صرف لہسن پیاز کی چٹنی میں ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اصل میں یہ مینار مصری بادشاہوں کے مقبرے ہیں جن میں اُن کی لاشیں اب تک پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ خلیفہ مامون عباسی جب سنہ ۲۰۰ ہجری میں مصر میں آیا تو اُس کو اس چی آپس والے مینار کے اندر کی عمارت کے دیکھنے کا بڑا شوق ہوا اور اُس نے فولادی ٹانکیاں بنوا کر پتھر کو کھدوایا۔ اور ایک راہ پائی اور جب اُس میں گئے تو ایک چوکونٹی باولی ملی جس کے چاروں طرف کی دیواروں میں کمروں کے دروازے تھے۔ اور ایک کمرے میں بہت سی لاشیں کتاں میں خوشبوؤں سے لپٹی ہوئی جسے مومیا کہتے ہیں رکھی ہوئی تھیں۔ پھر ایک کمرے میں اس کے اوپر پتھر کے صندوق میں آدمی کی ایک مورت ملی جس کے سینہ پر جواہر سے جڑا ہوا سونے کا [illegible] رکھا تھا۔ اور سونے کے پترے پر ایسے حروف کندہ تھے۔ جن کو کوئی نہ پڑھ سکا۔ بعض محققوں نے اس بڑے مینار کی پیمائش کے وقت یہ بھی دریافت کیا ہے کہ اس مینار کے چاروں پہل نانے

تو وہ ہائے سنگ نظر آتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس جہانگیر کی بیگم کا نام اول نورمحل[ا] تھا۔ پھر نورجہاں بیگم ہوا جس نے مدت تک، اپنے شوہر کی ایسی حالت میں کہ بجز شراب خوری اور عیش پسندی کے اُس نے سب کاموں کو چھوڑ رکھا تھا امورِ سلطنت اور ملک داری کو خود انجام دیا۔

اُمرائے سلطنت اور خطابات

ہندوستان میں جو یہ بڑے بڑے اور ممتاز نام اعیان خاندان شاہی اور امرا کے رکھے جاتے ہیں اور فرنگستان کی طرح ایسے خطاب نہیں دیئے جاتے جو اراضیات و ممالک کے قبضہ و مالکیت سے مشتق و منسوب ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں تمام ملکیت کی زمینیں خالصہ شریفہ یعنی ملک سرکار شاہی سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے فرنگستان کی طرح یہاں کوئی ارل یا مارکویس یا ڈیوک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ امرائے دربار کو خواہ جاگیر خواہ نقد جو کچھ دیا جاتا ہے وہ صرف بطور پنشن اور ذاتی مدد معاش کے دیا جاتا ہے جس کا مقرر کرنا صرف بادشاہِ وقت کی مرضی پر موقوف ہے۔ اور جب وہ چاہتا ہے اُس میں کمی یا بیشی کر دیتا ہے۔ یا ضبط کر لیتا ہے۔ اس لئے یہ بات کچھ قابل تعجب نہیں کہ امرائے سلطنت پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) والوں نے دنیا کی چاروں سمتوں کے ٹھیک مقابل بنائے ہیں۔ جس سے وہاں کا نصف النہار نہایت صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا مینار جو کیفرنیس والا کہلاتا ہے اُس کے نیچے کے چبوترے کا ہر ایک ضلع چھ سو چوراسی فٹ لمبا اور بلندی چوٹی تک چار سو چھپن فٹ ہے۔ اس مینار پر چڑھکر دیکھنے سے دکن کی طرف دریائے نیل اور اُتر کی جانب پہاڑ اور ریگستان اور پچھم کے رخ لیبون کا جنگل اور پورب کی سمت مقام جیزہ اور فسطاط کے برج اور تمام قاہرہ کا مینار اور سلطان صلاح الدین کا قلعہ سب عجیب لطف سے دکھائی دیتے ہیں۔ پرانے زمانہ کے مورخوں نے اول الذکر مینار کے بانی کے نام اپنے اپنے لہجہ کے موافق مختلف لکھے ہیں جن میں سے ایک نام یہاں لکھدیا گیا ہے اور یہ بادشاہ دو ہزار تین سو باون برس قبل مسیح علیہ السلام کے تھا۔ اور نہایت ہی خوں ریزی اور سفاکی کے ساتھ پچاس برس تک حکمراں رہا تھا۔ اور اسی طرح دوسرے مینار کے بانی کے نام بھی کئی طور پر لکھے ہیں اور اس کو بعض مورخوں نے پہلے مینار کے بانی کا بیٹا اور بعض نے بھائی اور جانشین بتایا ہے اور یہ بھی ویسا ہی ظالم اور خوں ریز تھا اور چھپن برس تک بادشاہ رہا تھا۔ س م ج

ماخوذ از ترجمہ تاریخ اقوام قدیم مصنفہ ڈاکٹر رالن مطبوعہ سینٹیفک سوسائٹی علی گڑھ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ

[ا] اس کا نام مہرالنسا بیگم تھا۔ اور نورمحل اور نورجہاں خطاب تھے س م ر

شکوہ اور شان دار خطابات سے مشرف و ممتاز کیے جائیں۔ مثلاً کوئی شیر افگن خاں! کوئی صف شکن خاں، کوئی رعد انداز خاں، کوئی برق انداز خاں، اور علیٰ ہذا القیاس دیانت خاں دانشمند خاں فاضل خاں وغیرہ وغیرہ۔

شاہجہاں کا بڑا لڑکا دارا شکوہ

دارا شکوہ گفتگو میں بہت شیریں زبان، حاضر جواب نہایت خوش خلق اور بے حد فیاض اور دریا دل تھا۔ مگر با ایں ہمہ بڑا ہی خود پسند اور خود رائے تھا اور اُس کو یہ گھمنڈ تھا کہ میں اپنی عقل کی رسائی اور خوش تدبیری سے ہر امر کا بندوبست اور انتظام کر سکتا ہوں۔ اور کوئی فرد بشر ایسا نہیں جو مجھے صلاح و مشورہ دے سکے۔ وہ اُن لوگوں سے جو اُسے ڈرتے ڈرتے کوئی صلاح دینے کی جرأت کر بیٹھتے تھے۔ تحقیر اور اہانت سے پیش آتا تھا۔ چنانچہ اِس ناپسندیدہ سلوک ہی کے سبب سے اُس کے دلی خیر خواہ بھی اُس کے بھائیوں کی پوشیدہ اور مخفی سازشوں سے اُسے آگاہ نہ کر سکے۔ وہ ڈرانے اور دھمکانے میں بڑا تیز تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے اُمرا کو بُرا بھلا کہہ بیٹھتا اور اُن کی ہتک کر ڈالتا تھا۔ لیکن اُس کا غصہ اور بدمزاجی ایک آن کی آن میں جاتی رہتی تھی۔ یہ شہزادہ اگرچہ شعائر مذہب اسلام کی بجا آوری کے موقعوں میں ہمیشہ شریک ہوتا رہتا تھا اور اِس مذہب کے تبع اور پیرو ہونے کا بھی علانیہ اقرار کرتا تھا۔ لیکن بس وہ پیدائشی مسلمان ہی تھا۔ کیونکہ وہ اپنے اوقاتِ تخلیہ میں ہندوؤں کے ساتھ ہندو اور عیسائیوں میں عیسائی تھا۔ چنانچہ پنڈتوں اور ہندو سادھوؤں کو ہمیشہ اپنی صحبت میں رکھتا تھا۔ اور اُن کے لئے بڑے بڑے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ ان حالات سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اِن لوگوں ہی کے اثر صحبت سے اُس کے عقیدۂ اسلام میں ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس بارے میں ہم اپنی رائے اُس موقعہ پر بیان کریں گے جہاں ہندوؤں کے طریق عبادت اور پرستش کا ذکر لکھیں گے۔ اس کے علاوہ کچھ دنوں تک پادری بوزی صاحب مقتدائے فرقہ جیسوئٹ کے مواعظ دینیہ کو بھی بہت رغبت سے سنتا رہا تھا اور اُن مواعظ کی خوبیوں اور صداقت پر کچھ اعتقاد بھی رکھنے لگا تھا۔ مگر بعض یوں کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ کسی مذہب کا بھی معتقد نہ تھا۔ اور یہ سارا دکھاوا اُس نے محض دل لگی اور شوق تحقیقات کے لئے اختیار کر رکھا تھا۔ اور بعض کی یہ رائے ہے کہ کبھی جو وہ اپنے عیسوی

میلان کا مظاہرہ کرتا تھا تو اُس میں یہ مصلحت تھی کہ وہ عیسائی جو اُس کے توپ خانہ میں بھرتی تھے اور جن کی تعداد بھی ذرا زیادہ تھی اُس کو پسند کریں۔ اور اپنی ہندویت ظاہر کرنے سے اُس کی یہ غرض تھی کہ باج گذار ہندو راجاؤں کی تالیفِ قلوب کر کے اپنی محبت اُن کے دل میں پیدا کرے۔ اور حقیقت میں ذی اقتدار راجاؤں سے باخلاق و محبت پیش آنا وہ ضروری سمجھتا تھا۔ تاکہ ضرورت کے وقت اُن کا تعاون اور رفاقت حاصل کر سکے۔ لیکن عیسائیوں اور ہندوؤں کے مذاہب اور عقائد کی طرف میل کرنے کے یہ جھوٹے حیلے کسی طرح اُس کے منصوبوں کی کامیابی میں کارآمد اور مفید نہ ہوئے بلکہ بر خلاف پڑے۔ چنانچہ اس تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ اورنگ زیب نے جو اُس کا قتل جائز ٹھیرایا تھا تو اُس کی وجہ یہی ظاہر کی تھی کہ وہ کافر اور لا مذہب ہو گیا ہے۔

لہ عالمگیر نامہ میں جس کے مسودے بادشاہ کے ملاحظہ کے بعد صاف ہوتے تھے اور جس میں مورخوں کے شیوہ کے برخلاف عالمگیر کے مخالفوں کا ذکر جا بجا نہایت ہی سخت کلامی کے ساتھ کیا گیا ہے دارا شکوہ کے مذہب کی نسبت جس طرح پر لکھا ہے اُس کے بہت سے نا ملایم اور مکرر الفاظ کو چھوڑ کر اس جگہ نقل کیا جاتا ہے قولہ "از شنایع اطوار آں برگشتہ روزگار (یعنی داراشکوہ) کہ عنقریب بہ وبال آں گرفتار آید و باعث التہاب نوایر قہر و انتقام ایں خدیو اسلام (یعنی اورنگ زیب) بیشتر ہماں شد ایں بود کہ در اواخر حال از برگشتہ بختی باظہار مراتب اباحت والحاد کہ در طبع او مرکوز بود و آں را بتصوف نام نہادہ اکتفا نمودہ بدین ہندواں مائل شدہ بود۔ ہموارہ با برہمنان و جوگیان و سناسیان صحبت می داشت۔ و آں گروہ را مرشدانِ کامل و عارفاں بحق واصل می دانست و کتاب آنہارا کہ بہ بید موسوم است کتاب آسمانی می دانست و مصحف قدیم می خواند و از کمال اعتقادے کہ بہ بید می داشت برہمنان و سناسیان را از اطراف و اکناف بسعی ہائے بلیغ و رعایت ہائے عظیم جمع آوردہ در صدد ترجمہ آں شدہ ہموارہ اوقاتش مصروف ایں شغل ناصواب و تفکر و تدبر در مضامین آں کتاب می شد و بجائے اسمائے حسنہ الٰہی اسمی ہندوی کہ ہنود آں را پرکھوی نامند و اسم اعظم می دانند بخط ہندوی بر نگینہ ہائے جواہرے کہ می پوشید منقش کردہ بآں تبرک می جست و چوں معتقدش آں بود کہ تکلیف عبادات ناقصاں راست و عارف کامل را عبادت در کار نیست و کریمہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ را بمشرب ملاحدہ فرا گرفتہ دلیل ایں معنی می ساخت و بنا بریں عقیدہ فاسدہ نماز و روزہ و سایر تکالیف شرعیہ را خیر باد گفتہ بود و ایں خدیو دیں پرور پاک اعتقاد را ہمیشہ حمایتِ دین مبین نصب العین ضمیر منیر است از استماع ایں عقاید ردیہ و اطوار باطلہ از بے سعادت عرقِ حمیت دیں بحرکت می آید الخ۔"

سُلطان شجاع کے عادات وخصائل

شاہجہاں کا دوسرا بیٹا سلطان شجاع اپنی وضع و عادات میں اپنے بھائی داراشکوہ کے مشابہ تھا لیکن یہ زیادہ فہیم اور اپنے عزم اور ارادوں میں زیادہ قائم و مستقل اور داراشکوہ کی نسبت حسن تمیز اور ہوشیاری اور ایسے اوضاع واطوار میں جو شاہزادوں کے لیے زیبا ہیں بڑھا ہوا تھا۔ سازشوں اور زیرزمین کارروائیوں میں بڑا ماہر تھا۔ اور بڑے بڑے ذی قدرت امرائے دربار خصوصًا بڑے بڑے ذی اقتدار راجاؤں مثلاً جسونت سنگھ[1] وغیرہ کو مخفی طور پر انعامات دے کر اُن کی دوستی حاصل کرنے کا گر بھی اُسے خوب آتا تھا۔ مگر باوجود ان اوصاف کے نہایت عیاش اور عشرت پسند تھا اور جب اپنی بے شمار حرموں اور ارباب نشاط وغیرہ کے جلسہ میں ہوتا تو تمام دن اور رات رقص و سرود اور شراب نوشی میں بسر کرتا اور کوئی مصاحب جس کو اپنی جان پیاری ہوتی ایسے اوقات میں اُس کو ان حرکات سے روکنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اسی وجہ سے اُس کے امورِ سلطنت اکثر درہم وبرہم رہتے تھے اور اُس کی محبت رعایا کے دل میں بہت کم تھی۔ اگرچہ اُس کا باپ اور بھائی ترکانِ روم یعنی اہلِ سنت وجماعت کا مذہب رکھتے تھے۔ مگر سلطان شجاع ایرانیوں کے عقاید یعنی مذہب شیعہ کا علانیہ معتقد اور منفر تھا۔ واضح ہو کہ دینِ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں جیسا کہ کتاب گلستاں کے نامور مصنف شیخ سعدی کے ایک شعر[2] کے ترجمہ سے جو ذیل میں درج ہے دریافت ہوتا ہے۔ ترجمہ بیت "میں ایک درویش بادہ نوش اور شخص رند مشرب ہوں اور بہتر فرقے مجھکو خوب جانتے ہیں" منجملہ ان فرقوں کے دو فرقے ایسے ہیں جن کا باہمی تعصب اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ دونوں آپس میں جانی

---

[1] مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور والی جودھپور مراد ہے جس کو شاہجہاں کے عہد میں بادشاہ کے ننہال میں ہونے کی وجہ سے بڑا اقتدار اور خطاب مہاراجگی حاصل ہو گیا تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں بھی یہ ریاست اسی خاندان میں قائم ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح مصنف کے زمانہ میں اس ریاست کے فرماں روا کا نام جسونت سنگھ تھا مترجم کے زمانہ کے فرماں روا کا نام بھی جسونت سنگھ ہی ہے۔ اس ریاست کی خالص آمدنی سوائے جاگیرداران معافیات کے بموجب کتاب تاریخ جلسہ قیصری واقع دہلی مصنفہ تالبائٹے وہیلر صاحب اب پچیس[5] لاکھ روپیہ اور رقبہ پینتیس ہزار چھ سو ستر میل مربع اور آبادی بیس لاکھ آدمی کی ہے۔ م ح

[2] یہ شعر باوجود تلاش دستیاب نہیں ہوسکا۔ م ح

دشمن ہیں۔ ایک آن میں۔ یہ ترک یعنی رومی ہیں جن کو ایرانی لوگ عثمانی یعنی پیروانِ عثمان کہتے ہیں اور یہ عثمان کو اپنے پیغمبر کا سچا اور اصلی قائم مقام اور خلیفہ سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خلیفہ (یعنی سب اہل اسلام کا فرمان فرمائے علی جو تاویلات الفاظ قرآنی اور اجتہاد کرسکتا ہو اور فیصلہ قضایا اور مباحث اور تنازعات شرعیہ کا استحقاق رکھتا ہو) صرف وہی ہے۔ دوسرا فرقہ ایرانیوں کا ہے جن کو ترک لوگ رافضی یا شیعہ اور علی مردان کہتے ہیں۔ ان لفظوں کے معنی ہیں ایک ایسا فرقہ جو عام فرقہ اہل اسلام سے خارج ہو یا بدعتی اور طرف دارانِ علیؓ۔ کیونکہ ایرانی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خلافت و امامت صرف علی کا حق تھا جو پیغمبر کے داماد تھے۔ سلطان شجاع نے جو مذہب شیعہ قبول کرلیا تھا۔ بظاہر اس میں یہ حکمت تھی کہ اس بات کو اپنے امورِ سلطنت کی مطلب براری کا ذریعہ جانتا تھا کیونکہ شاہجہاں کی سلطنت میں ایرانی بڑے بڑے مقتدر عہدہ دار اور دربار میں بے حد صاحبِ اختیار تھے۔ اور شجاع کو یہ اُمید تھی کہ جب کبھی کوئی معرکہ آن کر پڑے گا اور موقعہ پیش آئے گا۔ تو مجھے ان سے بوقتِ ضرورت ہر قسم کی مدد ملے گی اور فائدہ پہنچے گا۔

اورنگ زیب تیسرا بھائی اورنگ زیب اگرچہ اُس قدر خوش اخلاقی اور کشادہ روئی اور فراخ مزاجی کی صفات سے جو داراشکوہ میں موجود تھیں موصوف نہ تھا۔ لیکن نہایت مردم شناس تھا۔ چنانچہ اُس کی رائے ایسے معتمد اور وفادار اشخاص کے انتخاب میں جو اُس کی خدمات کو نمک حلالی اور قابلیت کے ساتھ بجا لانے کی

لے مصنف کی یہ معلومات جو اکثر غلط ہیں بعینہ ترجمہ کی گئی ہیں۔ ترکان روم کو عثمان لو یا عثمان لی صرف اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس سلطنت کا فرمان روا خاندان سلطان عثمان خاں کی اولاد سے ہے جو دراصل سلطان علاؤالدین سلجوقی کا ایک ملازم تھا۔ اور اپنی لیاقت کی وجہ سے اول سپہ سالاری اور پھر اس بادشاہ کی دامادی کے درجہ تک پہنچا۔ اور آخرکار اُس کے بے اولاد مرجانے پر سنہ بارہ سو ننانوے عیسوی مطابق سنہ چھ سو ننانوے ہجری میں رضامندی عام سے اُس کا جانشین ہوا تھا۔ کتاب سنین اسلام میں لکھا ہے کہ یہ بادشاہ ایسا کریم اور سپاہ پرور تھا کہ ایک حبہ اپنے پاس نہ رکھتا تھا۔ اور جو اُس کو ملتا تھا۔ سپاہ پر خرچ کردیتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے مرنے کے بعد سوائے ایک خفتان اور کمربند اور تلوار کے کوئی شے جواہرات۔ سونا چاندی وغیرہ کی قسم سے اُس کے پاس برآمد نہ ہوئی اور اُنہتر برس کی عمر میں ۱۳۲۶ء مطابق ۷۲۶ھ میں مرا تھا۔ س م ح

بہت زیادہ لیاقت رکھتے تھے۔ نہایت سلیم اور صائب تھی۔ اور اگرچہ انعام و اکرام یہ بھی کثرت سے دیا کرتا تھا لیکن موقع اور امتیاز سے، اور صرف اُن لوگوں کو دیتا تھا جن کی رضامندی اور تالیف و ترغیب ضروری سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بھید کو چھپانے پر پوری طرح قادر تھا۔ اور ظاہرداری و چالاکی میں تو کامل اُستاد تھا۔ چنانچہ جب اپنے باپ کے دربار اور دارالسلطنت میں حاضر و موجود ہوتا تو بناوٹ سے عابدانہ وضع قطع اختیار کرلیتا اور دنیاوی جاہ و حشمت سے نفرت ظاہر کرتا۔ حالانکہ اپنی شوکت اور سربلندی کے لئے درپردہ راستہ نکالنے میں بڑی دل جمعی کے ساتھ کوشاں رہتا۔ یہاں تک کہ جن دنوں اُس کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تب بھی اہلِ دربار کو یہی جتلاتا رہا کہ اگر مجھے ترکِ دنیا اور درویشی کی اجازت مل جاتی تو زیادہ خوش ہوتا کیونکہ میری دلی تمنا یہی تھی کہ باقی زندگی ریاضت اور عبادت ہی میں صرف کروں۔ اور افکارِ دنیوی اور امورِ سلطنت کی ذمہ داری میں اُلجھنا مجھے نامرغوب اور ناپسند ہے۔ حالانکہ اُس کی ساری عمر سازشوں اور منصوبوں ہی میں گذری۔ وہ اپنی چال اس عقلمندی سے چلتا تھا کہ دربار میں سوائے اُس کے بھائی داراشکوہ کے ہر ایک نے اُس کے رویہ کو سمجھنے میں دھوکا کھایا۔ شاہجہاں کے حسنِ ظن پر جو اُس کو اپنے اِس چھوٹے بیٹے کی نسبت تھا۔ داراشکوہ کو بہت حسد ہوتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی اپنے ہمدرد مصاحبوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھے اپنے سب بھائیوں میں کسی سے اندیشہ اور خوف ہے تو بس انھیں نمازی اور دیندار حضرت سے ہے۔

شہزادہ مرادبخش مرادبخش جو شاہجہاں کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اپنے بڑے بھائیوں سے دانائی اور ہوشمندی میں کم تھا۔ اور صرف خوش خوری اور شکار ہی کا اُس کو زیادہ شوق تھا۔ مگر تاہم وہ سخی اور خلیق بھی تھا اور اکثر یوں شیخی بگھارا کرتا تھا کہ ہمیں بھید اور رازداریوں سے سروکار نہیں ہے وہ سازشوں اور تخلیوں کو حقیر و خوار سمجھتا تھا۔ اور اس بات کا اعلان و اشتہار اُس کو منظور خاطر تھا کہ میں صرف تلوار اور قوتِ بازو پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ اور فی الواقع مرادبخش شجاعت اور دلیری کا پُتلا تھا۔ اور شجاعت کے ساتھ اگر کسی قدر بیداری اور ہوشیاری بھی اُس میں ہوتی تو غالباً اپنے تینوں بھائیوں پر غالب آتا۔ اور بے خلش ہند کا فرماں روا ہو جاتا۔ [۱]

---

[۱] اورنگ زیب نے اپنی اور اپنے بھائیوں کی خصلت کی نسبت جو کچھ خود لکھا ہے مناسبت مقام کی

شاہجہاں کی بڑی بیٹی

شاہجہاں کی بڑی بیٹی بیگم صاحب بے حد حسین اور خوش اندام اور باپ کی نہایت پیاری تھی۔ ایسے غیر طبعی میلان کی افواہ کی نسبت اشارہ کرنا ایک بہت، ناگوار واقعہ ہے کہتے ہیں کہ وہ عذر بے گناہی و برائت جس پر شاہجہاں کے دل کو اس معاملہ میں اطمینان ہو گیا۔ ملا اور فقہ کے لوگوں کا وہ جھوٹا فتویٰ[1] تھا جو اس تمہید سے دیا گیا تھا کہ بادشاہ کو اس درخت کے میوے سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: وجہ سے بطور خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سلطان محمد معظم کو جو محمد سلطان کی وفات کے بعد اورنگ زیب کے بیٹوں میں سب سے بڑا ہی تھا۔ لکھتا ہے "مہین پور خلافت با وجود سلامت نفس فتح اللہ خاں را چرا ناخوش کردید ما در ایام پادشاہزادگی با امرا ہم جو سلوک می کردیم کہ ہمہ راضی بودند و در حضور و غیبت بہ خوش دلی تعریف و توصیف ما می کردند بل با وصف اقتدار برادر نامہربان (یعنی دارا شکوہ) بعضے ہا ترک رفاقت او کردہ ملازمت ما اختیار کردند چنانچہ کہ با شارہ برادر نامہربان حرکات ناملائم کردہ حرفہائے بے ادبانہ بزبان آوردند بہ تازیانہ اغماض و تحمل متنبہ شدہ از سر انصاف اقرار بہ صاحب حوصلگی ما کردند تا نقش سرداری و بہادری ما بر لوح خاطر اشرف اقدس اعلیحضرت (یعنی شاہجہاں) مرتسم گشت و کارہائے دست بستہ بزور بازوئے ایں مرید ضعیف صورت گرفت"

ایک دوسرے رقعہ میں سلطان محمد اعظم کو لکھتا ہے "فرزند عالی جاہ روزے اعلیحضرت در خلوت بدارا شکوہ ارشاد نمودند کہ در حقِ امرائے بادشاہی کج خلق و بدگمان نباشد و ہم بامضمون عواطف و الطاف دارد و عرض غرض آمیز سخن سازان در حق ایں جماعت نشنود کہ ایں حرف و تقتے بکار نخواہد آمد از بسکہ دل می سوزد حرف ناگفتنی می گو بہم نفاق با مردم کار ضائع کار نیست" (پھر ایک اور رقعہ میں محمد اعظم کو لکھتا ہے "فرزند عالی جاہ ایں نقل زبانی شخصے معتبر بگوش رسیدہ بود در رشتہ تحریر کشیدہ شد کہ بگوش آں فرزند ہم برسد۔ روزے اعلیحضرت علی مردان خاں و سعد اللہ خاں را در خلوتِ خاص حراخنہا بخشیدہ از زبان گوہر فشاں فرمودند کہ بعضے اوقات اندیشہ بخاطر راہ می یابد کہ مہین پور خلافت (یعنی دارا شکوہ) اگرچہ اسباب شان و شوکت و سامان تجمل و صولت ہمہ دارد لیکن عدوئے نیکوان و دوست بدان واقع شدہ شجاع بجز از سپہ چشی وصفے ندارد۔ و مراد بخش مجہول الکیفیت باکل و شرب ساختہ دائم الخمر است مگر فلانی (یعنی ایں عاجز) فانی ذی عزم و مآل اندیش بنظر می آید۔ اغلب کہ متحمل امر خطیر ریاست تواند شد"

(ماخوذ از کتاب کلمات طیبات معروف بہ رقعات عالمگیری) س م ح

[1] یہ افواہ خواہ اصل میں صحیح ہو یا غلط مگر جو لوگ اس ملک کی راہ و رسم سے واقف ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے معاملہ میں کوئی بے حیا سے بے حیا شخص بھی ایسا استفتا نہیں کر سکتا۔ س م ح

متمتع ہونا جس کو اس نے خود لگایا ہے جائز اور درست ہے۔ شاہجہاں کو اپنی اس منظور نظر دختر پر بے حد اعتماد تھا اور وہ اس کی سلامتی کی محافظ اور نگہبان تھی اور یہاں تک احتیاط رکھتی تھی، کہ کسی قسم کا کھانا کیوں نہ ہو جب تک خاص اس کے روبرو تیار نہ ہوتا تھا بادشاہ کے دسترخوان پر نہیں لگایا جاتا تھا۔ پس بیگم صاحب کو امور شاہجہانی میں اس قدر اقتدار و اختیار کا حاصل ہونا اور بادشاہ کے مزاج کی باگ اس کے ہاتھ میں ہونا اور سلطنت کے بڑے اور اہم معاملات میں اس کی قدرت اور اختیارات کا ایسا کامل ہونا کوئی تعجب کا امر نہیں ہے۔

اس شاہزادی نے اپنے کثیر المقدار شاہی جاگیروں اور وظیفوں سے جو اس کے لئے مقرر تھے اور ان بے بہا پیش کشوں اور نذرانوں سے جو چاروں طرف سے بطور نذر اور شکرانہ ان بے شمار معاملات کی درستی کے اس کے پاس آتے تھے جو صرف اسی کی رائے پر انتظام و انصرام پاتے تھے بہت کچھ دولت جمع کی تھی[1]۔ یہاں تک کہ اس کے بھائی داراشکوہ کے معاملات کی کامیابی اور سرسبزی بھی اسی کے وسیلے سے تھی اور بادشاہ کی مہربانی اور نظر عنایت صرف اسی وجہ سے اس کو حاصل تھی کہ بیگم صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے اس کی حمایت کرتی تھی اور خود کو علانیہ اس کا طرفدار ظاہر کرتی تھی ادھر داراشکوہ کے دل پر بھی بیگم صاحب کی رفاقت اور امداد کا نقش بخوبی جم گیا تھا چنانچہ اکثر لوگ یہ خیال کیا کرتے تھے کہ اس کے عوض میں اس نے بیگم صاحب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اپنی تخت نشینی کے وقت میں آپ کو نکاح کر لینے کی اجازت دے دوں گا۔ داراشکوہ کا یہ وعدہ سلاطین ہندوستان کے آئین کے برخلاف تھا جس کی رو سے شاہزادیوں کی شادی بالکل ممنوع[2] ہے۔ اس ممانعت کی وجہ اول تو یہ ہے کہ

---

[1] بیگم صاحب کا بےحد اقتدار و اختیار اور اس کا شاہجہاں کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ عزیز ہونا اس خاندان کی فارسی زبان کی تاریخوں سے بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی نہایت بڑی آمدنی کی جاگیر ہی سے اور ... لاکھ روپیہ سال بھی یہ بات بخوبی ثابت ہے۔ س م ح

[2] بالکل ممنوع ہونا تو صحیح نہیں ہے کیونکہ اسی خاندان کی کئی شاہزادیوں کی شادی کا اس خاندان کے بعض شاہزادوں اور بعض شائستہ زادوں کے ساتھ ہونا اس خاندان کی فارسی زبان کی تاریخوں میں مشرحاً درج ہے۔ مگر ہاں اکثر یہ عادت بھی تھی جو مصنف نے بیان کی ہے۔ س م ح

کوئی شخص بادشاہی خاندان کے رشتہ اور قرابت کے لایق نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری یہ کہ یہ کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں شاہزادی کا شوہر اس تقریب سے اقتدار پاکر تاج و تخت کی جستجو اور حرص نہ کرنے لگ جائے۔

میں اس جگہ دو داستانیں جو اس شاہزادی کی عشق بازی سے متعلق ہیں بیان کرنی چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ کوئی شخص میری نسبت یہ گمان نہ کرے گا کہ میں نے ان مضامین کو افسانہ طرازی اور اعجوبہ نگاری کے شوق میں بیان کرنا چاہا ہے۔ کیونکہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ ایسے واقعات ہیں جو تاریخ میں کارآمد ہیں۔ اور میرا خاص مدعا اور مطلب یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کے رسوم و عادات کے صحیح اور درست حالات بیان کردوں۔

عشق و محبت کے واقعات اگرچہ ہر ملک میں مذموم اور جرم ہیں مگر جس شدت سے ممالکِ ایشیا میں خطرناک ہیں اس قدر فرنگستان میں نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک فرانس میں ایسی حرکتوں کے تذکرے اگرچہ چند روز کے لئے لوگوں کی ہنسی اور خوش طبعی کا ذریعہ رہتے ہیں جس کو تھوڑے عرصہ میں سب بھول جاتے ہیں۔ لیکن مشرقی ملکوں میں ایسی صورتیں بہت کم پائی جاتی ہیں کہ جن میں عشقیہ تعلقات سے بدانجام واقعات اور نہایت ہیبت ناک مصائب اور حرکات سرزد نہ ہوتی ہوں۔

بیگم صاحب کا پہلا معاشقہ

کہتے ہیں کہ بیگم صاحب اگرچہ محل سرا میں حسب معمول محصور رہتی تھی۔ اور محل کی اور مستورات کی طرح اس کی بھی نگہبانی ہوتی تھی۔ مگر کسی مخفی طور سے اس کے پاس ایک نوجوان شخص کی آمد و رفت ہوگئی جو اگرچہ کوئی خاندانی آدمی نہ تھا مگر حسین بہت تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس بات کا سہیلیوں اور محافظوں سے مخفی رہنا ممکن نہ تھا۔ اور جب کہ عورتیں بیگم صاحب کے رشک و حسد سے پہلے ہی جل رہی تھیں تو محل کی اکثر خواصوں پر اس بھید کا کھلنا لازمی تھا۔ الغرض شاہجہاں بھی بیگم صاحب کی خطا ولغزش سے واقف ہوگیا۔ اور حقیقتِ حال معلوم کرنے کے خیال سے ناگہاں محل میں چلا گیا۔ چونکہ بادشاہ کے آنے کی خبر بیگم صاحب کو جلدی نہ مل سکی کہ وہ اس شخص کو کسی مناسب جگہ چھپا دیتی اس نے مجبوراً اُسے اپنے خوف زدہ جوان عاشق کو حمام کی ایک بڑی دیگ میں چھپایا

پڑا۔ اس واردات پر بادشاہ کے چہرہ سے نہ تو کچھ تعجب ہی کے آثار ظاہر ہوتے اور نہ کچھ غصہ اور ناخوشی ہی معلوم ہوئی بلکہ بیٹی سے معمولی باتیں کرتا رہا۔ لیکن کسی قدر بات چیت کے بعد کہا کہ معلوم ہوتا ہے تم نے آج حسب معمول غسل نہیں کیا۔ حمام کرنا چاہیئے اور خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ دیگ کے نیچے آگ جلائیں۔ اور جب تک کہ آنکھوں سے اُسے یہ یقین نہ دلا دیا کہ وہ قسمت کا مارا بد نصیب جل کر خاک ہوگیا ہے وہاں سے نہ ہلا۔

بیگم صاحب کا دوسرا معاشقہ

چند مدت بعد بیگم صاحب نے ایک اور مشغلہ پیدا کیا۔ جس کا نتیجہ اور انجام بھی ایسا ہی دردناک ظہور میں آیا۔ یعنی آپ نے اپنی خانسامانی کے عہدہ کے واسطے ناظر خاں[1] یا نذیر خاں نامی ایک ایرانی نوجوان کو جو مشہور و معروف صاحب جمال اور نہایت قابل و دانشمند اور بے حد شجاع و صاحب حوصلہ امیر تھا۔ اور جس کو تمام اہل دربار عزیز رکھتے تھے پسند فرمایا۔ چونکہ اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں بھی اس کو بہت اچھا اور مستقل شخص سمجھتا تھا اس لئے اُس نے جان پر کھیل کر بادشاہ سے عرض کیا کہ یہ شخص اس قابل ہے کہ بیگم صاحب کا عقد اس سے کیا جائے۔ مگر شائستہ خاں کی اس تجویز کو شاہجہاں نے نہایت ناشائستہ اور ناپسندیدہ سمجھا اور چونکہ وہ پہلے ہی سے کسی قدر کھٹکا ہوا تھا کہ اس کے اور شاہزادی کے درمیان کسی قسم کا ناجائز تعلق ہے اس سے اُس کا یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔ اور یہ سنتے ہی بادشاہ نے اُس بے چارے نوجوان کو اس دنیا سے چلتا کرنے کے لئے کسی بڑی تدبیر یا زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہ سمجھی اور فوراً اظہار مہربانی کے طور پر دربار عام میں اپنے ہاتھ سے ایک پان کا بیڑہ اس صاف باطن جوان کو جس کے دل میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ تھا عنایت کیا۔ چونکہ اس سلطنت میں یہ رسم ایک نہایت اعزاز و امتیاز کی علامت ہے۔ اس لئے وہ اس پان کو لے کر دستور کے موافق چبانے لگا۔ اور کم بخت نے ذرا بھی خیال نہ کیا کہ مجھے اس منحوس بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے زہر دیدیا ہے۔ بلکہ اس خیال باطل میں کہ غالباً اب بادشاہ کی نظر الطاف سے

---

[1] انگریزی رسم الخط میں ناظر خاں اور نذیر خاں ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے مگر غالباً نذیر خاں صحیح ہوگا کیونکہ ناظر خاں محاورے کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ن۔ م۔ ت

میرے لئے روزافزوں ترقیاں ہونے والی ہیں مسرور و محظوظ دربار سے رخصت ہو کر اپنی پالکی میں سوار ہوا۔ مگر زہر کی تیزی اور سرعت اس درجہ تھی کہ وہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی دوسرے گھر پہنچ گیا۔

ہندوستان کے لوگ پان میں ایک چیز کے کچھ باریک اور نازک سے ورق اور تھوڑا سا چونہ جو کوڑیوں سے بنتا ہے اور کچھ اور مصالحہ ملایا کرتے ہیں۔ اور پان کھانے سے منہ معطر اور خوشبودار اور لب سرخ ہو جاتے ہیں۔

روشن آرا بیگم شاہجہاں کی چھوٹی بیٹی روشن آرا بیگم اگرچہ بہن سے حسن و جمال میں کم اور خوش فہمی میں بھی کچھ ایسی مشہور نہ تھی۔ مگر باوجود اس کے وہی زندہ دلی اس کے مزاج میں بھی موجود اور ویسی ہی عیش پسند تھی اور جس قدر بیگم صاحب داراشکوہ کی طرف دار تھی ——— اتنی ہی یہ اورنگ زیب کی مخلص جانب دار اور اُن دونوں کی علانیہ دشمن تھی۔ اور یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس نہ تو اُتنی دولت ہی تھی اور نہ امور سلطنت ہی میں اُس قدر اختیار اور دخل تھا۔ مگر پھر بھی چونکہ محل میں بود و باش کی شریک اور فن فریب میں کامل تھی جاسوسوں کی معرفت کام کی باتیں اور ضروری خبریں اورنگ زیب کے پاس پہنچاتی رہتی تھی۔

شہزادوں کا دور دراز صوبوں پر تقرر لڑائی سے چند سال پہلے شاہجہاں کا دل اپنے مفسد مزاج بیٹوں کی طرف سے خوف اور اضطراب میں تھا۔ اور اگرچہ وہ چاروں عاقل و بالغ اور صاحب اہل و عیال تھے۔ لیکن برادرانہ سلوک اور ایسے مضبوط رشتہ کی رعایت کو بالائے طاق رکھکر سلطنت کی ہوس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے تھے یہاں تک کہ دربار میں اُن کے طرف داروں کے بھی جدا جدا دھڑے بندھ گئے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر بادشاہ جو اپنی سلامتی ہی کے لئے لرزتا کانپتا رہتا تھا جب ان کی ایسی ناگوار حرکتیں مشاہدہ کرتا (جن کے خمیازے آخر کار اُس کو خود اٹھانے پڑے) تو خود کو ایک عجیب طرح کے عذاب میں گرفتار سمجھکر نہایت آرزو کے ساتھ یہ چاہتا تھا کہ اِن کو گوالیار کے قلعہ میں جو بڑا مضبوط اور مستحکم اور ایک بلند اور کڈھب چٹان دار پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ اور جس کا فتح کرنا مشکل ہے۔ اور جس میں بادشاہی خاندان کے سلاطین وغیرہ اکثر مقید اور نظر بند رہا کرتے ہیں قید کر دے

لیکن اُس نے سوچ سمجھ کر آخر کار اپنے دل میں اس بات کو مان لیا تھا کہ حقیقت میں یہ اب ایسے زبردست ہو گئے ہیں کہ اُن سے اس قسم کا سلوک کرنا ایک سرسری امر نہیں رہا اُس کو ان کی طرف سے رات دن یہی تردد اور تفکر لاحق رہتا تھا۔ کہ اگر یہ باہم بھڑ گئے تو اپنے لئے علیحدہ علیحدہ مستقل سلطنتیں قائم کرلیں گے یا پایۂ تخت کو میدانِ جنگ بنا کر خلق خدا کی خوں ریزی اور قتل و غارت کے بعد اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ اُس نے اِن پیش آنے والی آفتوں اور قضیوں سے بچنے کے لئے یہ تجویز نکالی کہ چاروں کو چار دور دراز صوبوں کی حکومتیں دے کر الگ الگ کر دیا جائے پس سلطان شجاع کو بنگالہ۔ اورنگ زیب کو دکن۔ مراد بخش کو گجرات۔ اور داراشکوہ کو ملتان اور کابل کا حاکم مقرر کیا[1]۔

داراشکوہ کے سوا یہ سب شاہزادے بلا توقف اپنے اپنے صوبوں کو چلے گئے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی اپنی مفسد طبیعتوں کے بخار نکالنے لگے۔ اور خودسر بادشاہوں کی سی حکمرانیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ ملک کی آمدنی اپنے ذاتی امور میں صرف کرنے لگے۔ اور ہر ایک نے بڑی بڑی مہیب فوجیں اس بہانہ سے بھرتی کرلیں کہ پایۂ تخت کی کمک اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور حدود ممالک غیر پر رعب وداب کے لئے اُس کی ضرورت ہے۔

داراشکوہ دارالسلطنت میں

لیکن داراشکوہ نے جو سب سے بڑا اور اسی وجہ سے تخت نشینی کا[2] متوقع تھا پایۂ تخت کو نہ چھوڑا اور

---

[1] میر عسکری المخاطب بہ عاقل خاں جو اورنگ زیب کے مشہور امیروں میں سے تھا لکھتا ہے کہ ۱۰۶۲ھ میں جب کہ شاہجہاں کابل میں مقیم تھا اُس نے دور اندیشی کی راہ سے ان شاہزادوں کو اُن کے نامزد کئے ہوئے صوبوں کو رخصت کیا اور کابل سے چل کر جب شجاع اور اورنگ زیب آگرہ میں پہنچے تو داراشکوہ کے ضرر سے بچنے کے لئے آپس میں بڑے بڑے مستحکم عہد و پیمان کئے اور کہا کہ اگر ہم باہم ملے رہیں تو داراشکوہ کے شر سے جو ہمارے خون کا پیاسا ہے بچے رہیں گے اور اس معاہدے کے مزید استحکام کے لئے شجاع نے اپنی بیٹی اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان سے منسوب کی اور اورنگ زیب نے اپنی لڑکی کا رشتہ شجاع کے بیٹے سلطان زین العابدین سے کیا۔ س م ح

[2] فارسی زبان کی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہاں نے داراشکوہ کو حقیقتاً اپنا ولیعہد مقرر کر کے شاہ بلند اقبال کا خطاب دیا تھا۔ اور صاحب سیر المتاخرین نے بضمن وقایع ۱۰۶۷ھ لکھا ہے کہ آخر میں اس کے سالانہ مواجب دو کروڑ ساڑھے سات لاکھ روپیہ مقرر ہو گیا تھا۔ یعنی تینتیس کروڑ دام۔ س م ح

شاہجہاں نے بھی اُس کو احکام شاہی کے اجرا کے اختیارات سپرد کر دیئے تھے اور یہ بھی اجازت دیدی تھی کہ ایک چھوٹے تخت پر جو بادشاہی تخت سے نیچا ہو خود بادشاہ کے سامنے دربار میں جلوس کیا کرے۔

ایک ہی وقت میں دو مساوی الاختیار فرماں روا دربار میں جلوہ گر نظر آنے لگے۔ ان باتوں سے اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود بادشاہ ہی داراشکوہ کی امیدوں کی تائید کرتا تھا۔ لیکن اس بات کے باور کر لینے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اگرچہ داراشکوہ باپ کے ساتھ ادب و محبت کے طریقوں سے پیش آتا تھا۔ مگر شاہجہاں ریاکاری اور دورنگی برتتا تھا۔ اور اس کہن سال بادشاہ کو برابر یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں مجھ کو زہر نہ دیدیا جائے۔ اور ظن غالب ہے کہ بادشاہ کی پوشیدہ خط و کتابت اورنگ زیب سے جاری رہتی تھی جس کی نسبت اُس کو ہمیشہ یہ اعتماد تھا کہ سلطنت اور ملک داری کے لئے یہ لڑکا بہت لایق و فایق ہے۔

اس کتاب کے اُن مطالب کی توضیح و تشریح کے لئے جن کا ذکر آئندہ آنے والا ہے بطور تمہید شاہجہاں اور اُس کے بیٹوں کی باہمی حالت اور اسی طرح اُس کی دونوں بیٹیوں کا بھی کچھ کچھ حال درج کر دینا ضروری تھا۔ کیونکہ یہ بھی ان دردناک واقعات میں بڑی حصہ دار تھیں۔ واضح رہے کہ ہندوستان اور قسطنطنیہ اور اور ایشیائی ملکوں میں بڑی بڑی سنگین اور اہم وارداتیں اکثر عورتوں کے اختیار و اقتدار کے باعث سرزد ہوتی رہی ہیں۔ اور اکثر لوگ اُن کے وقوع کے اصل اسباب سے ناواقف ہوتے ہیں اور اُن کا باعث بعض اور باتوں کو سمجھ لیا کرتے ہیں۔

میر جملہ اب شاہجہاں کے بیٹوں کے جنگ و جدال کے واقعات لکھنے سے پہلے اگر اسی طرح کچھ حالات اورنگ اور شاہ گولکنڈہ اور اُس کے وزیر میر جملہ کے بھی مجمل طور پر لکھ دیئے جائیں تو امید ہے کہ ناظرین کو مطالب کتاب کے سمجھنے میں زیادہ آسانی اور غالباً اُس شخص کی چالاکیوں اور فیلسوفیوں کی نسبت جو اس تمام تاریخی کارنامہ کا رستم اور ہندوستان کا آئندہ بادشاہ ہے ایک بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

میر جملہ نے جن تدبیروں اور حکمتوں سے شاہجہاں کے فرزند ثالث کے اقتدار اور سلطنت کی بنیاد قائم کی اُس کی تفصیل یہ ہے۔

جس وقت اورنگ زیب کو دکن کی صوبہ داری سپرد کی گئی تھی میر جملہ[1] شاہ گولکنڈہ کا وزیر اور اس کی تمام فوج کا سپہ سالار اور تمام ہندوستان میں ایک مشہور و معروف شخص تھا اور اگرچہ خاندانی اور پشتینی امیر نہ تھا۔ لیکن نہایت ہی قابل اور لائق انسان تھا اور جیسا کہ سپاہ گری میں کامل تھا ویسا ہی معاملات تجارت کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی دولت جو بہت زیادہ تھی صرف گولکنڈا کی متمول سلطنت کی وزارت کے وسیلہ سے نہیں بلکہ اپنی وسیع تجارت کے ذریعہ سے جو اکثر ملکوں میں جاری تھی اور ہیروں کی کانوں کے ٹھیکوں سے۔ جو اور شخصوں کے ناموں سے لے رکھے تھے حاصل کی تھی۔ ان کانوں کی کھُدائی اَنْ تھک محنت اور سرگرمی سے جاری رہتی تھی اور ہیروں کی برآمد اس کثرت سے تھی کہ اُس کے ہاں یہ قاعدہ اور معمول تھا ان کا شمار نہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ ہیروں سے بھری ہوئی ٹاٹ کی تھیلیوں کو گنوالیا جاتا تھا۔[2]

---

[1] اصل کتاب کے حاشیہ اور بعض فارسی زبان کی تاریخوں میں اس نامور شخص کا حال یوں لکھا ہے کہ یہ قوم کا سید اور ایران کا باشندہ تھا اور اردستان میں جو لواح اصفہان میں ہے پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین اگرچہ خاندانی تھے مگر بہت ہی غریب تھے بہرحال اُس نے کسی طرح کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور ایک جوہری کے پاس جو تجارت کے لئے اکثر گول کنڈا کو آیا کرتا تھا گماشتہ بن گیا۔ بعض کا تو یہ قول ہے کہ نوکری چھوڑ کر گولکنڈا کی سلطنت میں بطور خود تجارت کرنے لگ گیا تھا۔ اور بعض یوں کہتے ہیں کہ وہ سوداگر اپنی وفات کے وقت اپنا سب مال و دولت اسی کو دے گیا تھا۔ خواہ کوئی صورت ہو یہ نوجوان بہرحال اسی تجارت کے ذریعہ نہایت مالدار ہوگیا اور کچھ روپیہ خرچ کرکے سلاطین قطب شاہی کے دربار میں جو ملک تلنگانہ اور گولکنڈہ کے بڑے حصہ کے بادشاہ تھے ایک عہدہ حاصل کر لیا۔ اور اس عہدہ کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیئے کہ بادشاہ نے نہایت خوش ہو کر بہ ترقی منصب تلنگانہ پر مامور فوج کا اُس کو اعلیٰ افسر مقرر کر دیا اور آخر کار سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈا کا وزیر مقرر ہوا اور میر جملہ یعنی سردار کل کا خطاب پایا۔ س۔م۔ح

[2] مترجم انگریزی نے اس موقعہ پر بطور حاشیہ یہ لکھا ہے کہ "ہیرے زیادہ تر سلطنت گولکنڈا بیجاپور بنگالہ اور جزیرہ بورنیو میں دستیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک کان ترراول کنڈا میں ہے جو گول کنڈا سے پانچ منزل پر ہے۔ دوسری گاتی میں جسے گولور بھی کہتے ہیں گول کنڈا سے مشرق کی طرف سات منزل پر ہے۔ بنگالہ میں قصبہ سلیم پور کے نزدیک جو گوبل نامی ایک ندی ہے اُس کے ریت میں سے بھی ہیرے نکلتے ہیں اور اس نے سلیم پور کی جگہ اس کان کو گویل والی کہنا زیادہ مناسب ہے اور جزیرہ بورنیو میں سکاون ندی میں سے ہیرے

اور اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ وہ صرف اپنے بادشاہ کی فوج ہی کا سپہ سالار نہ تھا بلکہ خاص اپنے خرچ سے اپنی جرار فوج معہ ایک توپ خانہ کے جس میں اکثر عیسائی لوگ ملازم تھے ہمیشہ تیار رکھتا تھا تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اُس کا رعب وداب اور اختیار واقتدار کس قدر بڑھا ہوا ہوگا۔ اور یہاں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ اس نے ملک کرناٹک کی فتح کا بہانہ بنا کر وہاں کے ہندوؤں کے تمام مندروں اور قدیمی عبادت خانوں کو لوٹ لیا تھا۔ اور اس طرح اپنی دولت وحشمت بے قیاس حد کو پہنچا لی تھی۔

بادشاہ گولکنڈا سے میر جملہ کی مخالفت میر جملہ کی اس طاقت وشوکت کو دیکھکر شاہ گول کنڈا کے دل میں رشک وحسد کا پیدا ہونا ایک طبعی امر تھا۔ چنانچہ اُس نے بڑی سرگرمی سے لیکن نہایت خفیہ اور پوشیدہ طور پر اُس کے قتل کرانے یا اپنے ہاں سے نکال دینے کی تدبیریں سوچنی شروع کیں۔ کیونکہ بجائے ایک مطیع نوکر کے وہ اب اس کو ایک خطرناک رقیب سمجھنے لگا تھا۔ اور وزیر کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱۔ نکلتے ہیں اور اب سے ایک سو برس پہلے تک بجز ہندوستان یا اُس کے جزیروں کے اور کسی جگہ ہیرے کی کان معلوم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک کان ۱۷۲۸ء میں ملک برازیل میں جو جنوبی امریکہ میں ہے دریافت ہوئی ہے۔ اب اس زمانہ میں بندیل کھنڈ کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سوا ہندوستان میں ہیرے کسی جگہ برآمد نہیں ہوتے۔ اور وہاں بھی بہت کم اور بہت چھوٹے چھوٹے نکلتے ہیں اور غیر ملکوں کا یہ حال ہے کہ افریقہ کے ایک حصہ یعنی کیپ آف گڈ ہوپ میں بھی چند سال سے ہیرے نکلنے لگے ہیں اور بڑے بڑے اور بہت کثرت سے نکلتے ہیں۔ مگر رنگت اکثر زردی مائل ہوتی ہے۔ اور ہندوستان کی پرانی کانوں کے سفید ہیروں کے برابر خوشنما اور بیش قیمت نہیں سمجھے جاتے اور تراشنے میں بھی ویسے سخت نہیں ہیں۔ اور اگرچہ فن طب کی خواص ادویات کی عربی اور فارسی زبان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جزیرہ قبرص (سائپرس) اور مقدونیہ میں بھی ہیرا نکلتا تھا۔ مگر مسٹر ایڈون سٹریٹر کی بیش بہا کتاب سے جو خاص جواہرات کے باب میں بہت عمدہ اور حکیمانہ تحقیق سے لکھی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہیرا ہندوستان اور اس کے قریب کے جزائر سماٹرا اور بورنیو اور ملک برازیل واقع جنوبی افریقہ اور جزیرہ اسٹریلیا کے کوہستان یورال ہی میں نکلتا ہے۔ اور بقول ان کے صرف سفید اور زرد ہی نہیں ہوتا بلکہ سبز اور نیلا اور سرخی مائل اور داغدار اور لوہے کے رنگ کا بھورا اور شفاف اور غیر شفاف دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ س م ح

ق ب رس۔ اے ڈون س ٹ ر ے ٹ ر س م اٹ را۔ ی و رال

خیر خواہ اور جاں نثار لوگوں کی وجہ سے جو اُس کے گرد و پیش موجود رہتے تھے اپنے اس ارادہ کو احتیاطاً بہت مخفی رکھتا تھا۔ لیکن ایک موقعہ پر جب کہ پہلی دفعہ اُس کو یہ خبر ملی کہ میر جملہ اور اُس کی والدہ کے درمیان جو صاحب حسن و جمال تھی ایک نامناسب تعلق[۱] ہے وہ عداوت جو اُس کے دل میں پہلے سے تھی پوشیدہ نہ رہ سکی اور بے اختیار بول اُٹھا کہ اس زبردست مجرم سے اس حرکت کا انتقام لینا ضروری ہے۔ میر جملہ اگرچہ اس وقت کرناٹک میں تھا لیکن اس سبب سے کہ دربار کے سب بڑے بڑے عہدہ دار اس کے رشتہ دار تھے۔ اس خطرناک واقعہ کی اس کو بہت جلد خبر پہنچ گئی اس لئے اس چالاک اور حیلہ ساز وزیر نے پہلے تو یہ کام کیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے محمد امیر خاں[۲] کو جو بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھا اس مضمون کا خط لکھا کہ جس حیلہ اور بہانہ سے ممکن ہو اس مہم میں اپنے شریک ہونے کی ضرورت شدید ظاہر کر کے فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اور جب بادشاہ کی سخت نگرانی کی وجہ سے اُس کے وہاں سے بچ کر نکل آنے سے مایوس ہو گیا تو فوراً ہی اُس کے بے باک ذہن نے وہ تدبیر اختیار کی جس نے شاہ گول کنڈا کو بربادی اور تباہی کے کنارے پہنچا دیا۔ عقلمندوں نے سچ کہا ہے کہ "جو بادشاہ اپنے بھید اور مشورے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا وہ اپنی سلطنت کو نہیں بچا سکتا"

میر جملہ اور اورنگ زیب کا گٹھ جوڑ

میر جملہ نے اورنگ زیب کو جو دولت[۳] آباد میں تھا۔ اس مضمون کا عریضہ لکھا۔ کہ "میں نے بادشاہ

۱؎ یہ بات ہندوستان کی کسی فارسی زبان کی تاریخ میں راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ س۔م۔ح

۲؎ صحیح نام محمد امین خان ہے اس لئے آئندہ اس ترجمہ میں اس کو اسی نام سے لکھا جائے گا۔ س م ح

۳؎ اس کا قدیم نام دیوگڈھ تھا جس کو غلطی سے اکثر مسلمان مصنفوں نے دیوگیر لکھا ہے۔ چنانچہ بدر چاچ جو محمد شاہ تغلق کے دربار کا ایک مشہور شاعر تھا اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے شعر: "تو دیوگیر مخوانش کہ دولت آباد ست کہ چار طاق دراو ہست ہشت باب جناں" اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ راجہ بھوج کے زمانہ میں اس کا نام دھارا نگری تھا۔ بہرحال محمد شاہ تغلق نے جو ۷۲۹ھ میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تھا، جب اس کو ہندوؤں سے فتح کیا تو دولت آباد نام رکھدیا جس کے قریب گوداوری کے کنارے اورنگ زیب نے اپنی حکومت دکن کے زمانہ میں اورنگ آباد بسایا جو خجستہ بنیاد اورنگ آباد کے نام سے سرکاری کاغذات میں لکھا جاتا تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں اگرچہ دولت آباد کی نمود باقی ہے مگر حاکم جانشین کا مقام اورنگ آباد ہی ہے۔ جہاں ریاست حیدرآباد کی طرف سے ایک حاکم صدر تعلقدار کے لقب سے رہتا ہے۔ س۔م۔ح

گول کنڈہ کی جو جو خدمات انجام دی ہیں ان کو سارا زمانہ جانتا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ میرا ممنون ہوتا میری اور میرے خاندان کی بربادی اور بیخ کنی کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اس لئے میں آپ کی پناہ لینا اور آپ کے حضور میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اور اس درخواست کی قبولیت کے شکرانہ میں کہ جس کی پذیرائی کی آپ کی جانب سے کامل اُمید ہے ایک منصوبہ پیش کرتا ہوں کہ جس کے ذریعہ سے آپ بآسانی اس بادشاہ کو گرفتار کر کے اُس کے ملک پر قبضہ کر سکیں گے۔ آپ میرے اس وعدہ کی سچائی پر اعتبار اور بھروسہ فرمائیں۔ اور یہ مہم انشاء اللہ نہ تو کچھ مشکل ہی ہوگی اور نہ کچھ خطرناک ہی۔ آپ پانچ چار ہزار چیدہ سواروں کے ساتھ بہت جلد اور بلا توقف کوچ کرتے ہوتے گول کنڈا کی طرف چلے آئیں جس میں صرف سولہ دن لگیں گے۔ اور یہ مشہور کر دیں کہ شاہجہاں کا سفیر شاہ گول کنڈا سے بعض ضروری معاملات میں گفتگو کرنے کے لئے بھاگ نگر[1] جاتا ہے اور یہ فوج اُس کی اردلی میں ہے۔ اور چونکہ "دبیر" جس کے توسط سے ہمیشہ ایسے اُمور کی اطلاع بادشاہ کو ہوا کرتی ہے۔ میرا قریبی رشتہ دار ہے اور اُس پر مجھے کامل بھروسہ ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ایسا حکم جاری ہو جائے گا کہ جس کی وجہ سے کوئی شک و شبہ پیدا ہوئے بغیر آپ بھاگ نگر کے دروازہ پر پہنچ جائیں گے اور گول کنڈا والے آپ کو سفیر کے سوا کوئی اور شخص نہ سمجھیں گے۔ پس جب بادشاہ معمول کے مطابق شاہی فرمان کے استقبال کے لئے سفیر کے پاس آئے۔ تو آپ اُس کو بآسانی پکڑ کر جو کچھ مناسب جانیں اُس کی نسبت تجویز کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مہم کا کل خرچہ میں آپ کو دوں گا اور

---

[1] صاحب تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جس کے ہاں ایک ہزار کسبیاں ناچنے گانے کے لئے نوکر تھیں نو سو پچاس ہجری سے کچھ پہلے اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام پر جو انھیں میں سے ایک پاتر یعنی ہندو کسبی تھی۔ بھاگ نگر آباد کیا تھا۔ لیکن پھر کچھ پشیمان ہو کر یہ نام بدل دیا اور حیدر آباد نام رکھدیا" مگر اب ہمارے اس زمانہ میں وہ پہلا نام بالکل محو ہو گیا ہے۔ اور صرف حیدر آباد ہی مشہور ہے اور گول کنڈا کا قلعہ بھی اب تک قائم ہے اور دونوں ریاست حیدر آباد دکن کے قبضہ میں ہیں جو اس وقت ہندوستانی ریاستوں میں سب سے بڑی اور سلطنت مغلیہ کے طرز نظم ونسق اور طور و طریق کا گویا ایک نمونہ ہے اور جس کا رقبہ بموجب بیان مسٹر طالبھائے ڈیلیو صاحب مولفہ تاریخ جلسہ قیصری واقع دہلی تقریباً اٹھانوے ہزار میل مربع اور آبادی تقریباً ۱۰۰ لاکھ اور آمدنی تین کروڑ اکتیس لاکھ ہے اور جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد سے نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر صوبہ دار دکن کی اولاد کے قبضہ میں چلی آتی ہے۔
س م ح

اس کے اختتام تک پچاس ہزار روپیہ روز دیتا رہوں گا۔"

اورنگ زیب کی گولکنڈہ روانگی

اورنگ زیب جو ہمیشہ ایسے ہی منصوبوں میں لگا رہتا تھا میر جملہ کی استدعا کے موافق فوراً تیاری کر کے گول کنڈا کی طرف چل کھڑا ہوا اور ایسی ہوشیاری سے اس تدبیر کو بجالایا کہ بھاگ نگر پہنچ گیا اور کسی نے نہ جانا کہ یہ زبردست فوج سفیر کی ہم رکابی کے سوا کسی اور مقصد سے آئی ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ اُس دستور کے موافق جو ایسے سفیروں کی آمد سے متعلق مقرر تھا اس مصنوعی ایلچی کی ملاقات کے واسطے اپنے باغ سے سوار ہو کر روانہ ہوا۔ مگر وہ جب بغیر کسی وسوسے کے اپنے دغاباز دشمن کی طرف جا رہا تھا اور قریب تھا کہ اس تدبیر کے بموجب جو پہلے سے گانٹھی ہوئی تھی اُس کو دس بارہ غلام گرفتار کرلیں اور اورنگ زیب کا منصوبہ چل جائے اُس کی خوش قسمتی سے ایک امیر نے جو اس راز سے واقف اور اس میں شریک تھا ناگہاں پشیمانی اور ترحم کی وجہ سے چلّا کر کہہ دیا کہ "جہاں پناہ جھٹ ہٹ نکل جائیے ورنہ آپ پھنس جائیں گے یہ اورنگ زیب ہے ایلچی نہیں"۔ اس موقعہ پر بادشاہ کو جو حیرانی اور پریشانی لاحق ہوئی اُس کا کیا کہنا۔ پس وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بگٹٹ قلعہ گولکنڈا کی طرف جو اُس کی معمولی قیام گاہ بھاگ نگر سے صرف ایک فرسنگ کے قریب تھا بھاگا اور اُس میں جا داخل ہوا[1]۔

---

[1] عاقل خاں نے اس واقعہ کو یوں لکھا ہے کہ جب میر جملہ نے اپنے آقا کو ناراض دیکھا تو اورنگ زیب سے مدد چاہی۔ اُس نے شاہجہاں کو اطلاع دی وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ جس طرح ہو سکے اس کو عبداللہ قطب شاہ کے ہاتھ سے بچا کر ہمارے پاس بھیج دو۔ اس حکم کے آنے پر اورنگ زیب نے اس مضمون کا ایک نشان (اُس وقت کی اصطلاح میں بادشاہوں کی تحریر کو "فرمان" اور شاہزادوں کی تحریر کو "نشان" کہتے تھے) قطب شاہ کے نام لکھا کہ محمد سلطان اپنے چچا شجاع کے پاس اڑیسہ کی راہ سے بنگالہ کو جانا چاہتا ہے (کیونکہ بقول الفنسٹن صاحب راستہ کی صورت یہ تھی کہ اورنگ آباد سے بنگالہ کو مچھلی پٹن کے پاس اس طرح چکر کھا کر جاتا تھا کہ گونڈوانہ کے جنگل بیچ میں نہ پڑیں حاصل یہ کہ اورنگ زیب کی راہ گولی کنڈا کے دارالسلطنت بھاگ نگر سے تھوڑے فاصلہ پر رہ جاتی تھی) آپ خاطرداری سے اپنے ملک سے گذر کرا دیں اب اُدھر وہ بیچارہ تو اس پیغام کو واقعی سمجھ کر مہمان داری اور خاطر تواضع کی تیاری میں مصروف ہوا اور ادھر محمد سلطان لڑائی کے سازوسامان سے خوب درست ہو کر کوچ بہ کوچ روانہ ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے خود حضرت بھی چل کھڑے ہوئے اور قطب الملک کو اس

گولکنڈے کا محاصرہ

اورنگ زیب اگرچہ اپنے شکار سے ناامید ہو گیا۔ لیکن اُس نے خیال کیا کہ اب ڈرنے کا موقعہ نہیں ہے بلا خوف و خطر اس کی گرفتاری کے واسطے کوشش اور تدبیر جاری رکھنی چاہیئے۔ پس سب سے پہلے یہ کام کیا کہ بھاگ نگر کے تمام شاہی محلوں کو لوٹ لیا۔ اور کل قیمتی اور بیش بہا اجناس و اسباب پر قبضہ کر لیا[۱]۔ لیکن محل کی عورتوں کو مشرقی بادشاہوں کے دستور کے مطابق

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۔ فریب کی اُس وقت خبر ہوئی کہ جب محمد سلطان بھاگ نگر کے بہت قریب جا پہنچا اور وہ نہایت سراسیمگی اور اضطراب کی حالت میں بقدر گنجایشِ وقت جو کچھ جواہرات اور عمدہ چیزیں ساتھ لے سکا لے کر گرتا پڑتا قلعہ حیدر آباد یعنی گولکنڈا میں جا داخل ہوا۔ اور یہ مصیبت ایسی ناگہانی تھی کہ مارے گھبراہٹ کے اُس کی بیگمیں بیچاری پا پیادہ بلکہ ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگ کر قلعہ میں پہنچیں۔ اور محمد سلطان نے آکر بھاگ نگر پر قبضہ کر لیا اور بعض مورخوں نے صرف اتنا ہی لکھدیا ہے کہ پہلے قاضی عارف کشمیری کو اورنگ زیب نے قطب شاہ کے پاس میر جملہ کے باعزت و آبرو رخصت کر دینے کے لئے معہ فرمان شاہی بھیجا تھا ابھی وہ پہنچنے نہیں پایا تھا کہ قطب شاہ نے میر جملہ کے بیٹے محمد امین خاں کو قید کر کے اس کا مال و اسباب ضبط کر لیا۔ اور اس سبب سے شاہجہاں کی طرف سے اُس کے نام ایک اور خفگی آمیز فرمان جاری ہوا اور اورنگ زیب کے نام حکم صادر ہوا کہ اگر قطب شاہ ارشاد شاہی کی تعمیل میں توقف کرے تو اس کو سزا دو۔ اس حکم کے آنے پر اورنگ زیب آگے آگے محمد سلطان کو روانہ کر کے پیچھے سے خود بھی چل پڑا اور چونکہ قطب شاہ کے لوگوں کی طرف سے محمد سلطان کے بھاگ نگر پہنچ جانے کے بعد کچھ "حرکات شوخی" ظہور میں آئی تھیں اس سبب سے محمد سلطان اور اورنگ زیب نے بھاگ نگر کو تاخت و تاراج کر کے گولکنڈا کو گھیر لیا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مورخوں نے اورنگ زیب کی ان دھوکے بازی کی چالوں کا ذکر جن کا حال برنی[؟] اور عاقل خاں نے لکھا ہے دانستہ چھوڑ دیا ہے۔ س م ح ۱۲

[۱] عاقل خاں اس لوٹ کی نسبت یہ لکھتا ہے "کہ شاہزادہ فیروز مند (محمد سلطان) در کمال عظمت و استقلال بہ بھاگ نگر در آمدہ رایت اقتدار برافراشت و اکثر کارخانجات و بیوتات قطب الملک عرض نہب و غارت ساخت و کتب نفیسہ و چینی آلات و دیگر اشیا و اجناس افزوں از اندازہ شمار و قیاس بہ سرکار سلطنت رسید و از عقب بندگان حضرت جہاں پناہی (اورنگ زیب) بدولت و اقبال تشریف آوردہ طنطنہ عظمت و جلال آنحضرت در زمین و زماں پیچیدہ بسیارے از اسباب و آلات غریبہ کہ از تحفِ روزگار بود از اموال قطب الملک بسرکار عالم مدار ضبط شد۔ کثرت و افزونی ذخائر و اشیا و اسباب و مواد مکنت و ثروت آں دولتمند (قطب الملک) بمرتبہ بود کہ بعد از کوچ فرمودن ہچنان خانہا و مخزنہا مالامال گذاشتند و اصلا محسوس نمی شد کہ دست کسے بایں خزائن و ذخائر رسیدہ باشد و نقصے دراں راہ یافتہ و حالانکہ ازیں جہت در سرکار سلطنت سامانِ ثروت و سرانجام مکنت پدید آمد" س م ح

بڑی حفاظت سے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ توپوں کے نہ ہونے کے سبب سے ناچار تھا۔ مگر تاہم یہی ٹھان لیا کہ قلعہ کا محاصرہ کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں بادشاہ کو رسد وغیرہ کے نہ پہنچنے کے سبب سے دیر تک بچاؤ کرنا مشکل ہوگا، لیکن محاصرہ سے دو مہینے بعد شاہجہاں کی طرف سے اس مضمون کا قطعی حکم پہنچا کہ مہم سے ہاتھ اٹھا کر بلا توقف دکن کو لوٹ جاؤ اُس کو بخوبی علم تھا کہ یہ حکم دارا شکوہ اور بیگم صاحب کی تحریک و ترغیب سے صادر ہوا ہے (کیونکہ دوراندیشی اور عاقبت بینی سے اُن کو یہ خیال ہوگیا تھا کہ اگر اورنگ زیب کو بادشاہ گولکنڈا کی نسبت اپنے منصوبوں کے عمل میں لانے کی اجازت مل جائے گی تو وہ بہت زبردست ہو جائے گا) اور اس وجہ سے دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھایا۔ لیکن نہایت درجہ اطاعت دکھانے کی غرض سے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا مگر محاصرہ اٹھا لینے سے پہلے فوج کشی کے اخراجات کا ایک بڑا معاوضہ اور حرجانہ شاہ گولکنڈا سے وصول کیا اور یہ عہد و پیمان لیا کہ میر جملہ کو اپنے خاندان اور مال و اسباب اور فوج سمیت صحیح سلامت چلے جانے کی اجازت دی جائے اور گولکنڈا کے روپیہ پر شاہجہاں کا سکہ لگا کرے اس کے علاوہ محمد سلطان[1] کی شادی بادشاہ کی بڑی بیٹی سے کرلی۔ اور جبراً یہ وعدہ بھی لیا کہ شاہزادہ موصوف اب سے سلطنت گولکنڈا کا ولی عہد[2] سمجھا جائے گا اور جہیز میں رام گڈھ کا قلعہ بھی معہ اُس کے تمام توابع اور متعلقات کے لے لیا۔

قلعہ بیدر کی فتح

اورنگ زیب نے دکن کو واپس جاتے ہوتے میر جملہ کے اتفاق سے جو اُس کی پناہ میں آچکا تھا اول[3] بیدر کے قلعہ کو۔ جو بیجاپور کے ملک میں ایک مستحکم جگہ ہے گھیر کر فتح کرلیا۔ اور پھر دونوں دولت آباد پہنچ کر اتحاد اور محبت کے ساتھ رہنے اور آیندہ شوکت و عظمت کے لئے بڑے بڑے منصوبے باندھنے لگے۔ چنانچہ اِن کے اِس اتفاق کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم اور قابل یادگار واقعہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اورنگ زیب کو شہرت عظمت اور سلطنت جو کچھ حاصل ہوا وہ سب اسی اتفاق کی بدولت تھا۔

---

[1] اصل کتاب میں غلطی سے جا بجا اس کو سلطان محمود لکھا ہے اور صحیح نام محمد سلطان ہے۔ س م ح

[2] عاقل خاں اور خافی خاں نے اس شرط اور سکہ جاری کرنے کی شرط کا ذکر نہیں لکھا۔ س م ح

[3] فارسی کتابوں میں اکثر اس قلعہ کا نام بے در (ب ے در) لکھا ہے۔ س م ح۔

دولت آباد پہنچتے ہی میر جملہ نے اپنی حسنِ تدبیر سے ایسے منصوبے تیار کئے کہ شاہجہاں کی طرف سے حاضرِ دربار ہونے کے لئے متواتر پیغام پہنچے اور آخرکار وہ پایۂ تخت آگرہ میں جا پہنچا۔ اور بادشاہ کے لئے نہایت عجیب و غریب پیش کش اپنے ساتھ لایا۔ کیونکہ اُس کو اُمید تھی کہ اس ذریعہ سے شاہجہاں کو گولکنڈا اور بیجاپور اور پرتگیزوں سے لڑائی شروع کر دینے کی ترغیب دے سکوں گا۔ چنانچہ جب دربار میں حاضر ہوا تو وہ الماس نذر کیا جو مقدار اور خوبصورتی میں عموماً بے نظیر سمجھا جاتا ہے اور گولکنڈا کی فتح کے بہت سے فوائد بیان کئے اور عرض کیا کہ گولکنڈا کے جواہرات قندھار کے پتھروں اور چٹانوں کی بہ نسبت جہاں حضور آج کل مہم روانہ کرنا چاہتے ہیں، یقیناً زیادہ لحاظ اور شاہانہ توجہ کے قابل ہیں۔ اور یہ بھی گذارش کی کہ حضور کو گولکنڈا کی سمت میں اپنی جنگی تدبیریں اُس وقت تک کہ تمام ملک راس کماری تک فتح نہ ہو جائے برابر جاری رکھنی چاہئیں[۱]۔

کچھ بعید نہیں کہ ہیروں کے لالچ نے شاہجہاں کے دل پر یہ تاثیر کی ہو کہ اُس نے میر جملہ کی تجویزوں کو قبول کر لیا۔ لیکن اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اصل میں شاہجہاں نے اس مہم میں نئی فوج کی بھرتی کو دارا شکوہ کی روز افزوں بے ادبیوں کی روک تھام کے لئے ایک معقول بہانہ سمجھا اور میر جملہ کی صلاح مان لی تھی۔ بہرحال شاہجہاں کا کچھ ہی مطلب و مدعا ہو مگر اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دکن کی طرف ایک فوج میر جملہ کی سپہ سالاری میں بھیجی جائے۔

دارا شکوہ سے شاہجہاں کی خفگی کے اسباب

دارا شکوہ سے شاہجہاں کے ناراض ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے خودسر اور مختارِ مطلق بن جانے کے لئے ان دنوں بعض علانیہ کوششیں کی تھیں بلکہ ایک ایسی حرکت کی تھی کہ جس کے باعث شاہجہاں کو اس سے سخت نفرت اور خوف ہو گیا تھا۔ اور اُس کی اِس خطا کے معاف کرنے پر مائل نہ تھا یعنی سعد اللہ خاں کو جسے شاہجہاں تمام ممالک ایشیا میں ایک بڑا ہی قابل اور لایق وزیر سمجھتا تھا اور جس سے اس قدر الفت رکھتا تھا کہ تمام دربار میں اُس کی محبت ضرب المثل ہو گئی تھی مروا ڈالا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ کیا جرم تھا جس کے سبب سے دارا شکوہ نے اُسے واجب القتل تصور کیا۔ اس کا یہ خیال ہو گا کہ شاہجہاں

---

[۱] گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کا حال اس کتاب کے خاتمہ کے قریب متن اور حاشیہ میں دیکھنا چاہیئے س م ح

کے گذر جانے پر اپنے اقتدار کی وجہ سے یہ امر اس کے اختیار میں ہوگا کہ جسے چاہے تخت پر بٹھا دے۔ یا بادشاہت کا تاج سلطان شجاع کے سر پر رکھدے۔ کیونکہ وہ اُس کا حامی اور طرف دار معلوم ہوتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے دل میں لوگوں کی بعض افواہوں نے جو سعد اللہ خاں کے ارادوں کی نسبت مشہور تھیں اثر کیا ہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی غور کے قابل ہے سعد اللہ خاں جو نسل کے اعتبار سے ایک ہندی الاصل شخص[1] تھا۔

---

[1] سعد اللہ خاں کو عہد شاہجہاں کے مورخوں میں سے بعض نے لاہور اور بعض نے چن یوٹ کا رہنے والا بیان کیا ہے جو پنجاب کے ضلع جھنگ میں ایک پرانا قصبہ ہے۔ لیکن میرے ایک دوست جو جھنگ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں بعد تحقیق یہ لکھتے ہیں کہ "اصل میں وہ پتراکی کا رہنے والا تھا۔ جو چن یوٹ سے پانچ کوس شمال کی طرف ایک موضع ہے۔ مگر اپنے ایام امارت میں اُس نے چن یوٹ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اگرچہ اس ملک میں اُس کی اولاد میں سے کوئی نہیں ہے مگر اُس کی بنائی ہوئی ایک بہت عالی شان مسجد اور اُس کے محلوں کے کھنڈر چینیوٹ میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ کے مورخوں نے اُس کی قومیت کا کچھ ذکر نہیں لکھا البتہ خافی خاں نے اُس کو شیخ سعد اللہ خاں لکھا ہے جو ہندوستان میں اکثر نو مسلم لوگوں کو یہی لکھا اور بولا جاتا ہے مگر اس کے وطن داروں کا یہ بیان ہے کہ وہ تہیم تھا جو ایک ایسی قوم ہے کہ وہاں کی مسجدوں اور مکتبوں کے مُلّا اکثر اسی ذات کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک تو ظن غالب یہی ہے کہ یہ کوئی ہندی الاصل قوم ہے۔ مگر چونکہ ان کے میراسی ان کے سلسلہ نسب میں کچھ عجیب و غریب نام بیان کر کے پھر اُس کو کھینچ تان کر ملک عرب تک پہنچاتے ہیں۔ اس لئے میرے ایک اور دوست جو بالفعل خاص چینیوٹ کی منصفی کے عہدہ پر مامور ہیں اور جنھوں نے براہ مہربانی تکلیف فرما کر میری خواہش کے موافق اس کی تحقیق کی تھی یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید یہ لفظ تہیم کی خرابی ہو جو عرب کے مشہور قبیلہ بنی تمیم کے نام کا ایک جزو ہے۔ اور ان گنواروں نے اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ جو فی زماننا ان اضلاع میں عموماً ہے بگاڑ کر اور اُس میں سے ایک لفظ حذف کر کے تہیم بنا لیا ہو۔ سعد اللہ خاں جو لاہور میں تحصیل علوم کے سبب سے ملا سعد اللہ لاہوری کے نام سے معروف تھا۔ ۱۰۵۰ھ میں شاہجہاں کے جلوس کے چودھویں سال کے شروع میں سید موسوی خاں صدر یعنی وزیر اوقاف کی سفارش سے بادشاہ کے حضور میں پہنچا تھا۔ مگر چار ہی برس کے اندر اپنی لیاقت اور کمال کی وجہ سے ہندوستان کا وزیر اعظم بن گیا۔ اور ساتویں برس ہفت ہزاری کے منصب پر جس سے بڑا کوئی اس وقت تک منصب نہ تھا فائز ہوا۔ اور شاہجہاں کے مزاج میں یہاں تک دخل پایا اور اعتماد حاصل کیا کہ کوئی چھوٹا یا بڑا کام اس کی رائے بغیر ہونا دشوار تھا اور مرتے دم تک اسی اعتماد اور اقتدار کے ساتھ اپنے عہدہ پر قائم رہا۔ ح م ح

دوسرے یہ کہ وہ اپنا قیام بالکل دولت آباد میں رکھے۔

تیسرے یہ کہ جو ملک اُس کے سپرد ہے اُس کے نظم و نسق کے سوا اورنگ زیب کو اس مہم سے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

چوتھے یہ کہ فوج کی سپہ سالاری و حکومت اور جزو کل کا اختیار صرف میر جملہ کے ہاتھ میں رہے مگر وہ تمام اپنے اہل و عیال کو اپنی وفاداری کی کفالت کے طور پر دربار میں چھوڑ جائے۔

یہ پچھلی بات اگرچہ میر جملہ کو نہایت ناگوار تھی لیکن شاہجہاں نے یہ سمجھا کر راضی کر لیا کہ یہ صرف داراشکوہ کی خوشی خاطر اور رفع وساوس کے لئے ہے۔ اور بخوبی مطمئن کر دیا کہ تمھارے اہل و عیال عنقریب تم سے آملیں گے۔ الغرض میر جملہ اس جرار فوج کا سپہ سالار بن کر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ اور وہاں سے بلا توقف کوچ کر کے بیجاپور کے ملک میں جا داخل ہوا۔ اور کلیانی کا محاصرہ شروع کر دیا جو ایک بڑی مضبوط اور مستحکم جگہ ہے[۱]۔

---

[۱] ان واقعات کو عاقل خاں اور خافی خاں نے جس طرح پر بیان کیا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے کہ میر جملہ جب اورنگ زیب کے پاس پہنچ گیا تو شاہجہاں نے اس کو وہیں معظم خاں کا خطاب اور پنج ہزاری کا منصب اور ایک بڑا بھاری خلعت عطا فرما کر حضور میں طلب فرمایا اور ۱۰۶۶ھ میں جب مقام شاہجہاں آباد حاضر ہوا تو اسد خاں بخشی نے استقبال کیا اور اُسے حضور میں لایا اور اُس نے ایک خوان اشرفیوں کا اور دو خوان جواہرات کے اور اور عمدہ چیزیں نذر گذرانیں اور چونکہ سعد اللہ خاں کے انھیں دنوں میں انتقال کر جانے کے سبب سے وزارت خالی تھی اس لئے اس عہدہ کا مرصع قلمدان چھ ہزاری چھ ہزار سوار کا منصب اور "خلعت خاص باشمشیر مرصع" اور شاہی گھوڑوں اور ہاتھیوں میں سے دو سو گھوڑے اور ایک ہاتھی اور ایک ہتنی معہ سونے چاندی کے ساز کے اور پانچ لاکھ روپیہ عنایت ہوا اور بقول صاحب سیر المتاخرین خطاب میں لفظ عمدۃ الملک بھی بڑھا دیا گیا۔ مگر چونکہ اُس نے دکن میں نشو و نما پائی تھی اور وہاں کی آب و ہوا کا خوگر تھا اور اس کے اور اورنگ زیب کے باہم آئندہ کے منصوبوں کی نسبت بھی کسی طرح کے مخفی عہد و پیمان تھے۔ اس لئے ہمیشہ واپس جانے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اب حسن اتفاق سے جو بیجاپور کے بادشاہ محمد عادل شاہ نے لاولد قضا کی اور اورنگ زیب نے باپ کو اطلاع دی کہ لوگوں نے سکندر نامی ایک مجہول النسب لڑکے کو جس کو عادل شاہ نے فرزند کے طور پر پالا تھا تخت پر بٹھا دیا ہے تو شاہجہاں نے بھی اورنگ زیب کو بیجاپور پر فوج کشی کا حکم دیدیا اور اُس کے مہم سے واپس آنے تک شایستہ خاں کو دولت آباد پہنچ کر صوبہ داری کا کام کرنے کی ہدایت ہوئی میر جملہ نے موقعہ دیکھکر ایک بڑی بھاری پیش کش (جس کی کل قیمت پندرہ لاکھ روپیہ جانچی گئی تھی)، اور جس میں دو سو لہ

اُس سے ایرانی اُمرا کو بڑا حسد تھا چنانچہ اُن افواہوں میں سے جو اُس کی نسبت اُڑادی گئی تھیں ایک افواہ یہ تھی کہ اُس نے یہ منصوبہ باندھ رکھا ہے شاہجہاں کی وفات کے بعد اولاد تیمور کو تخت سے محروم کر کے یا تو پٹھانوں[1] کے شاہی خاندان کو پھر قائم کرے گا یا خود تخت نشین ہو جائے گا یا اپنے بیٹے کو بادشاہ بنائے گا اور اِس افواہ کی تائید کے لئے یہ قرینہ تھا کہ سعداللہ خاں کی بیوی قوم کی پٹھانی تھی اور ایک یہ بات بھی گھڑی گئی تھی کہ اُس نے پٹھانوں کے کئی متعدد دستے اپنے منصوبہ کی تائید کے واسطے متفرق مقامات میں لگا رکھے ہیں[2]

گولکنڈہ پر فوج کشی کی شرائط

دارا شکوہ خوب جانتا تھا کہ یہ بڑی فوج جو دکن کو بھیجی جارہی ہے اس سے اورنگ زیب کی طاقت بڑھ جائے گی۔ اس لئے اُس نے اس معاملہ میں بہت کچھ بحث مباحثہ کیا۔ اور ہر حکمت اور حیلہ سے جو اُس سے بن سکا اس منصوبہ کو روکنا چاہا لیکن جب دیکھا کہ بادشاہ کو اس سے باز رکھنا ناممکن ہے تو آخر کار کچھ سمجھا بجھا کر یہ شرطیں مقرر کرا دیں۔

اول یہ کہ اورنگ زیب اس معرکہ میں کسی قسم کا دخل نہ دے۔

---

[1] شیر شاہ کا خاندان مراد ہے جس نے شاہجہاں کے پر دادا ہمایوں کو ہندوستان سے مار کر نکال دیا تھا اور خود بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ س م ح

[2] ان افواہوں اور دارا شکوہ کے سعداللہ خاں کو مروا ڈالنے کا ذکر اورنگ زیب کے طرفدار مورخوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا حالانکہ دارا شکوہ کی کسی بُرائی کا چھپانا اُن کے مدعا کے خلاف تھا بلکہ سب نے سیدھے اور صاف طور سے اُس کا مرنا قولنج کے مرض سے بیان کیا ہے جس میں وہ کئی مہینے تک مبتلا رہ کر ١٠٦٦ھ میں سینتالیس برس کی عمر میں مرا تھا اور حکیم داؤد مخاطب بہ تقرب خاں شاہجہاں کا طبیب خاص اس کا معالج تھا اور لکھا ہے کہ خود بادشاہ کئی بار اُس کی عیادت کو گیا تھا۔ اور خافی خاں نے اگرچہ اُس کی نسبت دارا شکوہ کے نہایت درجہ رشک وحسد اور بیجاپور کا دشمنوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ صاف لکھا ہے کہ باوجود قرب ولی عہدی اور اختیار سلطنت کے سعداللہ خاں کے مرتے دم تک اُس کی جان یا آبرو کو ضرر نہیں پہنچا سکا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ایشیائی اہل دربار کی عادت ہے کہ کسی اپنی ناجائز غرض سے کسی بڑے آدمی کی موت کو اکثر زہر وغیرہ سے منسوب کر دیا کرتے ہیں اُسی طرح یہ شہرت ہو گئی ہو گی جس کو برنی اگرتے اجنبی ہونے اور اس ملک کے لوگوں کی عادت سے بخوبی واقف نہ ہونے کی وجہ سے صحیح سمجھ کر لکھ ڈالا اور غالباً یہی وجہ ہو گی کہ الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہندوستان میں باوجودیکہ جا بجا برنی اگر کی تحریر کے حوالہ سے اکثر باتیں درج کی ہیں اُس کی اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔ س م ح

شاہجہاں کی بیماری

اس وقت جب کہ سلطنت کا یہ نقشہ تھا اور شاہجہاں کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی وہ ایسی بیماری میں[ل] مبتلا ہو گیا جس کی حقیقت کا بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور صرف اتنا لکھدینا کافی ہے کہ ایک ایسی عمر کے آدمی کے لئے یہ بہت نازیبا ہے کہ احتیاط کے ساتھ حفاظت کرنے کے بجائے اپنی باقی ماندہ طاقت اور توانائی بھی برباد اور تلف کر دے۔

بادشاہ کی اس بیماری سے تمام قلمرو میں ایک سخت پریشانی اور تہلکہ پڑ گیا چنانچہ دہلی اور آگرہ میں جو پائے تخت سلطنت ہیں۔ داراشکوہ نے ایک بڑی زبردست فوج جمع کی اور بنگالہ میں شجاع نے ایسی ہی تیاریاں کیں اُدھر دکن اور گجرات میں اورنگ زیب اور مراد بخش نے ایسی فوجیں بھرتی کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کا کیا ارادہ ہے۔ اور چاروں نے ہر طرف سے اپنے اپنے رفیق اور مددگار بلا کر جمع کئے اور اِدھر اُدھر خط لکھ بھیجے اور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱۔ رتی وزن اور دو لاکھ سولہ ہزار روپیہ قیمت کا ایک ہیرا اور چار ہتنیاں اور ساٹھ ہاتھی سونے کے ساز کے اور سولہ ہتنیاں چاندی کے ساز کی تھیں گذرانی۔ اور عرض کیا کہ بیجاپور کیا بلکہ دکن کا تمام ملک آسانی کے ساتھ فتح ہو سکتا ہے اور اس کا ذمہ میں لیتا ہوں اور اس طرح مہابت خاں اور راو ستر سال وشاہنواز خاں ونجابت خاں وغیرہ "کمکی" افسروں کے ہمراہ بیس ہزار مغل اور راجپوت فوج کا سپہ سالار بن کر رخصت ہوا تاکہ اورنگ زیب کے تحت اس مہم کو سرانجام دے اور محمد امین خاں کو حکم ہوا کہ باپ کی جگہ وزارت کا کام بہ اتفاق رائے رایاں رگھناتھ نائب وزیر انجام دیتا رہے۔ میر جملہ اورنگ آباد پہنچا، اور وہاں سے معہ اورنگ زیب کے بیجاپور کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ اور کلیانی اور دوسرے قلعوں کو جا گھیرا۔ س ع

ل مترجم انگریزی نے حاشیہ میں بحوالہ تحریر کرنل ڈو صاحب یہ لکھا ہے کہ "شاہجہاں کی طاقت و توانائی میں بسبب افراط و بے ہنگام شوق عیاشی کے نہایت خلل آ گیا تھا چنانچہ اسی سبب سے سترھویں ستمبر ۱۶۵۷ء کو ناگہاں اُسے فالج ہو گیا اور اُس کے ساتھ سوزاک کا بھی خلل تھا اور کئی دن تک حالت بیہوشی اُس پر طاری رہی تھی مگر فارسی کتابوں سے فالج کا ہونا غلط معلوم ہوتا ہے اور ان کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ شروع ماہ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ کو بمقام دہلی سڑسٹھ برس کی عمر میں شاہجہاں کا پیشاب بند ہو گیا اور اعضائے اسفل پر ورم ہو کر ایک ہفتہ تک نہایت سخت بیمار رہا اور کچھ تخفیف ہو گئی تھی کہ اُسی حالت میں داراشکوہ اپنے بھائیوں کے منصوبوں کے روکنے کے واسطے دہلی کی بہ نسبت اکبر آباد کو ایک بہتر مقام سمجھ کر بسواری کشتی اُس کو وہاں لے گیا۔ اور اگرچہ یہ سفر ایک مہینے میں ختم ہوا مگر مرض میں بھی بہت کچھ افاقہ ہو گیا۔ س م ح

بڑے بڑے وعدے اور عہد و پیمان کئے اور طرح طرح کی بندشیں اور سازشیں کرنی شروع کیں۔

سازشی خطوط

اگرچہ دارا شکوہ نے ان سازشوں کے تحریری ثبوت باپ کو دکھائے اور بھائیوں کی سخت شکایتیں کیں۔ اور بیگم صاحب نے بھی موقعہ دیکھکر بہت سا لگاؤ بجھاؤ کیا۔ لیکن بادشاہ کو دارا شکوہ پر بالکل اعتبار نہ تھا یہاں تک کہ اُسے کامل شبہ تھا کہ وہ اُسے زہر دلوانے کی فکر میں ہے اور اس سبب سے کھانے پینے میں بہت ہی احتیاط برتتا تھا۔ بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس نے اورنگ زیب سے بھی کچھ خط و کتابت کی تھی جس کی خبر پاکر اور طیش میں آکر دارا شکوہ نے باپ کو بہت دھمکایا تھا۔

بادشاہ کے انتقال کی افواہ

اس عرصہ میں بادشاہ کی علالت اس قدر بڑھ گئی کہ اُس کے مرنے کی افواہ اُڑ گئی۔ اور تمام دربار درہم و برہم ہو گیا۔ اور آگرہ میں یہاں تک خوف و خطر پھیلا کہ بازاروں میں کئی روز تک ہڑتال رہی اور چاروں شاہزادے علانیہ کھُل کھیلنے لگے۔ اور صاف کہہ دیا کہ اب اس مقدمہ کا فیصلہ صرف تلوار ہی سے ہوگا اور واقعی ان کا اپنے اس ارادہ سے دست بردار ہونا مشکل بھی تھا کیونکہ فتح یابی کی حالت میں تو تخت کی امید تھی اور شکست کی صورت میں جان جانے کا یقین کلی تھا اور اب صرف دو ہی باتیں تھیں، یا موت یا سلطنت۔ اور جس طرح شاہجہاں[1] خاص اپنے بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر تخت نشین ہوا تھا اسی طرح ان کو یقین واثق تھا کہ اگر ہم

---

[1] جب ۱۰۳۶ھ میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور نور جہاں بیگم نے جہانگیر کے بیٹے سلطان شہریار کو جس سے نور جہاں کی بیٹی جو اس کے پہلے خاوند سے تھی بیاہی ہوئی تھی اور جو بیماری کے سبب سے رخصت لے کر پہلے ہی لاہور پہنچ گیا تھا سلطنت کے لئے اُبھارا اور نور جہاں کے بھائی آصف خاں وزیر نے اپنے داماد شاہجہاں کو بنارسی نامی اپنے ایک نہایت معتمد ہندو قاصد کی معرفت تنگیٔ وقت کی وجہ سے عریضہ کی جگہ اپنی مہر حوالہ کر دی تھی خفیہ پیغام بھیج کر بلایا۔ اور نور جہاں کی سازشوں کی روک تھام کے لئے شاہجہاں کے دکن سے آگرہ میں پہنچنے تک جہاں وہ باپ سے باغی بنا پھر رہا تھا، جہانگیر کے پوتے سلطان داور بخش عرف مرزا بلاقی خلف سلطان خسرو کو جو ارادت خاں کے سپرد تھا برائے نام پادشاہ بنا کر لاہور کی طرف کوچ کیا۔ اور نور جہاں کو اپنے خیمہ میں لا کر قابو میں کر لیا۔ اور لاہور پہنچ کر شہریار کو جو پادشاہت

اپنی امیدوں میں ناکام رہیں گے تو غالب اور فتح یاب حریف حسد کے مارے ہم کو ضرور قتل کرا دے گا۔

سلطان شجاع کا آگرہ کی طرف کوچ

پس سب سے پہلے سلطان شجاع رجس نے کچھ تو بعض راجاؤں کو برباد کرکے اور کچھ اور لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنے صندوق بھر لئے تھے اور اس سبب سے ایک فوج کثیر کا جمع کر لینا اُس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا اس کے علاوہ اپنے ہم مذہب ایرانی اُمرائے دربار کی اعانت اور امداد پر بھی اُسے پورا بھروسہ تھا، فوج و لشکر جمع کرکے نہایت سُرعت کے ساتھ آگرہ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اور یہ مشہور کیا کہ "چونکہ بادشاہ کو داراشکوہ نے زہر دے کر مار ڈالا ہے اس لئے ہم اس خونِ ناحق اور حرکت ناشائستہ کا انتقام لیں گے اور تخت سلطنت پر جو خالی ہے جلوس کریں گے" اگرچہ شاہجہاں نے داراشکوہ کی صلاح سے بہت جلد اس افواہ کی جو اُس کی موت کی نسبت مشہور ہو گئی تھی تردید کی اور صاف لکھا کہ علاج و معالجہ سے بیماری کو افاقہ ہوتا جاتا ہے اور بتاکید حکم دیا کہ تم اپنے صوبہ کو فوراً لوٹ جاؤ۔ لیکن اس بنا پر کہ اُس کے ہواخواہ برابر یہ خبریں بھیج رہے تھے کہ بادشاہ کی بیماری لاعلاج ہے وہ آگرہ کی طرف بدستور بڑھا چلا آیا۔ اور یہ حیلہ بنایا کہ مجھے بندگان والا کی سلامتی کی خبر پر یقین نہیں آتا۔ اور بالفرض اگر وہ زندہ اور سلامت ہیں تو قدم بوسی حاصل کرنی اور ارشاد و احکام سے سرفراز ہونے کی مجھے بڑی تمنا ہے۔

اورنگ زیب نے بھی اسی طرح اپنے اشتہار جاری کئے اور فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ اور ٹھیک اُنھیں دنوں میں جب کہ سلطان شجاع نے کوچ کیا تھا اُس نے بھی آگرہ کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:- کی ہوس میں لاہور کے بادشاہی خزانہ کا پچھتر لاکھ روپیہ خراب کرکے پندرہ ہزار فوج کی جمعیت سے صرف ایک دن کے مقابلہ کیلئے آیا تھا گرفتار کرکے قلعہ لاہور میں قید کر دیا اور داور بخش کو تخت پر بٹھایا تو شاہجہاں کا خاص اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ حکم آصف خاں کے پاس پہنچا کہ مناسب اور مصلحت وقت یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو داور بخش اور اُس کے بھائی گرشاسب اور مرزا دانیال کے تینوں بیٹوں شہریار اور طہمورث اور ہوشنگ کو اندھا کرکے ہمارے پاس لے آؤ۔ ورنہ پانچوں کے پانچوں کو چلتا کرو۔ تو آصف خاں نے ارادت خاں اور خواجہ ابوالحسن وغیرہ اُمرا کے اتفاق سے سکہ و خطبہ شاہجہاں کے نام کا جاری کر دیا۔ اور ان بیچارے پانچوں بیگناہوں کو رات کے وقت دنیا سے رخصت کر دیا۔ اور اُدھر آٹھویں جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ کو شاہجہاں نے آگرہ پہنچ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ س م ح

طرف بڑھنے کا عزم کیا اور اگرچہ اس کو بھی وہی امتناعی احکام بادشاہ اور داراشکوہ کی طرف سے پہنچے۔ اور داراشکوہ نے تو یہاں لکھدیا تھا کہ اگر تم دکن سے حرکت کروگے تو سزا پاؤگے۔ مگر شجاع کی طرح اس نے بھی وہی حیلہ بنا کر اُسی غدر سے جواب روانہ کیا اور چونکہ اس کی آمدنی بہت زیادہ نہ تھی اور فوج بھی بہ نسبت اوروں کے کم تھی[۱] اس لئے اُس نے چالاکی سے اُس چیز کو حاصل کرنا چاہا جو صرف اس کی تلوار اور قوتِ بازو سے غیر ممکن تھی۔ اور چونکہ مراد بخش اور میر جملہ ہی دو ایسے شخص تھے جو آسانی کے ساتھ اس کے دَم میں آسکتے تھے۔ اس لئے اُس نے مراد بخش کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "بھائی تم کو اس بات کے یاد دلانے کی کچھ حاجت نہیں کہ امورِ سلطنت کی محنت اٹھانی میرے اصلی مزاج اور طبیعت کے کس قدر مخالف ہے اور اس وقت جب کہ داراشکوہ اور شجاع نہایت سرگرمی سے حصولِ سلطنت کے لئے کوشش اور سعی کررہے ہیں تو میں صرف ایک جانِ زار ہی کی حفاظت اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہوں۔ اور سلطنت کے حق حقوق اور دعووں سے میں بالکل دست بردار ہوں۔ تاہم آپ میرے قدیمی اور نہایت گرامی عزیز ہیں تم کو اس رائے اور خیالات سے مطلع کرنا واجب جانتا ہوں کہ یہی نہیں کہ داراشکوہ فرماں روائی کے اوصاف سے خالی ہے۔ بلکہ لا مذہب اور کافر ہونے کی وجہ سے بالکل تاج و تخت کے لائق نہیں اور بڑے بڑے امرائے سلطنت اور ارکانِ دولت سب اُس سے متنفر ہیں اور علیٰ ہذالقیاس شجاع بھی سلطنت کے قابل نہیں کہ رافضی مذہب اور ہندوستان کا دشمن ہے۔ پس اس صورت میں اس عظیم الشان سلطنت کی فرماں روائی کے لائق صرف آپ ہی ہیں۔ اور یہ رائے صرف میری ہی نہیں۔ بلکہ اس میں پائے تخت کے مشیر اور امیر جو آپ کے بے بدل شجاع ہونے کے بدل قائل و معترف ہیں سب متفق الرائے اور ہم زبان اور دارالخلافت میں آپ کی رونق بخشی کے منتظر ہیں اور میری باہمت تو یہ تصور کر لیجئے کہ اگر آپ کی طرف سے موثق اور مستحکم طور پر مجھے یہ وعدہ مل جائے گا کہ جب بفضل خدا آپ بادشاہ ہوجائیں گے تو مجھے اپنی قلمرو میں کوئی خلوت کے موقعہ کا گوشۂ عافیت باطمینان خاطر عباداتِ الٰہی بجالانے کو عنایت فرمادیجئے گا تو میں فوراً آپ کی طرف داری میں خدمت بجالانے کو آمادہ اور تیار ہوں۔

---

[۱] عاقل خاں نے لکھا ہے کہ اس وقت اورنگ زیب کے پاس تیس ہزار سوار جرار تھے۔ س م ح

اور صلاح ومشورہ سے۔ اپنے دوستوں اور رفیقوں سے۔ اپنی تمام فوج آپ کے تحت حکم کردینے سے۔ غرض کسی قسم کی مدد دینے سے بھی۔ مجھے دریغ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بالفعل آپ کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھیجتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ آپ اس کو بطور نذر قبول فرمائیں کہ یہ میری ترقی اخلاق اور خوشی کا باعث ہوگا۔ اور اب ہنر آزمائی اور جوہر نمائی کا وقت ہے۔ پس آپ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجئے اور موقعہ کو غنیمت سمجھئے۔ اور جلدی سے سورت[1] کے قلعہ پر جہاں مجھے خوب معلوم ہے کہ بہت سے بادشاہی دفائن وخزائن مدفون ومخزون ہیں قبضہ کرلیجئے[2]

---

[1] فارسی زبان کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ اس وقت شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب کی جاگیر میں تھی۔

[2] اورنگ زیبی چالوں اور ہتھکنڈوں پر خیال کرنے سے تو ظاہراً ڈاکٹر برنیر ہی کا لکھنا صحیح پایا جاتا ہے کہ مراد بخش نے جو کچھ کیا وہ اورنگ زیب کی تحریک وترغیب سے کیا مگر اس وقت کی فارسی تاریخوں سے بالاتفاق یوں معلوم ہوتا ہے کہ مراد بخش نے جب باپ کے سخت بیمار ہونے کی خبر پائی تو اُس کا مرجانا فرض کرکے خود بخود شورش کی۔ اور صوبہ گجرات کے بادشاہی دیوان سید علی نقی کو جو اُس کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے مامور تھا اپنا بدخواہ سمجھکر بے جرم وخطا خود اپنے ہاتھ سے قتل کرڈالا اور بادشاہ بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ اور دستور خاندان کے مطابق اپنا شاہانہ لقب مروج الدین مقرر کرکے سکہ اور خطبہ بھی جاری کردیا۔ اور ساز وسامان کی درستی کے لئے نہ صرف شاہی خزانہ پر تصرف کرلیا بلکہ گجرات کے سوداگروں اور دولت مندوں سے بھی بہت سا روپیہ جبراً وصول کیا۔ اورنگ زیب ان سب حالات کو دیکھ رہا تھا مگر ازراہ احتیاط ایک برس کے قریب تک خاموش رہا۔ مگر جب شجاع نے بھی بنگالہ سے کوچ کردیا تو زیادہ توقف مصلحت نہ دیکھکر اُس نے بھی چڑھائی کرنے کی ٹھان لی اور بقول عاقل خاں جس کے بیان اکثر ناطرفدارانہ اور صاف ہیں یہ خیال کرکے کہ مراد بخش جو تخت نشین ہونے کی بھی حرکت کرچکا ہے ایسے باحوصلہ شخص کا دارالحکومت دکن سے آگرہ کی طرف میرے چلے جانے کی صورت میں ایسے قریب مقام میں رہنا مناسب نہیں ہے اس لئے سخت سخت قسموں کے ساتھ مراد بخش سے یہ معاہدہ کیا۔ کہ ہم تم متفق ہوکر آگرہ پر حملہ کریں۔ اور بصورت فتح کل مال غنیمت میں سے ایک ثلث تمہارا اور دو ثلث میرے اور سلطنت میں سے کابل اور کشمیر اور سندھ اور ملک پنجاب تمہارے تصرف میں آئے گا۔ اور اُس میں سکہ وخطبہ اور حکومت شاہانہ تمہاری رہے گی۔

مراد کی سورت پر فوج کشی مراد بخش جس کی دولت اور قوت بہ نسبت اوروں کے کم تھی بھائی کی اس درخواست سے جس کے ساتھ ایک بڑی رقم بھی آئی تھی بہت ہی خوش ہوا اور اُس کی اُمیدوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس اُمید سے کہ جوان اور سپاہی پیشہ لوگ اس کے مضمون سے واقف ہوکر فوج میں بھرتی ہونے پر زیادہ راغب اور آمادہ ہوں گے اور اس خبر کو سُن کر سوداگر لوگ زیادہ رضامندی سے بڑی بڑی رقمیں قرض دینے پر مائل ہو جائیں گے۔ جو اُن سے وہ بہ سختی طلب کرتا تھا۔ یہ خط جا بجا دکھایا گیا۔ اور اب اُس نے سچ مچ سارے کرّوفر اور شان و تزک شاہانہ بنا لئے اور لوگوں کو بڑے بڑے انعام و اکرام کا متوقع کیا۔ اور حسنِ اتفاق سے ان سب باتوں میں اُس کی تدبیریں اور منصوبے ایسے بن پڑے کہ بہت جلد ایک خاصی فوج جمع ہو گئی اور مراد نے سب سے پہلے تین ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ زیرِ حکومت شاہ عباس خواجہ سرا جو بڑا بہادر اور سپاہی منش تھا قلعہ سورت کے محاصرے کے لئے بھیج دیا گیا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۔ اور سیر المتاخرین میں یوں لکھا ہے کہ سلطنت اور مال و دولت کی تقسیم نصف نصف ٹھیری تھی اور منشی محمد ذکاءاللہ صاحب دہلوی سلمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب تاریخ ہند میں مکتوبات عالمگیری سے اس عہد نامہ کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں کہ ہمارا دوست آپ کا دوست اور ہمارا دشمن آپ کا دشمن اور بعد انفصال تمام جھگڑوں کے صوبجات لاہور، کشمیر، کابل، ملتان، ٹھٹہ، بھکر اور تمام اضلاع خلیج عمان تک تم کو دیئے جائیں گے۔ س م ح

لہ عاقل خاں نے اس خط کا مضمون بیان نہیں کیا مگر الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہندوستان میں خافی خاں کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ "میں تمھارا خیر خواہ اور برادر مخلص ہوں اور تخت نشینی تم کو مبارک ہو باقی میرا تو یہ ارادہ ہے کہ میں مکہ کو جاؤں اور کنج عزلت میں بیٹھکر خدا کی یاد کروں اور دنیا کو چھوڑوں اور باوصف اُس کے لامذہب دارا شکوہ کے مقابلہ پر تمھارا ساتھی بھی ہوں اور اب تک کہ ہمارا باپ جیتا جاگتا ہے تو ہم کو چاہیئے کہ اُس کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اگر وہ ہم سے بعنایت پیش آئے تو اُس کو اس ناواجب رعب و داب سے بچائیں جو دارا شکوہ نے اُس پر ڈال رکھا ہے اور اُس کی غلط فہمی کی معافی چاہیں اور اب اسی عرصہ میں ہمکو یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی فوجیں اکٹھی کریں اور کافر جسونت سنگہ سے بمقابلہ پیش آئیں جو ہمارے روکنے کے لئے روانہ کیا گیا ہے۔ س م ح۔

ٹہ عاقل خاں کی تاریخ سے صحیح نام شہباز خاں معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ شخص پنج ہزاری کے منصب کا ایک امیر تھا اور آیندہ اس ترجمہ میں شہباز خاں ہی لکھا جائے گا س م ح

میر جملہ اورنگ زیب کی قید میں

جب مراد بخش کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو (جس کی شادی شاہ گولکنڈا کی بیٹی سے ہوئی تھی) میر جملہ کے پاس بھیجا کہ "بڑا ہی ضروری کام ہے۔ آپ فوراً یہاں آکر ذرا مجھ سے مل جائیں" لیکن میر جملہ اپنی فراست سے اس ضروری کام کو فوراً تاڑ گیا اور جواب دیا کہ کلیانی کا محاصرہ چھوڑ کر اور فوج سے علیحدہ ہو کر میرا دولت آباد آنا ممکن نہیں اور آپ یقین فرمائیں کہ میں نے آگرہ سے ابھی تازہ خبر پائی ہے کہ شاہجہاں ہنوز زندہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے۔ جب تک میرے اہل و عیال داراشکوہ کے قابو میں ہیں میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا بلکہ میرا اصل منشا تو یہ ہے کہ میں اس ہنگامہ میں کسی کا بھی طرف دار نہ بنوں۔

جب محمد سلطان نے دیکھا کہ میر جملہ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتا تو وہ نہایت ناراض ہو کر دولت آباد کو چلا گیا۔ لیکن اس ناکامی سے اورنگ زیب کسی طرح نا امید نہ ہوا اور اپنے دوسرے بیٹے سلطان معظم کو پھر اس کے پاس بھیجا اور اپنی پہلی خواہش کا اعادہ کیا۔ اس شاہزادہ نے اپنے پیام و سلام کو اس خوبی سے ادا کیا اور سابقہ محبت و اتحاد کو اس قابلیت سے جتایا کہ میر جملہ اُس کی درخواستوں سے انکار نہ کر سکا اور اُس نے کلیانی کے محاصرہ کو اس قدر سخت اور شدید کیا کہ مخالفوں نے ناچار ہو کر آخر کار قلعہ خالی کر دیا۔ اور فتح کے بعد یہ اپنی چیدہ فوج ساتھ لے کر نہایت عجلت کے ساتھ دولت آباد کو چلا آیا۔ چنانچہ بوقت ملاقات اورنگ زیب نہایت مہربانی اور گرم جوشی سے پیش آیا اور گفتگو میں بابا اور باباجی وغیرہ بہت بڑے بڑے تعظیمی الفاظ کے ساتھ اُس سے مخاطب ہوا اور اس مبارک مہمان کو کئی بار گلے لگایا اور پھر خلوت میں لے جا کر یہ کہا کہ "مجھے معلوم ہے کہ آپ نے جو محمد سلطان سے انکار کیا تھا وہ مجبوری کے باعث سے تھا اور بے شک میرے سب فہمیدہ اور دور اندیش اہل دربار کی بھی یہی رائے ہے کہ جب تک آپ کے اہل و عیال داراشکوہ کے قابو میں ہیں آپ کو علانیہ اور بر ملا کوئی ایسی حرکت ہرگز نہ کرنی چاہئے جو بظاہر ہمارے حق میں مفید نظر آتی ہو۔ لیکن آپ جیسے عقیل شخص کو سمجھانے کی کیا حاجت ہے کہ دنیا میں ہر مشکل کام کی آخر ایک تدبیر ہے۔ چنانچہ ایک منصوبہ میرے خیال میں آیا ہے جس سے بظاہر اگرچہ آپ حیران ہوں گے لیکن جب

اُس کے نشیب و فراز پر بخوبی غور کریں گے تو بے شبہ آپ کے اہل و عیال کی سلامتی کے لئے ایک یقینی ذریعہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ بظاہر قید ہو جانا گوارا کرلیں اس سے تمام جہان کو میری آپ کی دشمنی کا یقین کامل ہو جائے گا اور اس حکمت سے ہم اپنی تمام خواہشوں میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ کوئی شخص ہرگز ایسا گمان کبھی نہ کرے گا کہ آپ جیسے رتبہ کا کوئی آدمی اس طرح اپنی خوشی سے قید ہو جاتے۔ اور اس کے ساتھ ہی میں آپ کی فوج کا ایک حصہ جس وضع اور حیثیت سے آپ کو پسند اور مناسب معلوم ہو نوکر رکھ لوں گا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جس طرح پہلے آپ بارہا مجھ سے وعدے کرتے رہے ہیں اس وقت کچھ روپیہ دینے سے بھی انکار نہ کریں گے۔ کیونکہ مجھے روپیہ کی بہت ضرورت ہے اور آپ کے اس روپیہ اور لشکر سے میں اپنی بخت آزمائی کروں گا پس اجازت ہو تو میں آپ کو اسی وقت قلعہ دولت آباد میں پہنچا دوں۔ اور اس جگہ میرا ایک بیٹا آپ کا نگرانِ حال رہے گا اور اس کے بعد ہم اور آپ اس مہم کو سرانجام دینے کی تدابیر پر باہم غور و فکر کرسکیں گے اور اس صورت میں ہرگز میرے خیال اور قیاس میں نہیں آتا کہ داراشکوہ کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو اور وہ ایسے شخص کے اہل وعیال سے کوئی بدسلوکی کرے جو بظاہر میرا اس قدر دشمن ہو۔

ہم معتبر سند سے بیان کر سکتے ہیں کہ اورنگ زیب کی تقریر کا مدعا یہی تھا۔ اور اگرچہ وہ خیالات اور حالات جن کو سوچ سمجھکر میر جملہ نے ان خواہشوں کا جواب دیا ہوگا بخوبی معلوم نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اُس نے ان سب باتوں کو قبول کرلیا تھا یعنی وہ اس پر بھی راضی ہوگیا تھا کہ اپنی فوج کو اورنگ زیب کے زیرِ حکومت کردے۔ اور روپیہ کا دینا بھی قبول کرلیا۔ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اُس کی مرضی کے مطابق سچ مچ قید ہوکر قلعہ دولت آباد میں چلا گیا!

اب اس معاملہ کی نسبت بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ میر جملہ کو اورنگ زیب نے سمجھا بجھا کر فی الواقع اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ آپ کے بہ رضامندی قید ہو جانے سے بہت فائدے ہوں گے۔ اور چونکہ پہلے سے آپس میں دوستی اور اتحاد تھا۔ اس وجہ سے اورنگ زیب نے اُسے قید ہو جانے پر حقیقتاً راضی کرلیا تھا۔ اور بعض کی یہ رائے ہے (جو غالباً زیادہ معقول اور قرینِ قیاس ہے)، کہ اُس نے صرف ڈر کے مارے ان باتوں

کو قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ اورنگ زیب کے دو جوان بیٹے ایک سلطان معظم دوسرا محمد سلطان اس ملاقات اور سوال وجواب کے وقت سر پر کھڑے تھے اور اگرچہ سلطان معظم کا مسلح ہونا بھی زبان حال سے گویا یہی کہہ رہا تھا کہ انکار کی حالت میں بہت ہی بُرا ہوگا مگر محمد سلطان تو بیچ بیچ تلوار لئے ہوئے موچھوں کو اس طرح تاؤ دے رہا تھا کہ بس مار ہی ڈالے گا۔ اور چونکہ اسی ملاقات کے معاملہ میں میر جملہ کی طرف سے اس کی کافی توہین وتحقیر ہو چکی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی اپنی سفارت میں سرخ رو اور کامیاب ہوا تھا۔ اس لئے اُس کو اپنی رنجش پوشیدہ رکھنے کی کچھ پروا بھی نہ تھی[1]۔

---

[1] فارسی زبان کی تاریخوں سے اس کی گرفتاری کے واقعہ کی تفصیل وتشریح یوں پائی جاتی ہے کہ جب مہابت خاں ومیر جملہ وغیرہ بادشاہی امیروں نے جو بیجاپور کی مہم میں اورنگ زیب کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ اول قلعہ بیدر (بدر) اور پھر کلیانی کے بھی نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ کو سخت مقابلہ کے بعد بیجاپوریوں سے چھین لیا۔ اور شاہجہاں نے اورنگ زیب کی عرائض فتح ملاحظہ فرما کر بیدر کا مفتوحہ ملک معہ قلعہ رام گڑھ اورنگ زیب کو حسنِ خدمت کے صلہ میں بخش دیا اور اُس کی تنخواہ بارہ کروڑ دام یعنی ایک کروڑ سالانہ علاوہ اور عطیوں کے مقرر کر دی اور معظم خاں۔ شہنواز خاں۔ مہابت خاں۔ نجابت خاں وغیرہ امیروں کو بھی جنھوں نے اس مہم میں نمایاں کام کئے تھے اضافہ مناصب اور عطائے خلعت وغیرہ سے سرفراز کیا گیا۔ اور دلاور حبشی قلعہ دار کلیانی قلعہ چھوڑ کر جب بیجاپور پہنچا۔ اور بیجاپور والوں کو یقین ہو گیا کہ اب بغیر اطاعت کے چارہ نہیں انھوں نے اپنا ایک معتمد شاہزادہ اورنگ زیب کے پاس بھیج کر امان چاہی۔ اور آخر الامر یہ ٹھیر گیا کہ ایک ایسی بھاری پیش کش داخل کریں۔ جو جواہرات اور ہاتھی اور نقدی وغیرہ ملا کر ڈیڑھ کروڑ روپیہ کی تعداد سے کم نہ ہو۔ اور قلعہ پرینڈا مع مضافات اور ملک کوکن کے تمام قلعے اور کچھ اور محالات بھی بادشاہی عہدہ داروں کے حوالہ کریں۔ اور جب یہ سب حال اورنگ زیب نے بادشاہ کو لکھا اور اُس نے بیجاپوریوں پر رحم کر کے پیش کش کی تعداد میں پچاس لاکھ کی تخفیف کر دی اور شاہزادہ کے نام فرمان لکھا گیا کہ قاضی نظاما کو تحصیل پیش کش کے لئے مامور کر کے خود دولت آباد کو چلا جائے اور معظم خاں جب ملک مفتوحہ کے قلعوں کے حسب واقعی بندوبست سے فارغ ہو جائے تو بیجاپور کی پیش کش جو قاضی نظاما لے کر آئے اُس کو ساتھ لے کر حضور میں حاضر ہو جائے ابھی ان شرطوں کی تعمیل نہیں ہوئی تھی اور اورنگ زیب قلعہ گلبرگہ کو گھیرے ہوئے تھا کہ اسی اثناء میں بادشاہ بیمار ہو گیا۔ اور دارا شکوہ نے ایسے بڑے امیروں کا اورنگ زیب کے پاس اس وقت موجود رہنا اپنے حق میں بہتر نہ سمجھ کر مہابت خاں

بسلسلہ صفحہ گذشتہ۔ راؤ ستر سال وغیرہ کے نام بادشاہی فرمان جاری کرادیئے کہ اُس کی اجازت اور عدم اجازت کی مطلق پروانہ کرکے بلا توقف آگرہ کو چلے آئیں۔ چنانچہ سوائے نجابت خاں اور شاہنواز خاں اور میر جملہ کے سب چلے آئے۔ بلکہ میر جملہ کو تو عہدہ وزارت سے معزول کرکے حاضر دربار ہونے کا حکم بھیجا گیا (کیونکہ اورنگ زیب کا متوسل خاص سمجھا جاتا تھا) اور محمد امین خاں کو جو باپ کی جگہ نیابتاً وزارت کرتا تھا کام سے علیحدہ کیا گیا اور رائے رایان دیوان رگھناتھ سرانجام کار کے لئے قائم مقام کے طور پر مامور ہوا دارا شکوہ نے ان امیروں کے واپس بلانے کے لئے یہ بہانہ بنایا تھا کہ شجاع نے بنگالہ سے بارادہ فاسد کوچ کر دیا ہے۔ اس لئے ان کا معہ ان کی فوجوں کے پائے تخت میں حاضر ہو جانا مناسب ہے۔ ان امیروں کے چلے آنے سے اورنگ زیب کو نہایت دقت پیش آئی۔ کیونکہ اول تو بادشاہ کی سخت بیماری ہی کی خبریں سُن کر بیجا پوریوں کے دل بہت بڑھ گئے تھے۔ اور اس پر ایسے نامور اور صاحب فوج امرا کے چلے جانے سے اُن کو اور بھی زیادہ دلیری ہوگئی۔ اور اورنگ زیب کے لشکر میں جو ہنوز گلبرگہ کو گھیرے ہوئے تھا بہت ابتری اور کمزوری پھیل گئی مگر وہ حسب معمول اپنی ثابت قدمی اور استقلال طبع سے نہایت متانت اور وقار کے ساتھ جس طرح بن پڑا بندوبست مناسب کرکے عزت اور نیک نامی کے ساتھ دولت آباد میں واپس آگیا۔ اور جب اُس نے سُنا کہ میر جملہ بھی جو اب تک پیش کش کی تحصیل اور مفتوحہ قلعوں کے نظم ونسق سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ مہابت خاں اور ستر سال کی طرح آگرہ کو جانے والا ہے۔ تو اُسے یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر ایسا دولت مند باتدبیر صاحب فوج ولشکر امیر ایسے وقت میں دارا شکوہ کے پاس جا پہنچا تو میری ساری اُمیدیں خاک میں مل جائیں گی پس اُس کے پھانسنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ اُس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ ہم آپ کو اپنا دلی ہواخواہ اور خیراندیش جانتے ہیں اگر آپ ہم سے مل کر اور رخصت ہوکر آگرہ کو جائیں تو مناسب ہے۔ اور جب اُس نے آنے سے پہلو تہی کی اور لکھا کہ میرے نام فرمان آچکا ہے اس لئے مجبور رہوں۔ تو اورنگ زیب نے اس کے قابو میں لانے کے لئے اس مرتبہ اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ چونکہ آپ حضور میں حاضر ہونے کو جاتے ہیں اس لئے بعض ضروری باتیں تخلیہ میں آپ سے کہنی سنی واجبات سے ہیں اور اس صورت میں آپ کا ہم سے مل کر جانا ہماری نہایت ہی خوشی کا باعث ہوگا۔ اور محمد سلطان نے باپ کی نہایش کے موافق ایسی چکنی چپڑی باتیں بنائیں اور ایسا مطمئن کیا کہ وہ بلا دغدغہ خوش خوش ملنے کو چلا آیا۔ اب چونکہ یہاں پہلے ہی سے سب تیاری کی ہوئی تھی اور یار لوگ تواضع کے لئے منتظر تھے جوں ہی اُس نے خلوت خانہ میں قدم رکھا جناب امارت مآب فوراً گرفتار کر لئے گئے اور اُس کے عمر بھر کے جمع کئے ہوئے خزانے اور مال و اسباب اور سامان

القصہ جب میر جملہ کی گرفتاری کی خبر عام ہوگئی تو اُس کی فوج کے اُس دستہ نے جو بیجا پور سے اُس کے ساتھ آیا تھا بڑے زور سے کہا کہ ہمارے سردار کو چھوڑ دیا جائے اگر اورنگ زیب اپنی حکمت عملی سے فوراً اُن کی تسلی تشفی نہ کر دیتا تو بے شبہ وہ اپنے سردار کو چھڑا لیتے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اُن کے بڑے بڑے سرداروں کو تو یہ سمجھا کر کہ وہ بالکل اپنی خوشی اور مرضی سے نظر بند ہوا ہے اپنا رفیق بنا لیا۔ اور اُن کے ذہن نشین کر دیا کہ یہ محض ایک حکمت اور منصوبہ ہے جو اصل میں ہماری اور امیر کی باہمی صلاح ہی سے تجویز ہوا ہے۔ اور سپاہ کو خوب دل کھول کر انعام واکرام دیئے بعض سرداروں سے تو آئندہ ترقی کے صرف بڑے بڑے وعدے ہی کیے مگر سپاہیوں کی تنخواہ حقیقتاً بڑھا دی بلکہ بطور ثبوت صداقت اپنے وعدوں اور اظہار سیر چشمی کے فوراً تین مہینے کی تنخواہ بطور پیشگی دیدی اور اس تدبیر سے میر جملہ کی فوج اُس مہم میں شریک ہونے کو راضی ہوگئی جو اورنگ زیب کے مدِنظر تھی اور اب اُس کے پاس لڑنے بھڑنے کے لائق اچھی خاصی جمعیت ہو گئی۔

اورنگ زیب کی سورت روانگی اس کے بعد اورنگ زیب نے سورت کی طرف کوچ کیا کیونکہ اہل قلعہ خلافِ توقع اب تک مراد بخش کی فوج سے مغلوب نہ ہوئے تھے اور اورنگ زیب کا مدعا یہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ قلعہ فتح ہو جائے لیکن اُس نے کوچ سے چند روز بعد یہ خبر پائی کہ وہ فتح ہوگیا۔ پس اُس نے مبارکباد کا خط مراد بخش کو تحریر کیا اور اُس میں میر جملہ کے ساتھ گذرے ہوئے واقعات تحریر کیے اور لکھا کہ "میں نے ایک جرار فوج جمع کر لی ہے اور خزانہ بھی بافراط موجود ہے اور عمائد وامرائے دربار شاہی سے بھی سب طرح پخت و پز ہو چکی ہے اور برہم پور[1] اور آگرہ کی طرف چل پڑنے میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :۔ ثروت وحشمت سب قابو میں کر لیا گیا اور اُس کے لو کر چاکر اور فوج لو کر رکھ لی گئی۔ اور ان خزانوں اور مال اور سپاہ کے ہاتھ آجانے سے اورنگ زیب بخوبی اس بڑی مہم کے انجام دینے کے قابل ہو گیا۔ اور چونکہ اُس نے اب تک پردہ نہیں اُٹھایا تھا باپ کو یہ لکھ بھیجا کہ فدوی کو معظم خاں کے اوضاع واطوار سے بے وفائی اور روگردانی کی بو آتی تھی اس لئے میں نے اُس کو پکڑ کر قید کر دیا ہے اور اگر ایسا نہ کرتا تو بے شبہ وہ بھاگ کر پھر دکن کے سرداروں سے جا ملتا۔ (ماخوذ از سیر المتاخرین وتاریخ عاقل خاں) س م ع

[1] اصل کتاب میں جابجا برہم پور لکھا ہے مگر صحیح نام برہان پور ہے۔ اس لئے آئندہ اس ترجمہ میں برہان پور

اب میری طرف سے کچھ دیر نہیں ہے اور التجا کی کہ آپ کوچ میں دیر نہ کیجئے اور دونوں لشکروں کے مل جانے کے لئے کوئی جگہ قرار دے کر جلد مطلع کیجئے۔

قلعہ سورت کا خزانہ قلعہ سورت میں خلاف مراد تھوڑا سا خزانہ ملنے سے مراد بخش بہت ناامید ہوا۔ اس کمی کا سبب یا تو یہ تھا کہ محض مبالغہ آمیز افواہوں سے اس کی اس قدر کثرت مشہور ہو گئی تھی یا یہ وجہ تھی (جیسا کہ عموماً لوگوں کو شبہ تھا) کہ وہاں کے قلعہ دار نے بہت سا خورد برد کر لیا تھا بہر حال. جو روپیہ مراد بخش کے ہاتھ لگا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ اس سے فقط اُن سپاہیوں کی تنخواہ دے سکا جو اس طمع پر نوکر رکھ لئے گئے تھے کہ سورت سے بہت سا مال و دولت ہاتھ آئے گا۔

قلعہ کی فتح کا راز سورت کے محاصرے اور اُس کے فتح کرنے کی تدبیروں میں مراد بخش کی کوئی جنگی لیاقت ظاہر نہیں ہوئی۔ کیونکہ باوصف اس کے کہ قلعہ کی فصیلیں جیسی چاہئیں جنگی قاعدہ کے مطابق خوب مستحکم نہ تھیں۔ پھر بھی باوجود بہت بڑی کوششوں اور عرق ریزیوں کے اہل قلعہ ایک مہینے تک برابر لڑا کئے اور جب تک کہ ڈچ قوم کے فرنگیوں نے سرنگ لگانے کی حکمت نہ سکھلائی محاصرہ وغیرہ سے کچھ فائدہ نہ ہوا البتہ جب اُن کی پہلے[1] ہی پہل کی سکھائی ہوئی تدبیر سے قلعہ کی فصیل کا ایک بڑا حصہ اُڑا دیا گیا تو محصوروں نے متحیر ہو کر اور بعض شرطیں لے کر قلعہ حوالہ کر دیا۔

اس فتح سے مراد بخش کا بڑا نام ہو گیا اور جو باتیں اُس کے پیش نظر تھیں اب اُن کی دُرستی میں بڑی آسانی ہو گئی اور چونکہ سرنگ لگانے کی تدبیر سے یہاں کے لوگ بخوبی واقف نہ تھے اس لئے مراد بخش کی اس نئی حکمت نے لوگوں کے دلوں پر بہت ہی عجیب اثر کیا۔ اس کے علاوہ یہ بات علی العموم مشہور ہو گئی کہ سورت کا بہت سا دفینہ مراد بخش کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لکھا جائے گا۔ یہ شہر اُس وقت صوبہ خاندیس کا دارالحکومت تھا اور دکن کا دروازہ سمجھا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں ناگپور کی چیف کمشنری میں ضلع نماڑ کے متعلق ایک تحصیل کا مقام ہے یہ دریائے تاپتی کے کنارے آباد ہے۔ اور قریب تیس ہزار کی آبادی ہے۔ س م ح۔

[1] یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس واقعہ سے چھبیس[2] ستائیس برس پہلے ایک ہزار بیالیس ہجری میں شاہجہاں کے سرداروں نے پرتگیزوں پر بمقام ہوگلی سرنگ ہی اڑا کر فتح پائی تھی جس کا حال ہم آئندہ ایک اور مقام پر کتاب بادشاہ نامہ سے نقل کریں گے۔ س م ح

ہاتھ آگیا ہے۔

مراد کو شہباز خواجہ سرا کا مشورہ

لیکن باوجود اس تمام شہرت اور ناموری کے جو اس فتح سے حاصل ہوئی تھی اور باوصف اورنگ زیب کے بہت سے خوشامد آمیز اور ابلہ فریب وعدوں کے شہباز خواجہ سرا مراد بخش کو یہی سمجھاتا رہا کہ آپ بھائی صاحب کی فضول باتوں پر ہرگز بھروسہ اور اعتبار نہ کریں اور جلد بازی کر کے ان کے قابو میں نہ آجائیں اور اس خیرخواہ خواجہ سرا نے صاف کہہ دیا کہ "آپ اب بھی میری صلاح مان لیں اور اگر آپ کی ایسی ہی مرضی ہے تو خیر اورنگ زیب کو چکنی چپڑی باتوں میں پھسلائے رکھیں لیکن فوج اور لشکر سمیت اُس سے جا کر شامل ہو جانے کا ارادہ ہرگز نہ فرمائیں اور بالفعل آگرہ کی طرف اُس کو اکیلا ہی جانے دیں رفتہ رفتہ جب ہم کو بادشاہ کی صحت اور مرض کی پختہ خبریں اور صحیح حالات معلوم ہو جائیں گے تو اُس وقت جو مصلحت معلوم ہو گی اُس پر عمل کیا جائے گا اور اس عرصہ میں آپ قلعہ سورت کا استحکام کر لیں جو ان اطراف میں سب سے زیادہ کارآمد مقام ہے۔ اور اس جگہ کے قابو کر لینے سے ایک وسیع سیرحاصل اور زرخیز ملک کی حکومت آپ کے ہاتھ آجائے گی اور پھر تھوڑی سی تدبیر سے شہر برہان پور بھی جو صوبہ دکن کا دروازہ اور نہایت کارآمد مقام ہے آپ کے قبضہ میں آجائے گا۔" مگر چونکہ مراد بخش کے پاس اورنگ زیب کے خطوط برابر چلے آتے تھے اُس نے اپنا ارادہ ترک نہ کیا اور بیچارے شہباز کی صلاح نہ مانی۔ یہ دانا اور دوراندیش امیر نہایت ہی سچا ناصح اپنے آقا کا دلی خیرخواہ تھا۔ پس اس جوان شاہزادہ کے حق میں بہت ہی بہتر ہوتا اگر اُس کی معقول صلاح کو مان لیتا۔ لیکن اول تو بادشاہ بن جانے کے بے حد شوق ہی میں مراد بخش اندھا ہو رہا تھا۔ اور اس پر اُس کے مکار بھائی کے خط جو جان فشانی اور ہواخواہی کے وعدوں کے اظہار میں روزمرہ چلے آتے تھے بڑے محرک تھے اس کے علاوہ اُس نے یہ بھی سوچا کہ یہ مہم جس میں بادشاہی اور سلطنت حاصل ہو جانے کی اُمید ہے۔ مجھ سے اکیلے انجام نہ پا سکے گی۔ اس لئے اُس نے احمد آباد سے جہاں وہ ڈیرے ڈالے پڑا تھا کوچ کر دیا۔ اور گجرات سے روانہ ہو کر پہاڑوں اور جنگلوں کا سیدھا راستہ اختیار کیا تاکہ جلدی سے اس جگہ پہنچ سکے جہاں اورنگ زیب چند روز پہلے سے اُس کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات

القصہ جب دونوں لشکر مل گئے[1] تو بڑی خوشیاں اور جشن منائے گئے۔ اور اورنگ زیب نے اپنی محبت کے پائدار اور مستحکم اقرار از سرِ نو تازہ کئے اور اپنی کمال بے غرضی اور بے طمعی کا اظہار کیا۔ اور دونوں بھائی کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوتے تھے اور اورنگ زیب بار بار یہی جتاتا تھا کہ بادشاہی اور سلطنت کی تو مجھے ذرا بھی ہوس نہیں اور یہ فوج کشی میں نے صرف اس واسطے کی ہے کہ جس طرح بن پڑے داراشکوہ سے جو میرا اور آپ کا کھلا دشمن ہے۔ لڑبھڑ کر آپ کو تختِ سلطنت پر جو خالی پڑا ہے بٹھادوں جس زمانے میں دونوں فوجیں تخت کی طرف جارہی تھیں۔ اورنگ زیب ہمیشہ حاضر وغائب خاص وعام کے روبرو جس طرح پر کہ یہاں کی رعایا کے لوگ بادشاہ کو حضرت کہکر بولتے ہیں۔ مراد بخش کو یہی لفظ کہکر مخاطب کرتا تھا اور ہر موقعہ پر بڑی تعظیم اور تکریم سے پیش آتا تھا۔ اور فی الواقع یہ بات نہایت عجیب ہے کہ مراد بخش نے اورنگ زیب کے خلوص نیت پر کچھ بھی شبہ نہ کیا اور وہ علانیہ دغابازی جو گولکنڈا کے معاملہ میں وہ ابھی کرچکا تھا ایسی صریح بات سے بھی اُس کے دل پر ذرا اثر نہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ یہ شاہزادہ اپنی خیالی سلطنت کی ہوس میں ایسا اندھا ہورہا تھا اور عقل پہ ایسا پردہ پڑگیا تھا کہ اتنی موٹی بات بھی اُس کی سمجھ میں نہ آئی کہ جو شخص کل اس قدر بے ایمانی کے ساتھ ایک سلطنت کے چھین لینے کے لئے کوشش کرچکا ہے۔ آج کس طرح ممکن ہے کہ اُس کے خیالات ایسے بدل گئے ہوں کہ بجز فقیرانہ گذران کرنے کے اُس کی کچھ اور آرزو ہی نہیں ہے۔

فوجوں کا آگرہ کی طرف کوچ

اب ان متفقہ فوجوں نے ایک بڑی شان وشوکت پیدا کی اور اُن کے کوچ کی خبریں سُن کر پائے تخت میں ایک

---

[1] فارسی زبان کی تاریخوں میں لکھا ہے کہ شاہجہاں کی بیماری کے شروع سے ایک برس بعد یکم جمادی الاول ۱۰۶۸ھ ہجری میں اورنگ زیب نے باپ کی عیادت کے بہانے سے دولت آباد سے برہان پور کی طرف کوچ کیا تھا اور مراد بخش کو ساتھ لینے کی نسبت یہ حیلہ بنایا تھا کہ سکہ اور خطبہ وغیرہ جاری کرنے کی بے ادبی جو اُس سے ہوگئی ہے اس لئے اُس کو خطا معاف کرانے کی خاطر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ اور یہ دونوں شاہزادے بمقام تالاب دیال پور اُجین سے تقریبًا ۸ فرسنگ کے فاصلہ پر ملاقی ہوتے تھے۔ س م ح

تہلکہ پڑ گیا۔ اور داراشکوہ تو اس قدر مشوش اور مضطرب ہوا کہ جس کی انتہا نہیں۔ اور انجام کار پر نظر کر کے شاہجہاں بھی ڈر گیا۔ اور اگرچہ اپنے خیال میں اس فساد کے حالیہ نتائج کی نسبت اُس نے کچھ ہی اندازہ کیا ہو۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ اورنگ زیب کی قابلیت اور دانائی اور مرادبخش کے تہور اور شجاعت کے متفق ہو جانے سے ایسا کوئی امر نہیں ہے کہ جو ناممکن الوقوع ہو۔

شاہجہاں نے ہرچند اُن کے پاس قاصد پہ قاصد یہ پیغام دے کر روانہ کئے کہ مابدولت کو اب آرام اور افاقہ ہے۔ اور اگر تم اپنے صوبوں کو لوٹ جاؤ گے تو تمھاری اس حرکت سے چشم پوشی کی جائے گی اور داخل نافرمانی نہ سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ سب تحریریں اور احکام بے فائدہ تھے اور متفقہ فوجیں برابر بڑھی چلی آتی تھیں۔ اور چونکہ بادشاہ کی علالت واقعی مہلک سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے یہ اپنے وہی عذر اور بہانے کئے جاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ خط خطوط شاہی مُہریں لگ کر آتے ہیں وہ جعلی اور بالکل داراشکوہ کی بناوٹ اور ایجاد ہیں۔ اور "حضرت" یا تو مر چکے یا قریب المرگ ہیں۔ اور بالفرض اگر ہماری خوش نصیبی سے وہ زندہ ہیں تو ہم اُن کی قدم بوسی کے مشتاق ہیں۔ اور داراشکوہ نے جو اُنھیں ہر طرح سے بے بس اور بے اختیار کر رکھا ہے اِس حالت سے بھی ہم اُن کو نکالنا چاہتے ہیں۔

شاہجہاں کی مجبوریاں

ان دنوں شاہجہاں کا فی الواقع بہت بُرا حال تھا اور علاوہ شدائد اور تکالیف مرض کے وہ حقیقتاً داراشکوہ کے پنجہ سرکشی میں پھنسا ہوا تھا۔ اور ادھر تو داراشکوہ کے دل میں قہر و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی اور لڑائی کے سوا کچھ خیال ہی نہ تھا اور مستعدی کے ساتھ تیاری کر رہا تھا اور اُدھر شاہجہاں کے دوسرے بیٹے باپ کے تاکیدی اور متواتر احکام پر مطلقاً لحاظ اور التفات نہ کر کے برابر آگرہ کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے اور ایک طرف بیچارے بادشاہ کو یہ فکر تھی کہ اگر میرے جمع کئے ہوئے دفینے اور خزانے ان نوجوان شاہزادوں کے ہاتھ آ جائیں گے تو خدا جانے کس کس طرح اڑا کر برباد اور تلف کر دیں گے۔

شجاع کی پیش قدمی

غرض کہ جب اس بڈھے بادشاہ کو کوئی چارہ باقی نہ رہا تو اُس نے مجبور ہو کر اپنے وفادار جنگ آزمودہ اور کار آگاہ سرداروں

کو اپنے پاس طلب کیا۔ اگرچہ یہ امرا دارا شکوہ سے اکثر ناموافق تھے اور بادشاہ کو بھی اُس کی بہ نسبت اپنے تینوں حملہ آور بیٹوں سے زیادہ محبت تھی۔ لیکن مصلحتِ وقت کا کچھ اور تقاضہ تھا۔ اس لئے اُنھیں امیروں کو جو اکثر اُس سے ناراض تھے اپنے باغی بیٹوں کے مقابلہ پر سرلشکر بنا کر بھیجنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس بات کا لحاظ کرکے کہ جدھر سے شجاع بڑھا چلا آتا تھا اُدھر کا زیادہ اندیشہ تھا۔ ایک فوج تو فوراً اُس کے مقابلہ کے واسطے روانہ کی گئی اور ایک دوسری فوج اس غرض سے تیار اور جمع کی گئی کہ بشرط ضرورت اورنگ زیب اور مراد بخش کی متفقہ فوج سے جنگ کرے۔ چنانچہ دارا شکوہ کا بڑا بیٹا سلیمان شکوہ اس فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا جو شجاع کے مقابلہ کے واسطے بھیجی گئی تھی۔ اس کی عمر قریب پچیس برس تھی اور بڑا خوبصورت اور وجیہ اور سخی شاہزادہ تھا۔ سب لوگ اسے پسند کرتے تھے اور قابلیت ولیاقت میں بھی بہت خاصہ تھا۔ شاہجہاں کو بھی اپنے اِس پوتے سے بہت محبت تھی اور اُس نے کئی بار اس کو بہت سامال ودولت دیا تھا بلکہ یہ ارادہ تھا کہ دارا شکوہ پر اس کو ترجیح دے اور اپنا ولی عہد مقرر کرے۔

شجاع کی شکست چونکہ شاہجہاں کا اصل مطلب یہ تھا کہ اس غیر طبعی اور ناحق کے فساد میں حتی الامکان خونریزی نہ ہونے پائے اس لئے اُس نے ایک مسن راجہ کو جس کا نام جے سنگھ[۱] ہے اور جو اس وقت کے راجاؤں میں سب سے زیادہ دولت مند اور غالباً ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ قابل شخص ہے بطور مشیر خاص اپنے پوتے کے ہمراہ روانہ کیا۔ اور اُس کو پوشیدہ طور پر یہ ہدایت کی کہ حتی الامکان جنگ نہ ہونے دینا اور شجاع کو سمجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا کہ وہ اپنے متعلقہ صوبہ کو لوٹ جائے بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اُس سے کہہ دینا کہ "ارشاد شاہی کے مطابق واپس چلے جانا تم پر صرف فرض وواجب ہی نہیں بلکہ فن حکومت وسلطنت کی رو سے بھی یہ امر نہایت ضروری ہے کہ تم بہر صورت اپنے زور وطاقت کا اظہار نہ کرو اور جب تک کہ ایک ٹھیک اور مناسب

---

[۱] راجہ جے سنگھ کچھواہا رئیس جے پور سے مراد ہے جس کو لفظ راجہ کے علاوہ شاہی خاندان کے شاہزادوں کی طرح مرزا کا معزز خطاب بھی ملا ہوا تھا واضح ہو کہ جے پور کی ریاست ہمارے اس زمانہ میں بھی کچھواہا قوم ہی کے راجپوت خاندان میں قائم ہے اور خالص آمدنی اس ریاست کی سوائے جاگیروں اور معافیات کے سینتالیس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے اور پچیس ہزار دو سو پاون میل مربع رقبہ ہے جس میں تقریباً بیس لاکھ آدمی بستے ہیں۔ س م ح

موقعہ اس کام کا نہ آجائے یعنی تاوقتیکہ ہماری بیماری منجر بہ ہلاکت نہ ہو جائے یا اورنگ زیب اور مراد بخش کی متفقہ فوجوں کا کچھ انجام نہ معلوم ہو چکے ایسی جلد بازی تمھارے لئے مصلحت نہیں ہے "۔

لیکن جے سنگھ کی کوششیں انسداد جنگ کے باب میں سب بے سود رہیں کیونکہ ادھر تو سلیمان شکوہ بلند حوصلگی اور نوجوانی کے نشہ میں جنگ جوئی کی اُمنگ اور ناموری کے شوق سے بیتاب ہو رہا تھا۔ اُدھر شجاع کو یہ خیال تھا کہ اگر کوچ میں دیر کروں گا تو اغلب ہے کہ اورنگ زیب داراشکوہ کو مغلوب کرکے دارالسلطنت آگرہ اور دلی پر قابض ہو جائے، پس جوں ہی دونوں فوجیں ایک دوسرے کو دکھائی دینے لگیں فوراً دونوں طرف سے دنادن گولہ اندازی شروع ہو گئی۔

لیکن میں اس مقام پر ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس لڑائی کے حالات بہ تفصیل بیان کروں۔ کیونکہ اُس دوسری لڑائی کے واقعات جو اس سے زیادہ اہم ہیں بیان کرنے ہیں اور ناظرین کے لئے یہاں پر صرف اتنا لکھدینا کافی ہے کہ دونوں طرف سے بڑی سختی اور سرگرمی سے حملے ہوئے اور ایک بڑی کوشش کے بعد سلطان شجاع کو ایسا مغلوب ہونا پڑا کہ آخر کار سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلا۔ اور یقین ہے کہ اگر جے سنگھ اور اُس کا دلی دوست دبیر خاں[1] پٹھان جو بڑا بہادر سپاہی تھا قصداً پیچھے نہ ہٹے رہتے تو فوج مخالف بالکل تباہ ہو جاتی بلکہ خود شجاع بھی گرفتار ہو جاتا۔ لیکن راجہ نے ازراہ دانائی مناسب نہ جانا کہ شاہی خاندان کے شاہزادے اور اپنے آقا کے بیٹے پر ہاتھ ڈالے اور یہ بھی ہے کہ اُس نے شجاع کو بھاگ جانے کی مہلت دینے میں بادشاہ کی ہدایتوں پر

[1] فارسی زبان کی تاریخوں میں جے سنگھ کے ساتھ دوسرے امیر کا نام بہادر خاں لکھا ہے اور دبیر خاں تو صریح غلط ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلیر خاں کی جگہ غلطی سے دبیر خاں چھپ گیا ہے۔ کیونکہ انگریزی میں حرف لام اور رے کی شکل قریب قریب ہے۔ مرزا محمد کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے کہ باقی بیگ المخاطب بہ بہادر خاں جو داراشکوہ کے عمدہ نوکروں میں سے تھا اُس کو اس مہم میں داراشکوہ نے سلیمان شکوہ کے ساتھ بطور اتالیق کے بھیجا تھا۔ اور اپنی کل فوج کی سرداری بھی اُسی کے حوالہ کی تھی۔ اور اُسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دلیر خاں بھی ایک امیر منجملہ اُن نامور اُمرا کے تھا جو اس مہم میں سلیمان شکوہ کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ س م ح

عمل کیا۔ اس شکست میں اگرچہ شجاع کا کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ میدان سلیمان شکوہ کے ہاتھ رہا اور چند توپیں بھی اُس کے قبضہ میں آگئی تھیں اس لئے دربار شاہی میں یہ خبر عام ہو گئی کہ سلیمان شکوہ نے کامل فتح پائی اور اس سے سلیمان شکوہ کی نیک نامی اور شجاع کی بڑی بدنامی ہوئی اور اُن ایرانی امرائے دربار کی سرگرمی اور دل سوزی پر بھی جو شجاع کی طرف داری کرتے تھے اوس پڑ گئی۔

سلیمان شکوہ کی واپسی سلیمان شکوہ ابھی شجاع کے تعاقب میں لگا ہوا تھا کہ خبر ملی کہ اورنگ زیب اور مراد بخش بڑی مستعدی اور استقلال سے آگرہ کی طرف بڑھے آتے ہیں۔ اب چونکہ اس کو اپنے باپ کی عقل و دانش کا اندازہ بخوبی معلوم تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کے گرد و پیش پوشیدہ دشمن جمع ہیں اس لئے کمال دور اندیشی سے آگرہ کو واپس آنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ ظن غالب یہی تھا کہ دارالسلطنت کے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں داراشکوہ اُن سے لڑے گا۔ سب لوگ متفق الرائے ہیں کہ سلیمان شکوہ کی یہ تجویز بہت ہی دانائی اور ہوشیاری کی تھی اور اگر یہ نوجوان شہزادہ اپنی فوج سمیت بروقت پہنچ جاتا تو اورنگ زیب ان کی ایسی بڑی فوجوں سے ٹکر لینے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا بلکہ شاید مقابلہ ہی نہ کرتا۔

شاہی فوج کی روانگی باوجود اس کامیابی کے جو سلیمان شکوہ[1] کی سپاہ کو بمقام الہ آباد (جہاں جمنا اور گنگا باہم ملتی ہیں) حاصل ہو چکی تھی

[1] عالمگیر نامہ میں اس واقعہ کو یوں لکھا ہے اور اُس وقت کی اور کتابوں سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ کچھواہا جو شجاع کے مقابلہ کو چوتھی ربیع الاول ۱۰۶۸ ہجری کو آگرہ سے روانہ ہوئے تھے اُنھوں نے کوچ بہ کوچ بہادر پور میں پہنچ کر جو بنارس سے ڈھائی کوس آگے گنگا کے کنارہ پر ایک گاؤں ہے شجاع کے لشکر سے ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر ڈیرہ کیا تھا جو بنگالہ کے لواڑے یعنی کشتیوں کے بیڑہ کو ساتھ لئے ہوئے دریا کے کنارے ٹھیرا ہوا تھا اور فوج کو ذرا آرام دے لینے کے بعد دھوکا دینے کی غرض سے یہ مشہور کرکے کہ لشکر کی جائے قیام بدلنا چاہتے ہیں اکیسویں جمادی الاول کو علی الصباح شجاع کے لشکر پر ناگہاں حملہ کر دیا اور چونکہ اُس نے غفلت کے سبب سے اپنی فوج کی صف بندی بھی نہ کی تھی خفیف سے مقابلہ کے بعد لڑائی ہار گیا۔ اور لواڑے میں بیٹھکر پیچھے کو بھاگا اور تمام مال و اسباب لٹ گیا۔ اور اس کے بعد سلیمان شکوہ نے اول پٹنہ اور پھر مونگیر سے نکال دیا

یہاں آگرہ کی طرف معاملات کی کچھ اور ہی صورت تھی۔ یعنی جب دارالسلطنت میں یہ خبر پہنچی کہ اورنگ زیب برہان پور کے پاس دریا کے پار اُتر آیا ہے۔ اور اُن دشوار گزار پہاڑوں کی گھاٹیوں کو بھی بزور طے کر چکا ہے جن پر ہر طرح سے مزاحمت اور بچاؤ کا بہت بڑا بھروسہ تھا تو دربار میں بڑی گھبراہٹ اور حیرانی پیدا ہوئی اور فوج کی تیاریاں شروع ہوئیں مگر بڑی جلد بازی کے ساتھ سب سے پہلے فوراً ایک دستہ اس مقصد سے اُجین بھیجا گیا کہ جلدی سے پہنچ کر دریا کے گھاٹ[1] کو روک لیں اور مخالفوں کو پار اُترنے سے روکیں اور اس پیش رو دستہ کی سرداری کے واسطے دو امیر جو نہایت با اقتدار اور لائق و فائق تھے انتخاب کئے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام قاسم خاں تھا جو بڑا ہی مشہور و معروف سپاہی اور شاہجہاں کا دلی خیر خواہ تھا۔ لیکن یہ چونکہ دارا شکوہ سے متنفر اور بیزار تھا اس لئے اُس نے یہ سرداری بخوشی اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ شاہجہاں کے حکم کی تعمیل تھی۔ دوسرا سردار راجہ جسونت سنگھ تھا جو درجہ اور اقتدار میں جے سنگھ سے کم نہ تھا۔ یہ راجہ اُس زبردست[2] رانا کا داماد تھا جو اکبر کے زمانہ میں سب راجاؤں کا مہاراجہ گنا جاتا تھا۔ دارا شکوہ نے ان دونوں سرداروں سے نہایت تملق اور شیریں زبانی سے گفتگو کی اور جب وہ لشکر میں جانے لگے تو بڑے بڑے بھاری خلعت اُن کو دیئے مگر شاہجہاں نے جو ہدایتیں شجاع کے بارہ میں راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کو کی تھیں ویسے ہی احتیاط سے کام کرنے کی بابت ان کو بھی کیں۔

اورنگ زیب کے مقابلہ میں شاہی فوج کی کارروائیاں

لیکن جب کہ اس طرف اس قسم کے تامل و تذبذب ہو رہے تھے! اورنگ زیب کی طرف مستعدی کے ساتھ لڑائی کی پوری تیاری تھی چنانچہ بادشاہ کی نصیحت اور ہدایت کے مطابق جو قاصد متواتر یہ پیام دے کر اُس کے پاس بھیجے جاتے رہے کہ آپ کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ اور وہ مجبور ہو کر اپنے اصلی صوبہ یعنی بنگالہ کو چلا گیا۔ اور مونگیر سے پٹنہ تک دارا شکوہ کا قبضہ ہو گیا۔ لکھا ہے کہ ان لڑائیوں میں شجاع کے نوکروں میں سے جو لوگ قید ہو گئے تھے دارا شکوہ نے اُن کو آگرہ میں منگوا کر اول تشہیر وغیرہ سے بے عزت کیا اور پھر اُن کے ہاتھ قلم کرا دیئے جس کے باعث سے کتنے ہی بیچارے اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ م ع

[1] اس دریا سے شیپرا ندی مراد ہے جس کا اصل سنسکرت زبان کا نام گھشیپرا ہے۔ س م ع

[2] اودے پور کا رانا مراد ہے۔ س م ع

دکن کو لوٹ جانا چاہیے اُن میں سے کوئی بھی واپس آنے نہ پایا۔ بلکہ واپسی کے بجائے اُس کی فوج یکایک ایک بلند ٹیلہ پر جو دریا سے[1] تھوڑے فاصلہ پر تھا۔ نمودار ہوئی۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا اور سخت دھوپ پڑتی تھی اور اس وجہ سے دریا پایاب ہو رہا تھا۔ قاسم خاں اور راجہ نے یہ خیال کر کے کہ اورنگ زیب پار اُترنا چاہتا ہے، لڑائی کی تیاری کر دی۔ لیکن واقع میں اورنگ زیب کی پوری فوج ابھی پیچھے تھی۔ اور اس تھوڑی سی سپاہ کو آگے بھیج دینا بالکل ایک دھوکا تھا۔ کیونکہ اورنگ زیب کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں بادشاہی فوج دریا کے پار نہ اُتر آئے جس سے ہمارا پانی بند ہو جائے اور وہ ہماری تھکی ماندی فوج پر حملہ کر دے اور اس طرح پر جنگ کا مفید موقعہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے۔ اور اُس کا یہ اندیشہ حقیقت میں درست تھا۔ کیونکہ اُس وقت اُس کی فوج مقابلہ کے لائق نہ تھی اور اگر قاسم خاں اور راجہ حملہ کر دیتے تو بآسانی غالب ہو سکتے تھے۔ میں اس موقعہ پر بذاتِ خود موجود نہ تھا۔ لیکن جن لوگوں نے اس لڑائی کو دیکھا ہے خصوصًا وہ فرانسیسی افسر جو اورنگ زیب کے توپ خانہ میں ملازم تھے اُن سب کی یہی رائے ہے۔ مگر یہ سردار ایسا کس طرح کرتے کیونکہ بادشاہ کے مخفی احکام کے باعث صرف اتنا ہی کر سکتے تھے کہ دریا کے وار اپنا مورچہ جمائیں اور اگر اورنگ زیب دریا سے بزور اُترنا چاہے تو روکیں۔

اورنگ زیب کی پہلی فتح

القصہ جب اورنگ زیب کی فوج نے دو تین روز دم لے لیا تو دریا سے بزور اُترنے کی تیاری کر دی۔ چنانچہ پہلے تو اُس نے اپنا توپ خانہ ایک بلند جگہ پر قائم کیا۔ اور پھر فوج کو حکم دیا کہ توپوں کی پناہ میں آگے بڑھے۔ مگر ان کی پیش قدمی روکنے کے لئے اس طرف سے بھی توپیں چلنی شروع ہوئیں اور اگرچہ ابتدا میں سخت جوش و خروش اور سرگرمی سے مزاحمت کی گئی۔ اور جسونت سنگھ نہایت ہی شجاعت اور دانائی کے ساتھ حملہ آوروں کو ہر ہر قدم پر روکتا رہا مگر قاسم خاں نے باوجودیکہ اُس کی سپاہ گری اور بہادری میں کسی کو کلام نہیں اس موقعہ پر نہ تو کچھ بہادری ہی دکھائی اور نہ کچھ سپاہیانہ دانائی ہی ظاہر کی بلکہ اُس پر دغابازی اور سازش کا شبہ[2]

[1] مصنف نے دریا کا نام نہیں لکھا مگر مترجم انگریزی نے حاشیہ میں نربدا لکھ دیا ہے جو صریح غلط ہے کیونکہ اُجین کے پاس تو وہی شپیرا ندی ہے۔ جس کا ذکر ہم ابھی ایک حاشیہ میں کر چکے ہیں۔ س م ح

[2] خافی خاں کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ س۔م۔ح

ہے ۔ کیونکہ اُس نے لڑائی سے پہلے ہی رات کے وقت اپنا بہت سا بارود گولہ ریت میں چھپا دیا تھا جس کے سبب سے صرف چند باڑیں چلانے کے بعد فوج کے پاس یہ سامان نہ رہا ۔ خیر اس کی اصل خواہ کچھ ہی ہو مگر لڑائی بہر حال بہت سخت ہوئی اور گھاٹ کے روکنے میں سپاہ نے بڑی شجاعت دکھائی ۔ اُدھر اورنگ زیب کی فوج کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پتھروں کی وجہ سے جو دریا کے پاٹ میں تھے اُس کو سخت تکلیف پہنچی اور کناروں کی بے ڈھب بلندی کے باعث سے اوپر چڑھنا سخت مشکل تھا ۔ مگر مراد بخش کی تیزی اور شجاعت ان سب دشواریوں پر غالب آئی ۔ اور وہ اپنی خاص فوج کے ساتھ دریا کو عبور کر آیا اور آخرکار باقی سپاہ بھی پیچھے سے بہت جلد آ پہنچی ۔ اس وقت قاسم خاں بڑی بدنامی کے ساتھ میدان سے بھاگ نکلا ۔ اور جسونت سنگھ کو صریح جان جوکھوں میں چھوڑ گیا ۔ اب اگرچہ اس بہادر راجہ پر چاروں طرف سے دشمن کی فوج ٹوٹ پڑی ۔ مگر اُس کے شجاع اور بہادر راجپوتوں نے اسے اپنی جانیں لڑا کر بچا لیا ۔ اور ایسا جان توڑ کر لڑے کہ آٹھ ہزار میں سے لڑائی کے خاتمہ پر صرف پانچ سو کے قریب باقی رہ گئے ۔

اس واقعہ کے بعد راجہ نے آگرہ جانا مناسب نہ جانا اور ان بچے کھچے وفادار سپاہیوں کے ساتھ سیدھا اپنی ریاست کو چلا گیا[1]۔

---

[1] ہندوستانی مورخوں نے ان واقعات کو یوں بیان کیا ہے کہ جب مراد بخش کے بادشاہ بن بیٹھنے کی خبر آگرہ میں پہنچی تو اُس کو گجرات کی صوبہ داری سے معزول کئے جانے اور ملک برار میں جو پہلے سے اورنگ زیب کی جاگیر میں تھا (غالبًا دونوں کے بھڑانے کی خاطر) جاگیر دے کر صرف اُس پر قناعت کرنے کا حکم دارا شکوہ نے بادشاہ سے دلوا دیا تھا ۔ اور اس کے ساتھ ہی قاسم خاں میر آتش اُس کی جگہ گجرات کی صوبہ داری پر نامزد کیا گیا تھا ۔ اور چونکہ مالوہ کا صوبہ دار شائستہ خاں (دہی جو ان چاروں شاہزادوں کا حقیقی ماموں تھا) اورنگ زیب کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتا تھا اس کا بھی اُجین میں کہ کے راستہ پر رہنا مناسب نہ جان کر اس کی جگہ اپنے دلی خیر خواہ مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور جودھپوریا کو اس مراد سے بھجوا دیا تھا کہ اورنگ زیب جو اس وقت تک بظاہر خاموش تھا اگر وہ بھی (جیسے کہ دارا شکوہ کو اُس سے توقع تھی) کچھ حرکت کرے تو راجہ قاسم خاں کی مدد سے اُس کا سد راہ ہو ۔ اور اگر بدستور خاموش رہے تو قاسم خاں مراد بخش کو گجرات سے برار کی طرف نکال دے اور جسونت سنگھ بشرط ضرورت اُس کی مدد

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ یہ کرے۔ چنانچہ ان دونوں کو اب تک یہی خبر تھی کہ مراد بخش گجرات سے مالوہ کے راستہ آگرہ کی طرف بڑھا آ رہا ہے اور اس خیال میں اُجین سے بانس بڑلہ[1] کے راستہ روانہ ہو کر بمقام کاچ رودہ[2] بزعم خود اس کا راستہ روکے پڑے تھے۔ اور اگرچہ اورنگ زیب خاندیس کی دارالحکومت برہانپور سے بھی چل کر اور اکبر پور کے گھاٹ نربدا سے پایاب اتر کر مالوہ میں داخل ہو گیا۔ اور دیال پور کے قریب مراد بخش بھی اُس سے آملا مگر راستوں اور گھاٹوں کو جو اُس نے نہایت ہوشیاری سے روک رکھا تھا ان کے ان کو مطلقًا اُس کے ایسے نزدیک پہنچ جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اُس نے پادشاہی سپاہ کی کثرت کے اندیشہ سے جو مراد بخش کو یہ لکھ بھیجا تھا کہ میرے آنے تک جلدی کر کے ان سے بھڑ نہ جانا۔ اور وہ اس وجہ سے کاچ رودہ سے صرف اٹھارہ کوس کے فاصلہ پر پہنچ جانے کے بعد پیچھے کو ہٹ کر دیال پور کی طرف چلا گیا تھا تو انھوں نے اپنے خیال میں اس کو اُس کے بھاگ جانے پر محمول کر کے بادشاہ کو مبارکباد کی عرضی کر دی تھی اور بادشاہ بھی کسی قدر مطمئن ہو کر اٹھارھویں رجب ۱۰۶۸ھ کو معہ دارا شکوہ تبدیل آب وہوا اور آگرہ کی گرمی سے بچنے کے لئے اپنے طبیبوں کی صلاح کے موافق دگر دارا شکوہ کی مرضی کے برخلاف دہلی کو چلا گیا تھا۔ مگر جب یہ دونوں لشکر آن کر باہم مل گئے اور راجہ شیورام گوڑ نے جو قلعہ مانڈو میں تھا اور داراشکوہ کے ان نوکروں نے جو دھار کے قلعہ سے اورنگ زیب کے نزدیک آ پہنچنے سے خوف زدہ ہو کر مہاراجہ کے لشکر میں بھاگ آئے تھے جسونت سنگھ کو اطلاع دی تو اس وقت اس کی آنکھیں کھُلیں اور کاچ رودہ سے پیچھے ہٹ کر دھرمات پور کے متصل جو اجین سے سات کوس کے قریب ہے اورنگ زیب کے لشکر سے ایک کوس کے فاصلہ پر اس کا راستہ آ روکا۔ اب چونکہ اورنگ زیب کا اصل مقصود یہ تھا کہ اگر ہو سکے تو راجہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لے۔ اور پیغام سلام کے حیلہ سے اپنے تھکے ماندے لشکر کو ذرا آرام دے لے۔ اس نے کب رائے کو جو ایک ہوشیار اور فہیم برہمن تھا اُس کے پاس بھیج کر پیغام سلام شروع کئے اور وہی معمولی حیلہ کہ ہم بادشاہ کی خدمت میں صرف عیادت اور حصول ملازمت کی خاطر جاتے ہیں اور ظاہر کیا کہ اول تو مناسب یہ ہے کہ تم ہمارے پاس حاضر ہو جاؤ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو راستہ چھوڑ کر اپنے وطن جودھپور کو چلے جاؤ" مگر جب راجہ نے کوئی بات بھی نہ مانی اور لشکر نے بھی ذرا دم لے لیا تو بائیسویں رجب ۱۰۶۸ہجری مطابق اپریل ۱۶۵۶ء کو لڑائی کے قصد سے چڑھ آیا اور سخت لڑائی ہوئی۔ جس میں اُس شمار کے موافق جو اورنگ زیب نے فتح کے بعد کرایا تھا قریب چھ ہزار کے سپاہی جو زیادہ تر راجپوت ہی تھے کام آئے اور بہت سے بڑے بڑے نامی راجپوت سردار مارے گئے اور جسونت سنگھ خود بھی زخمی ہوا

[1] بانس برلہ [2] کاچ رودہ ـ

ہیں جیسے کہ اپنے مسلمان امیروں اور سرداروں کے ساتھ ۔ اور مسلمان امیروں کی مانند ان کو بھی فوج کی حکومتوں اور سرداریوں پر مقرر اور مامور کرتے ہیں۔

جسونت سنگھ کی رانی کا غیرت مندانہ طرز عمل

اس موقعہ پر جسونت سنگھ کی رانی جس سلوک سے اپنے شوہر کے ساتھ پیش آئی وہ بھی سننے کے لائق ہے یعنی رانی نے جب سُنا کہ راجہ پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ معرکہ سے جان بچا کر نکل آیا ہے تو اُس نے بجائے اس کے کہ اس آفت سے بچنے کی مبارک باد دیتی اور تسلی کرتی فوراً حکم دیا۔

"قلعہ کے دروازے بند کردو ایسے بے غیرت نامرد کو میں قلعہ میں ہرگز نہ آنے دوں گی! ایسا شخص اور میرا شوہر، میرے باپ کا داماد اور ایسا بے غیرت! میں ہرگز اس کا منہ دیکھنا نہیں چاہتی، جو شخص ایسے نامور رانا کا رشتہ دار ہو چاہیئے کہ اُس کی شجاعت اور نیک نامی کی تقلید اور پیروی کرے۔ اور اگر فتح نہ پا سکے تو بہادری سے جان دیدے۔"

اور اس سے تھوڑی دیر بعد اُس کے دل میں کچھ اور خیالات گذرے اور کہا کہ میرے لئے ابھی چتا تیار کرو مجھے دھوکا ہوا۔ میرا شوہر حقیقت میں مارا گیا۔ اور یہی سچ ہے پس اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ اور تھوڑے عرصہ بعد پھر غصہ میں آکر بدستور لعن طعن کرنے لگی اور اسی حالت میں اُس کو آٹھ دن گذر گئے اور شوہر کا منہ نہ دیکھا۔ لیکن آخر جب اُس کی ماں اُس کے پاس آئی تب کچھ تسلی تشفی کر کے سمجھایا کہ گھبراؤ نہیں۔ راجہ ذرا دم لے کر اور از سر نو فوج جمع کر کے اورنگ زیب پر پھر حملہ کرے گا۔ اور اپنی شجاعت اور بہادری کے نام کو بدستور قائم رکھے گا۔

اس حکایت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کی عورتوں کے دل میں خیال ننگ و ناموس اور عزت کا کس قدر خیال ہے۔ چنانچہ میں اس قسم کی مثالیں اور بھی بیان کر سکتا ہوں کیونکہ میں نے بہت سی بیبیوں کو اپنے خاوندوں کی لاش کے ساتھ جلتے ہوئے بچشم خود دیکھا ہے۔ لیکن اُن واقعات کو میں کسی اور مقام پر لکھوں گا جہاں بیان کروں گا کہ انسان کے دل پر اپنی اُمیدوں اور کثرت رائے اور کسی عام عقیدے سے اور عزت و حرمت کے خیالات کا کیسا زبردست اور قوی اثر ہوتا ہے۔

راجپوتوں کی سپاہگری

لفظ راجپوت کے معنی ہیں راجہ کا بیٹا۔ یہ لوگ پشت ہا پشت سے سپاہی پیشہ ہیں اور ابتدائے عمر سے یہی تعلیم پاتے ہیں اور اِن کے راجہ معاش کے لئے اس شرط پران کو جاگیریں دیا کرتے ہیں کہ جنگی ضرورت کے وقت اپنے آقا کی خدمت کے لئے حاضر ہو جائیں لارڈ وغیرہ موروثی اُمرا سے فرنگستان کی طرح ان راجپوت ٹھاکروں کو بھی اُس ملک کے خاندانی سردار کہا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُن کی جاگیریں ناقابل ضبطی اور موروثی ہوں۔ یہ لوگ ابتدائے عمر سے افیون کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کو افیون کے بڑے بڑے انٹے کھاتے دیکھکر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اور لڑائی کے دن تو یہ معمول ہے کہ دوگنی افیون کھا کر ایسے مدہوش سے ہو جاتے ہیں کہ بے فکر واندیشہ اپنے آپ کو ہر ایک جان جوکھوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر کوئی راجہ خود بھی بہادر ہو تو اُس کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرتا کہ میرے راجپوت کبھی کسی مشکل میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لڑائی کے وقت یہ لوگ شاید اتنی بات کے تو محتاج ہیں کہ کوئی اِن کا پیش رَو اور لڑانے والا ہو۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے رئیس کے سامنے جان دے دینا اپنا فخر سمجھتے ہیں اور اُس کو دشمن کے ہاتھ میں کبھی نہیں چھوڑ دیتے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے جب یہ افیون کے نشہ میں جھومتے ہوئے مرنے کے یقین سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوا کرتے ہیں تو یہ تماشا عجیب دلچسپ اور قابلِ دید ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں محل تعجب نہیں ہے کہ یہ مغل بادشاہ اگرچہ مسلمان اور بُت پرستوں کے مخالف مذہب ہیں۔ لیکن بہت سے راجاؤں کو ہمیشہ اپنی ملازمت میں اور اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ ویسے ہی سلوک کرتے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: بلکہ لکھا ہے کہ کچھ خفیف زخم قاسم خاں کے بھی آیا۔ مگر ان مورخوں نے باوجود راجپوتوں کی بہادری کی تعریف وتوصیف کرنے کے اس شکست کو زیادہ تر راجہ کی سوئے تدبیری اور ناواقفیت فنِ جنگ سے منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس نے اپنے لشکر کو ایسی اونچی نیچی جگہ میں قائم کیا تھا۔ اور ندی سے کچھ پانی کاٹ کر لشکر کے اردگرد کیچڑ کر دی تھی جس سے اُس کی سوار فوج لڑائی کے وقت اچھی طرح کام دے سکی۔ خافی خاں نے اس لڑائی کا ہونا شیپرا نامے ندی کے کنارے بیان کیا ہے اور جغرافیہ کے نقشوں میں بھی اس ندی کا نام شیپرا ہی لکھا ہے۔ مگر عالمگیر کے خاص مورخ مرزا محمد کاظم نے عالمگیر نامہ میں اس کا نام نالہ چہرہ ترنا لکھا ہے۔ س م ح

جس وقت داراشکوہ آجین کی اس نامبارک اور غمناک واردات سے مطلع ہوا تو غیظ وغضب کے مارے اس کی یہ حالت تھی کہ اگر نصیحت اور فہمائش سے شاہجہاں ذرا ٹھنڈا نہ کرتا تو خدا جانے اس وحشت اور جلد بازی میں کیا کر بیٹھتا اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر قاسم خاں اس کے قابو میں آجاتا تو اس کا سر ضرور کٹوا دیا جاتا اور چونکہ میر جملہ[1] کی نسبت بھی اس کو یہ گمان تھا کہ اورنگ زیب کو اپنی فوج اور روپیہ دے کر وہی اس سارے فتنہ وفساد کا اصل اصول اور بانی مبانی ہوا ہے۔ اس لئے قریب تھا کہ اس کے بیٹے محمد امین خاں کو بھی مروا ڈالے اور اس کی بیوی اور بیٹی کو بازاری عورتوں کے چکلہ میں بھیج دے مگر بادشاہ کی فہمائش بلیغ کے باعث آخر کار اس کا جوش غضب فرو ہوا اور میر جملہ کے اہل وعیال کی عزت اور جان بچ گئی۔ یعنی بادشاہ نے اس کو سمجھایا کہ یہ امر ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میر جملہ اورنگ زیب سے سازش رکھتا ہو اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسا دوراندیش اور دانا آدمی ایسے شخص کے فائدہ کے واسطے جس سے وہ کچھ الفت ومحبت نہیں رکھتا اپنے اہل وعیال کو ایسے شدید خطرہ میں ڈال دے بلکہ برخلاف اس کے یہ امر ظاہر ہے کہ وہ خود اورنگ زیب کے دام فریب میں پھنسا ہوا ہے۔

ادھر جملہ آوروں کا یہ حال تھا کہ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور یہ گھمنڈ

---

[1] فارسی تاریخوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ داراشکوہ میر جملہ کا سخت مخالف تھا مگر شاہجہاں کو اس کے حال پر توجہ تھی چنانچہ پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ شاہجہاں کے شروع مرض کے دنوں میں جب داراشکوہ نے مہابت خاں اور راؤ ستر سال وغیرہ امرا کو بیجاپور کی مہم سے آگرہ میں واپس بلایا تو میر جملہ کو بھی اورنگ زیب کے ساتھ سازش رکھنے کے شبہ میں عہدہ وزارت سے معزول کرا کر دکن سے طلب کیا تھا۔ اور اس کے بیٹے محمد امین خاں کو بھی ممانعت کر دی تھی کہ باپ کی جگہ کام نہ کرے اور راول رائے رایان راجہ رگھناتھ قائم مقام وزیر مقرر ہو کر بعد ازاں جعفر خاں مستقل وزیر مقرر ہو گیا تھا۔ مگر شاہجہاں نے پھر بھی محمد امین خاں کو دانشمند خاں کی جگہ جس نے میر بخشی کے نہایت بڑے عہدہ سے انہیں دنوں استعفا دے دیا تھا مقرر کر دیا تھا اور جب جسونت سنگھ کی شکست کی خبر داراشکوہ کو پہنچی تو اس نے محمد امین خاں کو اپنے مکان پر بلا کر قید کر لیا۔ اور اگرچہ دو چار روز کے بعد شاہجہاں کے سمجھانے سے قید سے چھوڑ دیا۔ مگر میر بخشی کے عہدہ پر نہ رہنے دیا۔ چنانچہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کی لڑائی کے وقت بادشاہی فوج کا میر بخشی عمدۃ الملک خلیل اللہ خاں تھا۔ س م سے

ہو گیا تھا کہ ہم کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی ایسا مشکل کام نہیں جس کو ہم انجام نہ دے سکیں اور فوج کی ہمت و جرأت بڑھانے کو اورنگ زیب علانیہ کہتا تھا کہ داراشکوہ کی فوج میں تیس ہزار مغل ہمارے لئے اپنی جانیں لڑا دینے کو تیار ہیں۔ اور اُس کی یہ لاف زنی چنداں بے اصل بھی نہ تھی کیونکہ ناظرین کتاب جلد معلوم کرلیں گے کہ داراشکوہ سے فی الواقع بعض امرائے دغابازی کی اب مراد بخش اگرچہ تیز مزاجی سے قیام کا متحمل نہ تھا۔ اور اُس کا شوق یہی چاہتا تھا کہ آگے بڑھتے چلے۔ لیکن اورنگ زیب نے روکا اور کہا کہ اس خوفناک دریا (نربدا[1]) کے کنارے ٹھیر کر ذرا دم لینا اور آرام کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اِس صورت میں ہم کو اپنے دوستوں اور خیر خواہوں سے خط و کتابت کرکے دارالسلطنت کے حالات جانچنے اور معلوم کرنے کا موقعہ ملے گا۔ غرض کہ اب ان کا کوچ آہستہ آہستہ ہوتا تھا۔ اور آگرہ سے جو خبریں آتی تھیں اُن پر غور کرکے آگے کو بڑھتے تھے۔

شاہجہاں کی مجبوری اور داراشکوہ کی خودرائی

اس وقت شاہجہاں ایک عجیب ناامیدی اور غم میں مبتلا تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ دیکھتا تھا کہ اب یہ دونوں کسی طرح دارالسلطنت میں داخل ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ دوسری جانب داراشکوہ کو لڑائی کی بڑی بڑی تیاریاں کرتے دیکھکر اُسے سخت اضطراب ہوتا تھا کیونکہ خوب جانتا تھا کہ جن آفتوں کو وہ طرح طرح کی تدبیروں سے ٹالنا چاہتا تھا اب اس خاندان پر آنے والی ہیں۔ مگر داراشکوہ کی خواہشوں کو روک بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اول تو بیماری کی سختیوں ہی سے چھٹکارا نہیں ہوا تھا اس کے علاوہ داراشکوہ کی منہ زوریوں سے مجبور ہو کر فوج اور ملک کے کام سے ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا اور اُمرا اور وزرا کو کہہ چکا تھا کہ اُس کی اطاعت اور فرماں برداری کریں۔ غرض کہ ان دنوں اُس کی یہ حالت تھی کہ گویا داراشکوہ تو بادشاہ اور حاکم تھا اور وہ نوکر اور محکوم۔

داراشکوہ کی فوج

اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ داراشکوہ نے بآسانی اس قدر فوج جمع کرلی جو ہندوستان میں کسی لڑائی کے موقعہ پر شاذ ہی کبھی ہوئی ہو چنانچہ ایک لاکھ سوار[2] اور بتیس ہزار پیدل اور اسّی توپیں اور بے انتہا نوکر چاکر اور بنئے بقال اور مزدور

---

[1] انگریزی میں نربدا ہی لکھا ہے مگر یہ مترجم کی غلطی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ آتے ہیں۔ س م ح

[2] عاقل خاں لکھتا ہے کہ "قریب صد ہزار سوار کرار از امرائے نامدار و دیگر بندہائے سرکار عالم مدار و ملازمان سرکار خویش فراہم آوردہ" س م ح

اور حال جو رسد رسانی اور اور کاموں اور خدمتوں کے لئے صلح ہو یا جنگ ۔ بہرحال درکار ہوتے ہیں جمع ہو گئے ۔ پس اکثر مورخ جو یہ لکھدیا کرتے ہیں کہ فلاں جگہ تین چار لاکھ آدمی کا لشکر تھا مجھے شک ہے کہ وہ غلطی سے ۔بھیر کے لوگوں کو بھی لڑنے والے سپاہیوں کے شمار میں داخل کر لیتے ہیں۔

اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ داراشکوہ کی فوج اس قدر زیادہ تھی کہ بظاہر اورنگ زیب کی سی دو تین فوجوں پر غالب آسکتی تھی (کیونکہ اول تو اس کی سب قسم کی فوج چالیس ہزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی ۔ اور پھر نیز دھوپ اور گرمی میں کڑے کڑے کوچ کئے چلے آنے سے اکثر تھکی ماندی تھی)، مگر اس پر بھی کسی کو اس کی کامیابی کا یقین نہ تھا اس لئے کہ جن سپاہیوں اور سرداروں کی نسبت یہ بھروسہ ہو سکتا تھا کہ نمک حلال اور وفادار رہیں گے وہ صرف وہ لوگ تھے جو سلیمان شکوہ کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ اور دربار کے جتنے بڑے بڑے امیر تھے اُن کی طرف سے ایسے آثار ظاہر تھے کہ اُن کو نہ تو کچھ اُس سے محبت ہی ہے اور نہ کچھ اُس کا فائدہ ہی چاہتے ہیں۔

داراشکوہ کا جنگ کرنے پر اصرار

اس لئے اس کے خالص خیر خواہوں نے نہایت منت اور سماجت سے یہ صلاح دی کہ آپ اس خطرناک لڑائی کی سلسلہ جنبانی نہ کریں اور خود شاہجہاں کی بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ یہی رائے تھی بلکہ باوجود ضعف و نقاہت کے اُس نے یہاں تک کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ اورنگ زیب کے مقابلہ کو بذات خود جاؤں اور فی الواقع یہ تدبیر نہایت ہی عمدہ اور معقول تھی اور ضرور لڑائی ٹل جاتی اور اورنگ زیب جو نہایت ہی مغرور ہو رہا تھا اس طریق سے اُس کی کامیابی بے شک رُک جاتی اور اول تو اورنگ زیب اور مراد بخش باپ کے ساتھ غالباً مقابلہ سے پیش ہی نہ آتے ۔ اور اگر ایسی حرکت کر بھی بیٹھتے تو یقیناً تباہ اور برباد ہو جاتے۔ کیونکہ اورنگ زیب اور مراد بخش کے سب سردار اور اہل فوج بادشاہ کے دل سے گرویدہ تھے اور جب اُس نے کسی طرح سے بھی اُن کی اس صلاح کو نہ مانا تو مجبوراً اُنھوں نے یہ سمجھایا کہ سلیمان شکوہ جو آپ کی امداد کے لئے بہت جلد چلا آرہا ہے اُس کے آجانے تک توقف کیجئے ۔ اور فی الواقع یہ بھی ایک اچھی اور مفید صلاح تھی کیونکہ اس نوجوان شاہزادہ سے اکثر لوگ راضی تھے اور محبت رکھتے تھے اور وہ اپنے ساتھ ایک ایسی فوج

لیے آتا تھا جس میں اکثر دارا شکوہ کے ذاتی ملازم تھے اور سلطان شجاع پر ابھی فتح پا چکی تھی۔ لیکن اس کو بھی نہ مانا کیونکہ اُس نے یہی ایک بات ٹھان لی تھی کہ اپنے اس ارادہ پر قائم رہ کر جس طرح بن پڑے اورنگ زیب سے سبقت لے جانا چاہیے۔ اگر دارا شکوہ خوش نصیب ہوتا اور موقعہ شناسی سے کام کرتا تو غالبًا بازی لے جاتا۔[1]

جن خیالوں سے اُس نے ان تجویزوں کو نہ مانا اور جلدی سے بھڑ جانا ہی پسند کیا ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ اُس نے سوچا کہ اس وقت بادشاہ یہاں تک میرے قابو میں ہے کہ اُس کی ذات خاص پر بھی مجھے اختیار کلی حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ بادشاہی خزانہ سب میرے قبضہ میں ہے۔ تیسرا یہ کہ کل بادشاہی فوج میرے تحتِ حکومت ہے۔ چوتھا یہ کہ سلطان شجاع نے ایسی شکست کھائی ہے کہ گویا تباہ ہی ہو چکا ہے اور اورنگ زیب اور مراد بخش جو ایک کمزور اور تھکی ماندی فوج لے کر آئے ہیں گویا "بپائے خود بگور آمد" کا مصداق بننے کے لئے آتے ہیں اور اس حالت میں اگر ان کو ایک بار شکست مل جائے گی تو پھر کہیں ان کا ٹھور ٹھکانا نہ رہے گا اور اس طرح سے روز روز کا قصہ ایک ہی دفعہ پاک ہو کر بلا شریک وسہیم سلطنت کا مالک اور بادشاہ بن جاؤں گا۔ اور یہ بھی خیال کیا کہ اگر خود بادشاہ کو مقابلہ کے لئے جانے دوں گا تو ضرور صلح ہو جائے گی اور سب

---

[1] عاقل خاں لکھتا ہے کہ چونکہ دارا شکوہ کو ناتجربہ کاری کی وجہ سے لڑائی بھڑائی کے کام کی بالکل لیاقت نہ تھی اور اُس کی اکثر تدبیریں نامناسب اور خلاف عقل ہوتی تھیں اس لئے اس خاندان کے خیر خواہوں نے ہر چند عرض کیا کہ یہ آگ جو بھڑکی ہے آپ تدبیر کے بغیر بجھنی مشکل ہے اور حضرت (بادشاہ) کو ایک فریق بنانا مناسب نہیں اورنگ زیب اور مراد بخش کو آنے دینا چاہیے اور جب حضرت کے ارشاد سے بادشاہی اُمرا ان سے علیحدہ ہو جائیں گے تو اُن میں خود ہی مقابلہ کی طاقت نہ رہے گی اور جو کچھ حضور فرمائیں گے اورنگ زیب کو اُس کی مخالفت ناممکن ہوگی۔ مگر جب تک بادشاہی اُمرا اُن کی رفاقت میں ہیں کوئی تدبیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ بادشاہ نے بھی اس رائے کو نہایت پسند کیا۔ مگر دارا شکوہ نے راؤ ستر سال اور رام سنگھ کے اغوا سے منظور نہ کیا۔ بلکہ نفاق پر محمول کر کے علانیہ کہہ اُٹھا کہ۔ من عنقریب این کوتہ پائچہ ہا را (یعنی شرعی پاجاموں والے مسلمان ملمروں کو) در حلیب دار دلی، ستر سال خواہم مد انید" (ستر سال تک دوڑاؤں گا) اور اس بات کے سننے سے سب امرا کیا تورانی اور کیا ایرانی بے دل ہو کر در پردہ طرف ثانی کے جانب دار ہو گئے۔ س م ح ۱۲

بھائی اپنے اپنے صوبوں کو واپس چلے جائیں گے۔ اور بادشاہ جو پہلے کی بہ نسبت تندرست ہوتا جاتا ہے عنانِ حکومت پھر اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ اور امورِ سلطنت جس صورت پر پہلے تھے اُسی شکل پر پھر ہو جائیں گے اور سلیمان شکوہ کے انتظار کرنے کی نسبت اُس نے یہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کے آنے تک بادشاہ میری خرابی کے لئے کوئی منصوبہ باندھ لے یا اورنگ زیب ہی سے کوئی ایسا عہد و پیمان کرے جو میرے حق میں مضر ہو اور یہ بھی خیال کیا کہ اگر اُس کے آنے تک صبر کیا جائے اور بالفرض اس کے آنے کے بعد لڑائی میں فتح بھی حاصل ہو جائے تو لوگ اس کو سلیمان شکوہ ہی سے منسوب کریں گے جس کی بہادری کی پہلے ہی بہت کچھ دھاک بیٹھ گئی ہے اور اس حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس دل چلے اور نوجوان لڑکے کی طبیعت پر لوگوں کی تعریف و توصیف سے کس قسم کا اثر پیدا ہوگا اور جب کہ خاص دادا اور اُمرائے دربار تحسین و آفرین کریں گے تو کیا معلوم ہے کہ اُس کے خیالات کہاں تک بلند پروازی کریں اور باپ کی محبت اور ادب کا کچھ لحاظ باقی رہے یا نہ رہے۔

داراشکوہ میدانِ جنگ کی طرف غرض کہ ان توہمات سے داراشکوہ بہک گیا۔ اور اپنے خیرخواہوں اور دوستوں کی نیک اور عاقلانہ صلاح بالکل نہ مانی اور فوج کو لڑائی کے لئے تیار ہو کر کوچ کرنے کا حکم دیا اور رخصت ہونے کو قلعہ میں بادشاہ کے پاس آیا۔ اور یہ بوڑھا باپ اول تو بیٹے سے بغل گیر ہو کر بے اختیار رونے لگا مگر پھر ذرا سنبھل کر بولا کہ "خیر بیٹا تم نے اپنی مرضی کا کام کیا۔ خدا تم کو اس میں سرخ رو اور کامیاب کرے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر لڑائی بگڑ گئی تو پھر آکر مجھے کیا منہ دکھاؤ گے" مگر اُس نے ان باتوں کی کچھ پروا نہ کی اور جھٹ پٹ رخصت ہو کر چنبل کی طرف جو آگرہ سے قریب بیس فرسنگ کے ہے کوچ کر دیا اور اس خیال سے کہ مخالف فوج یہیں سے گذر کرے گی دریا کے گھاٹ روک کر مورچے جما دیئے[1]

---

[1] داراشکوہ نے اگرچہ اس دریا کے معروف گھاٹ سب ہی روک لئے تھے مگر دھول پور کے گھاٹ کو جہاں سے گوالیار اور دکن کا عام راستہ ہے خصوصیت کے ساتھ روکا تھا۔ یہ مقام اُس زمانہ میں خاص بادشاہی عمل داری میں تھا۔ مگر ہمارے اس وقت میں پمرولیا گوت کے جاٹ قوم کے اُن رئیسوں کا دارالحکومت ہے جو بہ زمانہ سابق گوہد کے رانا کہلاتے تھے۔ اور گوالیار بھی انھیں کی عمل داری میں

اورنگ زیب کی فوجی چال لیکن وہ تیز نظر اور سیاست داں، فقیر[1] جس نے ہر جگہ جاسوس اور مخبر لگار کھے تھے اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھا کہ اس قدر مخالف فوج کی موجودگی میں دریا سے اُترنا کس قدر دشوار ہے۔ مگر بہرحال اُس نے اپنے ڈیرے خیمے اُس پار آن لگائے۔ اور عمداً ایسے نزدیک قائم کئے کہ دارا شکوہ اُن کو دیکھ سکے اور اس کے ساتھ ہی یہ تدبیر کی کہ چمپت[2] نامی ایک راجہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ تھا۔ مگر مرہٹوں کے زور کے زمانہ میں وہ ریاست ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور اس کے عوض سرکار انگریزی کی اعانت سے دھول پور کی نئی ریاست قائم ہوگئی جس کا رقبہ ایک سو ساٹھ میل مربع اور آبادی قریب دو لاکھ اور آمدنی دس اور گیارہ لاکھ کے اندر ہے۔ نوجوان رئیس حال مہاراج رانا نہال سنگھ صاحب بہادر عالی شان خاندان پٹیالہ کے نواسے ہیں۔ اور یہ بااختیار ریاست ہے اور گورنمنٹ قیصریہ کی طرف سے رئیس کے لئے پندرہ توپ کی سلامی مقرر ہے۔ س م ح

[1] چونکہ شاہزادگی کے زمانہ میں اورنگ زیب ریاکاری سے اپنی نسبت اکثر فقیر کا لفظ استعمال کیا کرتا تھا اس لئے مصنف کہیں کہیں طنزاً اس لفظ کا اعادہ کرتا ہے۔ س م ح

[2] یہ بھداور کا راجہ تھا جو باشندوں کی قوم کے نام کی مناسبت سے آگرہ کے قریب چنبل کے دونوں طرف کے اُس قطعہ ملک کو کہتے ہیں جس میں بھدوریہ گوت کے راجپوتوں کی آبادی ہے۔ اس خاندان میں ریاست کی صورت کسی قدر اب تک بھی قائم ہے اور گورنمنٹ عالیہ قیصریہ کی طرف سے کچھ تو گاؤں معاف ہیں اور کئی ہزار روپیہ نقد عنایت ہوتا ہے جو مل جل کر قریب ایک لاکھ روپیہ سال کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اور موضع کچھوا جس کو عموماً گھاٹ کا گاؤں کہتے ہیں آج کل ان کا ریاست گاہ ہے جو دریائے جمنا کے کنارے پرگنہ باہ پناہٹ ضلع آگرہ میں واقع ہے۔ اور اگرچہ اختیار فرماں روائی حاصل نہیں ہے مگر رئیس کو مہاراجہ کا خطاب ہے اور عزت و آبرو اب بھی بہت خاصی ہے۔ چنانچہ ایک بڑے دربار میں جو نومبر ۱۸۶۶ء میں لارڈ لارنس صاحب بہادر وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند نے بمقام آگرہ نہایت شان و شوکت سے کیا تھا اور جس میں خود بھی موجود تھا مہاراجہ بھداور کی کرسی سندھیا جے پور۔ جودھپور وغیرہ بڑے چھوٹے چوبیس فرماں روا رئیسوں اور چھ مغلیہ خاندان کے شاہزادوں۔ اور مہاراجہ وزیانگرام (رئیس بے اختیار متعلقہ احاطہ مدارس) اور مہاراجہ بلرام پور اودھ کے تعلقدار اعلیٰ کے بعد تینتیسویں نمبر پر اور بہت سے بے اختیار راجاؤں اور سرداروں سے اوپر تھی اورنگ زیب چنبل کے جس گھاٹ سے پایاب اُترا تھا۔ باوجود کوشش کے اُس کا پتہ نہیں لگ سکا مگر عاقل خاں کی تاریخ اور عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بھداور کے راجہ نے نواح گوالیار میں حاضر ہو کر اس خدمت

کو کچھ انعام و اکرام اور وعدے وعید دے کر یہ بندوبست کر لیا کہ فوج اُس کے علاقہ میں سے گذر کر فوراً اُس گھاٹ کو جا لے جو پایاب تھا۔ اور اس راجہ نے اُس بَن اور کوہستان کے مشکل راستہ سے جس کی نسبت داراشکوہ کو شاید یہ گمان تھا کہ اس طرف سے اورنگ زیب نہ آسکے گا خود ساتھ ہو کر عبور کرا دینے کا ذمہ لیا۔ اور اس تجویز کے موافق مخالفوں کو دھوکا دینے کے لئے ڈیرے خیمے بدستور کھڑے چھوڑ دیئے اور خود معہ فوج چل دیا۔ اور دشمن کو خبر ہونے سے پہلے چنبل سے اُتر آیا۔[۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کے بجا لانے کا ذمہ لیا تھا اور اورنگ زیب نے کارخانہ جات شاہی کو گواری کی سرائے میں چھوڑ کر اُس ملک کے پچیس کوس کی مسافت کو دو منزلوں میں طے کر کے ماہ رمضان کی پہلی تاریخ ۱۰۶۸ہجری کو ایک غیر مشہور گھاٹ سے جو گوالیار سے دھول پور کی طرف آتے ہوئے داہنے ہاتھ تھا۔ عبور کیا تھا۔ س م ج

[۱] اس موقعہ پر بیگم صاحب نے جو خط اورنگ زیب کو لکھا تھا (جس کو خود شاہجہاں کی طرف سے سمجھنا چاہیئے) اور اس کے جواب میں جو عریضہ اس نے باپ کی خدمت میں بھیجا تھا وہ دلچسپ سمجھ کر تاریخ عاقل خاں سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں" للہ الحمد والمنۃ کہ ذات مقدس شاہنشاہ معدلت پژوہ دقیقہ رس اعلیٰ حضرت ظل سبحانی منظور انظار عنایات ربانی صاحب قران ثانی از سایر عوارض و امراض جسمانی کہ لازمہ نشاء بشریت وطبیعت انسانی است منزہ و مبرا ست و توجہ عالم آرا در باب رفاہیت برایا کہ ودایع بدایع الٰہی اند وانیت ملک بہ وجہ اتم مبذول و بہ مقتضائے طبع نصفت آگین اشرف ہیچ متنفسے را نمی پسندند کہ مصدر حرکتے ومظہر امرے کہ مستلزم بے جمعیتی خلایق و متضمن ضرر و ضیر طوائف انام باشد گردد خاصۃ از فرزندان نامدار و ابنائے کامگار سیما دریں ایام کہ خاطر مقدس بہ تدارک وتلافی وہن وفتورے کہ بسبب بیماری آں برگزیدۂ انفس وآفاق بحال کافۂ برایا و عامۂ رعایا راہ یافتہ باقصی غایت متوجہ و متعلق است التہاب نوایر فتنہ وفساد و اشتعال آتش کین و عناد کہ مورث ویرانی بلاد و خرابی عبا داست معاذ اللہ موجب مزید آزار خاطر ہمایوں وسبب کثرت حزن وملال طبع مقدس خواہد بود بہ تخصیص ظہور ایں نشاء ناپسندیدہ و وقوع ایں امر نامرغوب از آں برادر ہوشمند بیدار مغز کہ آراستہ بمزایائے لطیفہ ماخلاق کریمہ و صاحب آداب حمیدہ و طبع سلیمہ است بغایت زشت و نازیبا۔ لاجرم بنا بر خیر طلبی ایں چند کلمہ کہ ہر آئینہ متضمن فوائد عظیمہ و موجب تنزیہ و تطہیر ساحت باطن وتصفیہ طریق معاد از خس و خاشاک امور ردیہ و شیون ذمیمہ است حسن نگارش پذیرفت اگر غرض آں برادر والا گہر ازیں توجہ تہییج غبار فساد و عناد والتہاب نوایر حرب و قتال است خود انصاف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - فرمایند کہ در برابر مرشد و قبلہ حقیقی کہ رضائے او موجب خوشنودی خدائے عزوجل و رضامندی رسول اوست - ہنگامہ جنگ و جدال و حرب و قتال آراستن و بر سفک دمائے بے گناہان ہمت گماشتن و بر روئے آنحضرت تیر و تفنگ انداختن بچہ مایہ ناشایان است و ثمرہ آں درین نشأہ جز بدی و در آں نشأہ غیر بہ سرانجامی نیست ما گر آرائش ہنگامہ مخاصمہ و مقاتلہ از بہر شاہ بلند اقبال (دارا شکوہ) است نیز در آئین دین و خرد صواب گزین پسندیدہ نباشد زیرا کہ برادر بزرگ شرعاً و عرفاً حکم پدر دارد و این معنی را با مرضیات خاطر مقدس حضرت ظل الٰہی و متمنیات طبع والائے شہنشاہی مباینت تامہ متحقق است۔ بالجملہ انبعاث غبار ہیجا و ایقاد نوایر وغا و ترتیب اسباب رزم و خوں ریزی و تصمیم عزیمت حرب و فتنہ انگیزی ازاں برادر ہوشمند والا گہر کہ بہ محامد اوضاع و محاسن اطوار و مکارم اخلاق موصوف و معروف جہان گشتہ پیوستہ در استرضائے خاطر اقدس خاقان خجستہ منظر و شاہنشاہ فرشتہ سیر میکوشند ہیچ وجہ و باہیچ کس پسندیدہ نیست چہ توقف چند روزہ دریں دار بے ثبات و قرار و مستلذات ابلہ فریب ایں سرائے مستعار کہ باعث ارتکاب چنیں امر مذموم و ناپسندیدہ باشد موجب ملالت نشأ ابد و طراز ساحت سرائے مخلد است ع مکن کن کہ نکوگوہراں چنیں نکنند - مناسب آنست کہ آں برادر نامدار ازیں امور ردیہ و افعال شنیعہ کہ منتج سوء خاتمت و مثمر وخامت عاقبت ست اجتناب لازم شمردہ در استرضائے خاطر قدسی مناظر شاہنشاہ دین پرور و خاقان معدلت گستر نا ممکن و مقدور سعی نماید و خوشنودی آنحضرت را از موجبات حصول سعادت دارین فرا گرفتہ از ارادۂ ہم متابعان حضرت خاتم النبیین در ماہ مبارک رمضان محترز باشد و احکام مرشد و ولی نعمت و والی سلطنت را بجان و دل امتثال نماید کہ فی الحقیقت بہ مقتضائے اُولی الامر منکم امتثال امر شاہنشاہ حقیقی است و قدم در راہ خلاف خلیفہ الٰہی سپردن مخالفت فرمان مالک الملک نمودن است و اگر مطلبے و غرضے غیر ازیں مرکوز خاطر عزیز بودہ باشد - پس پسندیدۂ عالم خرد آنست کہ در سرزمینے کہ مضرب خیام شدہ باشد توقف اختیار نمودہ ہر مطلبے کہ مکنون خاطر گرامی است مرقوم گردانند تا بعرض اقدس وارفع رسانیدہ مطابق ابتغائے خاطر عزیز و تمنائے طبع گرامی سرانجام دادہ آید و در اسعاف و انجاح مقاصد و مآرب آں قرۃ باصرہ سلطنت و جہاں بانی سعی و اجتہاد وافی بہ تقدیم رسانیدہ شود"

اورنگ زیب نے کسی مصلحت سے بہن کو تو اس کا جواب نہ لکھا مگر خود باپ کے نام مندرجہ ذیل عرضی بیگم صاحب کے بخشی محمد فاروق کو جو یہ خط لایا تھا دیدی اور آگرہ کی جانب کوچ کر دیا۔

" دریں ایام زمام مہام سلطنت و دارائے و عنان امور ملکی و مالی از قبضہ اختیار حضرت بیروں رفتہ و

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اعلام تغلب واقتدار شاہزادہ کلاں (دارا شکوہ) در قبض وبسط امور سلطنت وفرماں دہی بغایتے ارتفاع پذیرفتہ کہ اندازۂ آں بہ حوصلۂ تقریر و تحریر نمی آید واد بنا بر قدرت و مکنت خویش ہمت باستیصال نہال وجود اخواں مقصود گردانیدہ روز بروز سعی واجتہادش دریں باب ہمت تزاید می پذیرد۔ چنانچہ سلیمان شکوہ را با فواج گراں بر سرِ شاہ شجاع کہ پسر رشید آں حضرت است تعین کردہ ناموس ونام تئیں ودو سالہ را (کیونکہ یہ واقعہ شاہجہاں کے بتیسویں سال جلوس میں ہوا تھا) بباد فنا دادہ وآنجناب (شاہ شجاع) چہ مایۂ مذلت وخفت از نواسہ پرویز (شاہجہاں کے ایک سوتیلے بھائی کا نام تھا جس کی بیٹی سلیمان شکوہ کی ماں تھی) کشیدہ ودپیش اہل جہاں شرمسار وخجل گردیدہ وہم چنیں بہ ہوائے نفس وخواہش طبع خویش بنائے کار بر آں نہادہ پیوستہ در تنقیص وتضییق احوال وتضیع وتخریب مہام ایں نیاز مند بذل جہد می نماید وہمیشہ کارہائے مباین دین وملت کہ متلزم فساد امور بلاد وعباد ہا شد از وبظہور می رسد وابواب منافع ومداخل بر روئے روزگار ایں خیر خواہ مسدود گردانیدہ انواع منقصت واقسام مضرت رسانیدہ ودرایامے کہ حسب الاشارہ اقدس بر ولایت بیجاپور لشکر کشیدہ بہ تسخیر بعضے از قلاع آں ولایت می پرداخت وامراد سپاہ بہ محاصرہ اشتغال ورزیدہ دادِ جاں فشانی می دادند ومخالفان از اطراف وجوانب ہجوم آوردہ در مقام ممانعت ومدافعت بودند واخبار موحشہ بیماری ذاتِ مقدس بشیوع یافتہ باعث تحیرد تفکر اولیا وخیرگی وشوخی اعدا شدہ بود ومحصوران گلبرگہ کہ جاں بازاں موکب اقبال بعد از تسخیر قلعہ بیدرد کلیانی بہ محاصرۂ بلدہ مذکور پرداختہ بودند در مضیق محاصرہ دل تنگ تر از غنچہ شدہ کار بداں تقریب گشتہ بود کہ صورت افتتاح رونماید ومسند آرائے بیجاپور از ترکتاز بہادران اقلیم ستان بستوہ آمدہ در فکر آن فرو افتادہ بود کہ پیش کشے لائق سرانجام دادہ ولایت خود را از صدمہ سپاہ فیروزی دستگاہ مصئون گرداند والّا بیم آں داشت کہ دلاوران موکب اقبال اورا عنقریب مستاصل ساختہ ولایتش را ضمیمہ ممالک محروسہ گردانند درخلال ایں حال شاہزادہ کلاں ملازماں خود را بطلب امرائے بادشاہی وتسلی واستمالت حاکم بیجاپور تعین نمود۔ آں ہا پیغام ہائے عنایت آمیز ومہربانی انگیز بہ والی بیجاپور رسانیدہ اورا در وادی لجاج وعناد نسبت بایں مرید دلیر تر ساختند وسرداران بادشاہی را بہ مبالغہ واہتمام تمام از پیرامون بلدہ گلبرگہ کہ کارش نزدیک بہ کشایش رسیدہ بود برداشتہ در رواں کردن وبردن آں ہا بداں نہایت مراتب تاکید واہتمام بطور رسانیدن کہ فرصت رخصت ومجال وداع نیافتہ وایں خیر خواہ راندیدہ بر جناح استعجال عازم درگاہ جہاں پناہ شدند ازیں جہت قافیہ وقت بریں نیاز مند بغایت تنگ گشتہ۔ لورطۂ تحیر وتفکر در افتادہ بحکم ضرورت کار صورت یافتہ وبانجام رسیدہ را برہم زدہ محض نہ نیروئے اقبال بے زوال خود را اوراں سیہ چال

داراشکوہ کی جلد بازی

اب داراشکوہ کو بھی مجبوراً اپنے مورچے چھوڑ کر اُس کا تعاقب کرنا پڑا جو چنبل سے اُتر کر بڑی سرعت کے ساتھ جمنا کے کنارے پہنچ گیا اور فوج کو آرام دینے کی غرض سے مورچے جمائے دیکھ رہا تھا کہ داراشکوہ کب آتا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ خطر برآوردہ بہزاراں جرثقیل واصابہ تدابیر از میان انبوہ غنیم برآمدہ سالما بمامنے رسید۔ عیاذ باللہ۔ اگر چشم زخمی می رسید در اکناف واطراف جہان شہرت یافتہ لکہ بدنامی خال خفت و مذلت سالہائے دراز بررو ئے دولت پائدار می ماند و بر جرائد روزگار ثبت می گردید و پیداست کہ تدارک وتلافی آں بواسطہ عدم دور بینی وناعاقبت اندیشی شہزادۂ کلاں کہ محض روائی کار خویش مطمح نظر داشتہ اگر عالمی راآب فرو برد غمے ندارد از دائرہ امکان وحیز قدرت بندہائے بادشاہی بیروں بود ایں مرید ازبس ممارست درامر جاں بازی و مہارت در کار نبرد و پیکار و آشنائی باشیوہ ستیزہ دراں ایں دیا از ہجوم وازدحام اعدا حسابی نہ گرفتہ بہ چقماق جلادت فرق مخالفان کوفتہ باستظہار اقبال لشکر راازاں گرداب شورش وفساد در ضماں سلامت بیروں آورد و غریب تر آنکہ بایں بے مددی و خسارت وکار شکنی وخصومت کہ در ایران وتوران اشتہار پذیرفتہ اکتفا نہ کردہ محال بڑار را (یہی بڑار جو فی زماننا ریاست حیدرآباد دکن کا ایک جزو مگر گورنمنٹ انگریزی کے زیر انتظام ہے) بے سابقہ تقصیر و کوتاہی از جاگیر ایں خیرخواہ رضا طلب کہ جز ارادت واعتقاد ولے دیگر را بخاطر راہ ندادہ تغیر کردہ با پختاں ناخلفی زیادہ سری (مراد بخش) کہ پا از حد بیروں نہادہ مرتکب انواع گستاخی و مصدر تقصیرات عظیم گشت ولوائے بے اعتدالی وافساد و سوحتہ بغی وعناد برافراشتہ تنخواہ نمود و کیفیت حال دامی را بواسطہ خواہش نفس خویش بخلاف واقع بعرض اشرف رسانیدہ بہ محض بہتان وافترا اقبال حال ایں خیراندیش را غبار آلود جرائم ولوث آمود ذمائم وانمود و با لحاح تمام جسونت سنگھ را بالشکر گراں بر سر ایں داعی گماشت و مطمح نظر آں داشت کہ بہ ضمن ولایتے مختصر (یعنی صوبہ داری دکن) کہ از پیشگاہ عاطفت واشفاق حضرت بایں مرید مرحمت شدہ بہر بہانہ کہ میسر آید انتزاع نماید وایں فدوی را آوردہ بیابانی بیکسی وغربت وآسیمہ سر صحرائے محن وکربت گرداند وبسکہ از راہ دمدمہ دوستان در مزاج اقدس تصرف کردہ حضرت قول او را تصدیق فرمودہ سیار فرزندان اخلاص طینت را دشمن دولت فراگرفتہ در حق ایں سرگرداناں سراب گاہ حیرت ہرچہ او تجویز می نماید بے تامل حکم می فرمائند وقطعاً تفحص وتفتیش حال ایں بے گناہاں توجہ وغور در امور ملکی ومالی نفرمودہ زمام رتق وفتق مہام جزی وکلی بکف اختیار وقبضہ اقتدارش بازگزاشتہ اند داد خود بے غائلہ شک وشائبہ ریب تشنہ خون ایں بے گناہان است۔ چوں کار بایں حد رسیدہ وصورت حال بدیں منوال انجامیدہ حفظ جان وپاس ناموس خود از تہمات عالم وتہمات لشکر خرد دانستہ عازم استلام سدرہ منزلت سپہر احتشام گردید تا صورت حال بہ حجج وبراہین معقولہ در خدمت عاکفان پایہ اورنگ جہانبانی

دیہ جگہ جہاں اُس نے اپنے مورچے قائم کیے تھے آگرہ سے قریب پندرہ۱۵ میل کے ہے اور اس کا نام پہلے سموگڈھ تھا اور اب اس وجہ سے کہ اورنگ زیب نے یہاں فتح پائی تھی فتح آباد کہا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مکشوف گرداند فرد عدل سلطان گر نپرسد حال مظلومان عشق۔ گوشہ گیران را ز آسایش طمع باید برید۔ چوں ایں خیر خواہ قطع مسافت نمودہ بحوالی اُجین فایز گردید جسونت سنگہ باشارہ شاہزادہ کلاں با بنیاد و آثار ایں خیر خواہ مامور بود بہ سلسلہ جنبانی جہل و نادانی سنگ راہ گشتہ بہ قدم ممانعت پیش آمد مبے ملاحظہ آداب و حقوق دلیرانہ تحکم نمود چندانکہ مردم ہوشمند سخن دان فرستادہ بعنوان معقول آں جہول را بارادہ خود آگاہی بخشید و تصریح نمود کہ محرز سعادت حضور فائض النور و محرم طواف کعبہ آمال بندگان نزدیک و دور ست چرا مانع سعادت می شود۔ آں ناعاقبت اندیش اصلا بمعقولیت آشنا نہ شدہ بہ تکلیف جہالت و غرور بیشتر در مراتب منع افزود ولاجرم پنبہ جہل و پندار پوچ از گوش ہوش او برکردن و ظلوم جہول را از پیش راہ برداشتن بہ حکم ضرورت بر ذمہ ہمت عقیدت نہمت واجب گردید واگر غیر از تحصیل سعادت زمیں بوس اشرف و اعلی مرے دیگر مرکوز خاطر می بود بر ضمیر خورشید تنویر ہمایوں روشن و ہویدا ست کہ اسیر کردن او رفقائش کہ چنیں شکست فاش یافتہ بحال منکر سراسیمہ گردوادی انہزام گشتہ بودند چنداں تعذرے نداشت و اکنوں کہ شاہزادہ کلاں خود با سپاہ گراں تا دھول پور تشریف آوردہ معابر چنبل و مسالک راہ مسدود ساختہ و جا بجا مردم خود گماشتہ باعتقاد خویش، راہ عبور بر ایں خیر اندیش بستہ بودند۔ چوں ایں مرید را غیر از ادراک دولت حضور پرنور با ہیچ کس سر مقابلہ و پیکار نبود و نیست۔ از راہ بعد از آب چنبل عبور نمودہ عازم زمیں بوس اقدس گشت و چنیں شنیدہ می شود کہ آنجناب (داراشکوہ) حرماں ایں ارادت سرشت اخلاص کیش از سعادت خاک بوس ہمایوں خواستہ قصد اشتعال نائرہ قتال پیش نہاد ہمت دارند۔ چوں آنجناب را با چوں من مرید ارادت پرست بمقابلہ و ممانعت پیش آمدن و ہنگامہ حرب و مصارف آراستن عقلاً و نقلاً سنجیدۂ میزان استحسان نیست لازم کہ از سلوک مسلک عناد و اعتساف انحراف نمودہ از اقدام بر امرے کہ نتیجہ اختلال احوال خلایق باشد اجتناب و احتراز نمایند و اگر بنا بر توغل در لجہ غرور و استکبار و نظر بر کثرت اعوان و بسیاری انصار خواہ مخواہ با فروختن آتش کارزار و گرم نمودن بازار پیکار ہمت گمارند۔ فدوی عقیدت گزیں نیز بحکم الضرورت تبیح المحظورات صرفہ نخواہد کرد پسندیدۂ عالم صواب آنست کہ بزرگی را کار فرمودہ بساط کرد فرو نوردند و بالفعل بہ صوب ولایت پنجاب کہ در جاگیر آنجناب مقرر است شتافتہ چندے خدمت حضور ہمایوں را بایں خیر خواہ سراپا اعتقاد واگزارند بعد از آں ہرچہ در مرآت رائے جہاں آرا جلوہ ظہور نماید شرف بروز خواہد یافت۔ س م ح

جاتا ہے) پس وہ بھی جھٹ پٹ آن پہنچا اور اورنگ زیب کے لشکر اور آگرہ کے مابین جمنا کے کنارے ڈیرے آن لگائے۔ مگر تین چار روز تک دونوں لشکر آمنے سامنے اسی طرح چپ چاپ پڑے رہے اور اس عرصہ میں اگرچہ شاہجہاں نے خط پر خط بھیجے اور لکھا کہ سلیمان شکوہ قریب پہنچ گیا ہے خبردار سوئے تدبیری سے بے موقعہ جلدی نہ کر بیٹھنا بلکہ مناسب یہ ہے کہ آگرہ سے کسی قدر اور قریب ہو جاؤ اور سلیمان شکوہ کے آجانے تک لشکر کو کسی مناسب جگہ ٹھیرا کر ارد گرد خندق کھدوا لو اور مورچے باندھ لو مگر اُس نے ان کے جواب میں صرف اتنا ہی لکھ بھیجا کہ حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں انشاء اللہ تعالیٰ تین دن گذرنے نہ پائیں گے کہ اورنگ زیب اور مراد بخش کو ہاتھ پاؤں باندھ کر حاضر کردوں گا اُس وقت حضور کو اختیار رہے کہ جو مناسب ہو ان کو سزا دیں اور یہ جواب روانہ کرکے لڑائی کی تیاری شروع کر دی[1]۔

داراشکوہ کی صف آرائی

چنانچہ سب سے آگے تو توپ خانہ قائم کیا اور آہنی زنجیروں سے توپوں کو اس طرح باہم جکڑ دیا کہ دشمن کے سواروں کو حملہ کرکے گھس آنے کی گنجائش نہ رہی اور اُس کے پیچھے زنبورخانہ کے رسالوں کا پرا جمایا جن کے اونٹوں کی پیٹھ پر زنبورک جو ہمارے جہازی جزائلوں سے مشابہ ہیں کسے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ لوگ اُن کو اونٹ پر چڑھے چڑھائے بآسانی بھر کر چلا سکتے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سی صفیں پیدل بندوقچیوں کی تھیں اور باقی فوج سواروں کی تھی جن کے پاس یا تو تلواریں اور برچھیاں تھیں یا تلواریں اور تیر کمان۔ چنانچہ برچھی تو راجپوتوں کا ہتھیار ہے۔ اور تیر و کمان عموماً مغلوں کا۔ اور یہ بات میں پہلے لکھ ہی چکا ہوں کہ آج کل ہندوستان میں گورے رنگ کے سب نووارد مسلمانوں کو خواہ عرب ہوں خواہ رومی۔ ایرانی ہوں خواہ تورانی مغل ہی کہتے ہیں۔

اس کے بعد داراشکوہ نے فوج کے تین حصے قرار دیئے چنانچہ دائیں پرے کا سردار خلیل اللہ خاں کو بنایا جس کے تحت میں تیس ہزار مغل تھے اور بائیں پرے کی سرداری رستم خاں

[1] شاہجہاں نے جو حتی الامکان لڑائی کو روکنا چاہتا تھا باوجود ضعف و نقاہت اور سخت گرمی کے یہ چاہتا تھا کہ خود جا کر دونوں لشکروں کے مابین اُتر پڑے یہاں تک کہ پیش خیمہ بھی بھیج دیا تھا۔ اور بیماری و کمزوری کی وجہ سے بہ سواری کشتی موقعہ فساد پر پہنچنا چاہا تھا۔ مگر اُس وقت کے مورخوں نے لکھا ہے کہ داراشکوہ نے اس تجویز کو اپنے مدعا کے برخلاف سمجھ کر عمل میں نہ آنے دیا۔ س م ح

دکھنی کو جو بڑا شجاع اور نامور سردار تھا تفویض ہوئی اور راؤ ستر سال (ہاڑہ)، اور رام سنگھ (راٹھور معروف روٹملہ) کو اس کے شامل کر دیا۔ خلیل اللہ خاں کو دانشمند خاں کی جگہ (جس کی کچھ دنوں بعد میں نے ملازمت اختیار کر لی تھی)، سواروں کی فوج کا "بخشی" یعنی سپہ سالار بنایا گیا تھا۔ اور اس کی یہ وجہ تھی کہ دانشمند خاں کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ کوئی شخص شاہجہاں کے شاہانہ اختیارات میں مداخلت کرے اور چونکہ یہ امر دارا شکوہ کی ناراضی کا باعث تھا اس لئے اُس نے اپنے منصب سے استعفا دیدیا تھا۔

اورنگ زیب اور مراد بخش نے بھی قریباً اسی قاعدہ سے اپنی فوج کو میدان میں کھڑا کیا البتہ یہ بات زیادہ کی کہ اُمرا کی فوجوں میں جو دونوں طرف یعنی دائیں بائیں تھیں کچھ ہلکی توپیں پوشیدہ طور پر لگا دیں۔ کہتے ہیں کہ یہ حکمت میر جملہ کی بتائی ہوئی تھی جس کا نتیجہ کسی قدر اچھا ہی نکلا۔

ہندوستان کا طریقۂ جنگ

مجھے معلوم نہیں کہ اس لڑائی میں کوئی اور جنگی حکمت بھی کی گئی ہو بجز اس کے کہ مقابل کی صف کے اکثر حصوں سے ایک قسم کے بان دونوں طرف کے سواروں پر چلائے جاتے تھے۔ جن سے اکثر گھوڑے بھڑک جاتے تھے اور کبھی کبھی کچھ آدمیوں کا بھی نقصان ہو جاتا تھا۔ مگر میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہاں کے سواروں کی چلت پھرت بہت اچھی ہے اور لڑائی کے وقت گھوڑوں کو بہ آسانی پھراتے اور چکر وغیرہ دینے میں بہت مشاق ہیں۔ اور تیر اندازی تو ایسی عجیب سرعت کے ساتھ کرتے ہیں کہ جتنی دیر میں برقنداز و بندوقیں چھوڑے سوار چھ تیر چلا سکتا ہے۔ اور نہایت اچھی طرح سے صف بندی قائم رکھتے اور بخوبی مجتمع رہتے ہیں۔ خصوصاً حملہ کے وقت دشمن پر خوب اکٹھے ہو کر گرتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ میں ان کو لڑائی کے فن میں فرنگستان کی فوج سوار کے مانند قابل اور ہوشیار نہیں سمجھتا۔ اور اس کا سبب اس کتاب کے ایک اور مقام میں بیان کروں گا۔

لڑائی کا مقابلہ

اب لڑائی کی کیفیت سنئے کہ جس وقت دونوں طرف بخوبی تیاریاں ہو چکیں تو یہاں کے دستور کے مطابق اول گولہ چلنا شروع ہوا اور پھر تیر اس کثرت سے برسنے لگے کہ گویا بادل چھا گیا مگر لڑائی کی گرما گرمی میں یکایک مینہ کا ایک ایسا

چھینٹا پڑا کہ لڑائی جو خوب سرگرمی سے ہو رہی تھی تھوڑی دیر کے لئے ذرا ٹھنڈی پڑ گئی۔ مگر بارش کے رکتے ہی پھر توپیں چلنے لگیں اور دارا شکوہ اس وقت سراندیپ کے ایک خوبصورت ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا اور سب طرف سے دھاوا کرنے کا حکم دیتا ہوا بذات خود سواروں کی ایک فوج کے ساتھ دشمن کی توپیں چھین لینے کو بڑی جرأت سے بڑھا۔ مگر مخالفوں نے ایسی مستعدی اور استقلال سے مقابلہ کیا کہ دارا شکوہ کے اردگرد آن کی آن میں کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور نہ صرف وہ فوج جو اس کے ساتھ تھی بلکہ بہت سی اور بھی جو پیچھے سے آن ملی تھی سب تتر بتر کر دی لیکن دارا شکوہ ایک عجیب استقلال کے ساتھ میدان میں قائم اور ہاتھی پر بیٹھا چاروں طرف بڑی دلیری اور بے باکی سے برابر نظر ڈالتا ہوا لڑائی سنبھالنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ اس کی دیکھا دیکھی اہلِ فوج بھی دلیر ہو گئے اور نامستقل مزاج اور تھڑدلے سپاہی جو جگہ چھوڑ گئے تھے، پھر اپنے اپنے موقعہ پر آن جمے اور دارا شکوہ نے اگرچہ پھر کئی متواتر حملے کئے مگر اورنگ زیب تک نہ پہنچ سکا کیونکہ دشمن کے توپ خانہ نے اس قدر نقصان پہنچایا اور ایسا زور باندھا کہ بعض سپاہیوں کے دل چھوٹ گئے بلکہ کچھ بھاگ بھی نکلے لیکن دارا شکوہ کی شجاعت و دلیری نے ایسا اثر کیا کہ اکثر سپاہیوں نے منہ نہ موڑا اور اپنے بہادر سپہ سالار کی رکاب میں اس تیزی سے بڑھے کہ آخرکار توپوں تک جا ہی پہنچے اور ان کی زنجیریں کھول ڈالیں اور دشمن کی خیمہ گاہ میں جا گھسے اور زنبور خانہ کے رسالوں اور پیادوں کی فوج کو مار کر بالکل بھگا دیا۔ مگر اس وقت سواروں کی فوجوں کے باہم نہایت ہی زور شور سے لڑائی ہوئی اور اس کثرت سے تیر برسے کہ آسمان کا دکھائی دینا دشوار ہو گیا یہاں تک کہ خود دارا شکوہ نے اپنا ترکش خالی کر ڈالا۔ مگر ان تیروں سے فریقین کا چنداں نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ دس میں سے نو تیر یا تو نشانہ تک پہنچتے ہی نہ تھے یا ادھر ادھر جا گرتے تھے جب ترکش خالی ہو چکے تو تلواروں کی نوبت آئی اور فریقین اس شدت سے لڑے کہ جس قدر سپاہی مارے جاتے تھے اسی قدر جوش بڑھتا جاتا تھا اور دارا شکوہ بڑی شجاعت سے پکار پکار کر اہلِ فوج کو برابر تسلی اور بڑھاوے دیئے جاتا اور حملہ پر حملے کئے جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار دشمن کے سواروں کو بھی بھگا دیا اور اورنگ زیب نے جو ہاتھی پر سوار اور نزدیک ہی تھا ہر چند سپاہ کے قائم رکھنے میں بہت کوشش کی

لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور اگرچہ اپنے خاص الخاص سواروں سے بھی چاہا کہ داراشکوہ کو روکیں لیکن اُن کو بھی میدانِ جنگ سے نہایت ابتری کے ساتھ بھاگنا ہی پڑا۔ مگر واہ رے اورنگ زیب تیری دلاوری! جب دیکھا کہ تمام فوج بھاگ گئی اور جو لوگ اب تک صحیح و سالم اور حاضر رکاب ہیں وہ بھی ایک ہزار سے زیادہ نہیں۔ (بلکہ میں نے سُنا ہے کہ قریب پانچ سو ہی کے تھے) اور اس حالت پر بھی غور کیا کہ بلالحاظ زمین کی ناہمواری اور نشیب و فراز کے (جو دونوں لشکروں میں حائل تھی) داراشکوہ اب ہماری اس تھوڑی سی باقی ماندہ فوج پر ضرور حملہ کرے گا تو ذرا بھی نہیں ڈرا بلکہ اپنے سرداروں کو نام لے کر پکارا کہ

"بہادرو۔ خدا پر نظر رکھو! بھاگنے سے کیا ہوگا؟ خدا سب جگہ ہے کیا تم نہیں جانتے کہ ملک دکن کس قدر دور ہے؟"

اورنگ زیب کی ثابت قدمی

اور اپنا یہ عزم جتانے کو کہ خواہ کچھ ہی ہو میدان سے ہرگز نہ ٹلوں گا یہ عجیب[1] حکم دیا کہ "ہمارے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دو" حقیقت یہ ہے کہ اگر ائس کے حاضر رکاب رفقا اور جاں نثار سردار اس نازک وقت میں وفاداری اور ہمت میں کچھ کمی کرتے تو ہاتھی کے پاؤں میں ضرور زنجیر ڈال دی جاتی مگر ان لوگوں نے بالاتفاق اپنی جان نثاری اور وفاداری کے مضبوط وعدوں سے اورنگ زیب کو ایسا نہ کرنے دیا اور داراشکوہ نے اگرچہ نہایت کوشش کی کہ جس طرح ممکن ہو اورنگ زیب کو جا لے۔ لیکن زمین کے نشیب و فراز اور دشمن کے شکست یافتہ سواروں کی وجہ سے جو اب تک میدان میں اور ٹیلوں پر ادھر ادھر موجود تھے (گو بے ترتیب طور پر پھر رہے تھے) اُس تک نہ پہنچ سکا۔ داراشکوہ کا یہ خیال بے شک صحیح تھا کہ اورنگ زیب کے مارے یا پکڑے جانے کے بغیر فتح ناقص ہے اور چونکہ اورنگ زیب اب مقابلہ کے قابل نہ رہا تھا اس لئے اُس کو فی الواقع ایسا ہی کرنا واجب تھا کہ فوراً حملہ کر کے اپنے اس خوفناک رقیب کو بہ آسانی پامال کر دیتا۔ لیکن بعض واقعات کے سبب سے جن کا ذکر میں ابھی کرتا ہوں داراشکوہ کا خیال ایک اور طرف رجوع ہو گیا اور اورنگ زیب

---

[1] ہندوستان کے بہادر سردار کڑے وقت میں بھاگنے کی بہ نسبت جان دے دینے کو بہتر سمجھ کر اکثر ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ س م ح

جو کھوں سے بچ گیا۔ یعنی دارا شکوہ کو اس خطرناک موقعہ پر اپنی فوج کے بائیں پرے میں بڑی ہل چل نظر آئی۔ اور اُس کا ایک مصاحب یہ خبر لایا کہ رستم خاں اور ستر سال کام آئے اور رام سنگھ روٹھلہ جو بڑی شجاعت کے ساتھ دھاوا کرکے دشمن کی فوج میں جا گھسا تھا گھر گیا ہے۔ پس اورنگ زیب پر دھاوا کرنے کا ارادہ چھوڑ کر اُسے اپنے بائیں پرے کی مدد کو نہایت جلدی کے ساتھ جانا پڑا اور دارا شکوہ کے بذاتِ خود پہنچ جانے کی وجہ سے ایک سخت چپقلش کے بعد لڑائی کا رنگ پھر بدل گیا۔ اور چاروں طرف سے فوج مخالف کو پیچھے ہٹا دیا گیا۔ لیکن اُنھوں نے ابھی ایسی شکست نہیں کھائی تھی کہ دارا شکوہ کو بالکل بے فکری ہو جاتی۔ اس مار دھاڑ میں رام سنگھ روٹھلہ نے ایک بے نظیر شجاعت کے ساتھ مراد بخش کو جا زخمی کیا اور کمال دلیری سے اُس کی عماری کے چند رسیوں کو کاٹ ڈالا اور قریب تھا کہ حریف کو ہاتھی سے گرا لے۔ مگر مراد بخش کی پھرتی اور شجاعت کے باعث ناکام رہا۔ مراد بخش اگرچہ زخمی[۲] اور راجپوتوں کے نرغہ میں تھا لیکن ڈھال سے اپنے سات برس کے بچے کو جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا بچاتے ہوئے بڑے استقلال سے بدستور لڑتا رہا اور تاک کر ایسا تیر مارا کہ یہ بہادر راجہ وہیں کھیت رہا۔ دارا شکوہ کو اگرچہ اس خبر سے بہت رنج ہوا۔ مگر چونکہ اُس نے سُنا کہ اپنے مالک کے مارے جانے کی وجہ سے راجپوتوں نے نہایت غیظ و غضب کے ساتھ مراد بخش کو گھیرا ہوا ہے۔ اس لئے باوجود چند طرح کی مشکلوں کے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ مراد بخش پر حملہ کیا جائے۔ اور اس صورت میں اگرچہ اورنگ زیب گرفتاری سے بچ جاتا تھا اور یہ ایک غلطی تھی مگر مراد بخش کے ہاتھ آجانے کو بھی وہ اورنگ زیب کے پکڑے جانے سے

---

[۱] رام سنگھ کا مراد بخش پر حملہ کرنا اور مراد بخش کے تیر سے اُس کا مارا جانا تو صحیح ہے مگر اُس کے ہاتھی کے کچھار بند کو کاٹنے کے لئے کوشش کرنا درست نہیں کیونکہ فارسی تاریخوں سے بالاتفاق ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دلیرانہ حملہ خود اورنگ زیب کے ہاتھی پر ہوا تھا اور جس نے حملہ کیا تھا وہ مہاراجہ جسونت سنگھ جودھپور یہ کا چچیرا بھائی راجہ روپ سنگھ راٹھور تھا جو اورنگ زیب کے منع کرتے کرتے جو اُس کی اس بے مثل بہادری کی وجہ سے اُس کو بچانا چاہتا تھا لڑائی کے ہڑبونگ میں اورنگ زیب کے سپاہیوں کے ہاتھ سے وہیں مارا گیا۔ س م ح

[۲] تیروں کے زخم منہ پر لگے تھے۔ س م ح

کچھ کم نہیں سمجھتا تھا۔

داراشکوہ کی شکست

لیکن خلیل اللہ خاں کے دغا دینے سے بازی بگڑ گئی۔ اور یہ دغابازی ایسی عجیب تھی کہ ایک آن کی آن میں داراشکوہ کی دائمی بربادی کا سبب ہو گئی۔ یہ شخص دائیں پرے کا سردار تھا جس میں تیس ہزار مغل تھے۔ اور یہ ایسی اچھی فوج تھی کہ اورنگ زیب کی تمام سپاہ کے شکست دینے کو صرف یہی کافی تھی۔ مگر جب کہ داراشکوہ بذاتِ خود بائیں پرے کی فوج کو بڑی شجاعت اور کامیابی سے لڑا رہا تھا یہ مطلقاً اُس کا شریک نہ ہوا۔ اور یہ بہانہ بنائے رکھا کہ

"ہماری فوج کے لئے تو یہ حکم ہے کہ بطور کمک اپنی جگہ قائم رہے۔ اور جب تک کوئی شدید ضرورت پیش نہ آئے ایک قدم آگے بڑھنے اور ایک تیر تک کے چلانے کا حکم نہیں۔"

مگر اصل یہ ہے کہ اُس کا اس طرح پر الگ تھلگ رہنا پرلے سرے کی بے ایمانی اور دغابازی پر مبنی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اب سے چند سال پیشتر داراشکوہ نے اُس کی کچھ بے عزتی کر ڈالی تھی۔ اور اس کینہ کی آگ اُس کے دل کو جلاتے رکھتی تھی۔ پس اُس نے خیال کیا کہ بدلہ لینے کا اب وقت ہے مگر داراشکوہ کا جو نقصان اُس نے اپنے الگ رہنے میں سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ کیونکہ دائیں پرے والوں کی مدد کے بغیر ہی وہ دشمن پر غالب آگیا تھا۔ مگر اس دغاباز نے اب ایک اور چال چلی یعنی جب کہ داراشکوہ مراد بخش کے دبا لینے کو اپنی سپاہ کی امداد کے لئے جا رہا تھا یہ مکار؛ معہ اپنے چند رفیقوں کے گھوڑا دوڑاتے آیا۔ اور دور سے پکار کر کہا۔

"مبارک باد حضرت سلامت! الحمد للہ، الحمد للہ، حضور کو بخیر و سلامتی بادشاہی اور فتح مبارک ہو! لیکن حضور یہ تو فرمائیں کہ ایسے خطرناک موقعہ پر جب کہ عماری کے سائبان سے کئی گولیاں اور تیر پار ہو چکے ہیں اتنے بڑے ہاتھی پر کیوں سوار ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان بے شمار تیروں اور گولیوں میں سے کوئی جسم مقدس کو چھو جائے تو ہم لوگوں کا کہاں ٹھکانا ہے۔ خدا کے واسطے جلد اتریئے اور گھوڑے پر سوار ہو لیجئے۔ اور اب کیا رہ گیا ہے۔ صرف اتنی ہی بات باقی ہے کہ ان چند بھگوڑوں کا زیادہ تر چستی اور مستعدی سے تعاقب کیا جائے۔"

اور میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اب حضور ان کو اس قدر مہلت نہ دیں کہ بھاگ سکیں"
اگر دارا شکوہ ہاتھی پر سے اُترنے کو نقصان سمجھتا اور یہ سوچتا کہ اس ہاتھی ہی کی بدولت آج میں کیسے کیسے کام کر سکا ہوں اور فوج کو میرے دکھائی دیتے رہنے سے کیسا کچھ فائدہ ہوا ہے تو وہ ہی تمام بادشاہت کا مالک ہوتا۔ لیکن زود اعتقاد اور سادہ شاہزادہ فریب میں آگیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُس کو شک ہوا۔ اور پوچھا کہ خلیل اللہ خاں کہاں ہے۔ مگر وہ اب کہاں تھا۔ اور کب اُس کے ہاتھ آتا تھا۔ اور دارا شکوہ اگرچہ اُس کو بہت بُرا بھلا کہتا رہا اور یہ بھی کہا کہ میں اُسے زندہ نہ چھوڑوں گا۔ لیکن اُس کا یہ غصہ اور دھمکیاں سب بیکار اور بے فائدہ تھیں۔ کیونکہ سپاہ نے جب دیکھا کہ ہمارا مالک ہاتھی پر نہیں ہے تو فوراً اُس کے مارے جانے کی افواہ اُڑ گئی۔ اور تمام فوج اس دھوکے میں پڑ کر حواس باختہ ہو گئی۔ اور عام تہلکہ پڑ گیا۔ اور سب کو اورنگ زیب کے قہر و غضب کے اندیشہ سے اپنی اپنی جان کی پڑ گئی۔ اور چند لمحہ میں تمام فوج تتر بتر ہو گئی۔ اور عجب انقلاب ہوا کہ غالب مغلوب اور مغلوب غالب ہو گیا۔ اور عجیب ماجرا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف پاؤ گھنٹے ہاتھی پر سوار رہنے سے یہ نتیجہ پایا کہ تمام ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اور دارا شکوہ کو چند لمحہ قبل از وقت اپنے ہاتھی پر سے اُترنے کا یہ پھل ملا کہ ہاتھی سے کیا اُترا گویا اوج سلطنت سے گر گیا۔ اور بدبخت بادشاہوں اور شہزادوں کی فہرست میں داخل ہو گیا۔ دیکھئے انسان کیا کوتاہ اندیش ہے۔ اور ایک چھوٹی سی بات سے اس دنیا میں کیسے کیسے بڑے نتیجے پیدا ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کی فوجی تنظیم اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لشکروں سے بڑے بڑے نمایاں کام بن پڑتے ہیں۔ لیکن فوج کی کثرت میں یہ بڑی خرابی ہے کہ ایک بار ابتر ہو جائے تو پھر اُس کو حالتِ سابقہ پر لانا مشکل ہو جاتا ہے اور جیسے کوئی بڑا دریا اُچھل کر کناروں سے باہر بہہ نکلتا اور اُس کا پانی پھیل جاتا ہے۔ اسی طرح ابتری کے بعد بڑے لشکروں کو قابو میں لانا ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ میں جب اِن بے انتظام[1] فوجوں کو دیکھتا تھا

[1] ہندوستانی مغل فوج کی تنظیم قدیم ترک فوج کی تنظیم کے اصول و قواعد پر ہی قائم تھی اور یہی وہ فوجی تنظیم ہے جس نے قسطنطنیہ پر یورپی فوج کے ٹڈی دل کے چھکے چھڑا دیئے تھے یہ متعصب فرنچ سیاح صلیبی جنگوں اور عثمانی ترکوں کے مقابلہ کو بھول گیا ہے ورنہ وہ پرنس کانڈی اور مارشل تورین کا نام لیتے ہوئے شرماتا۔

کہ حیوانوں کے گلوں کی مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف پچیس ہزار کار آزمودہ سپاہی زیر حکم پرنس کانڈی یا مارشل تورین ہندوستان کی فوج پر جو کتنی ہی کیوں نہ ہو غالب آسکتے ہیں اور جب میں کتابوں میں پڑھتا ہوں کہ یونانیوں کی دس ہزار سپاہیوں نے جو سکندر کے ساتھ تھے ایران کے بادشاہ دارا کے چھ سات لاکھ آدمیوں کے لشکر کو شکست دی تھی (بشرطیکہ یہ بات سچ بھی ہو کہ دارا کی فوج بھیڑ کے سوا فی الواقع اتنی ہی تھی) تو باقاعدہ اور بے قاعدہ فوجوں کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد مجھے ان روایتوں کی صحت پر کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ اور میری دانست میں فرانسیسی سپاہ دشمن کے حملے کو اپنے معمولی استقلال سے رد کر کے ہر ایک ہندوستانی فوج کو سخت تہلکہ میں ڈال سکتی یا سکندر کی طرح دشمن کی صف کے ایک خاص حصہ پر اپنا تمام زور ڈال کر باقی سپاہ میں اپنا سخت خوف اور عام بدنظمی اور انتشار پھیلا سکتی ہے۔

اورنگ زیب کی شاطرانہ چالیں

اورنگ زیب جو اپنی مطلب براری کے واسطے ہر شاطرانہ حرکت اور فن و فریب کے لئے ہمیشہ ہی تیار رہتا تھا یہ غیر مترقب اور خداداد فتح پاکر اور یہ سمجھکر کہ میرے معمولی ہتھکنڈوں کے کام میں آنے کا اب موقعہ ہے اپنی مکاری کی چالوں اور توڑ جوڑ میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے: غاباز خلیل اللہ خاں آن موجود ہوا اور تسلیم بجالا کر عرض کیا کہ بجا آوری خدمات کے لئے حاضر ہوں۔ اور جس قدر فوج سردست اُس طرف سے پھٹ کر میرے ساتھ آسکی ہے وہ بھی حاضر ہے۔ چنانچہ شہزادہ (اورنگ زیب) نے بے حد اظہار عنایت کیا اور بڑے بڑے وعدے دیئے۔ مگر احتیاطاً سب وعدے مراد بخش کی طرف سے کرتا رہا۔ اور اُس کے پاس لے گیا۔ اور موقعہ وقت کے موافق اُس نے بھی بہت ہی کچھ آؤ بھگت اور خاطر داری کی اور اورنگ زیب اگرچہ بظاہر مراد بخش کو برابر شاہ ہندوستان کہکر گفتگو کرتا رہا اور خلیل اللہ سے کہا کہ

> صرف حضرت ہی تخت نشینی کے لائق ہیں۔ اور یہ فتح محض انھیں کی قابلیت اور شجاعت سے حاصل ہوئی ہے۔ مگر باطن کا یہ حال تھا کہ شب و روز امرائے سلطنت کو تحریریں بھیج بھیج کر بند ریج اپنی طرف متوجہ اور رجوع کرتا جاتا تھا۔

ان دنوں اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں بھی اپنے اس بھانجے کے حق میں بہت کچھ کوشاں تھا۔ اور فی الحقیقت اُس کی مدد سے اورنگ زیب کو فائدہ بھی بہت ہی پہنچا۔ کیونکہ شائستہ خاں ایک چست وچالاک اور نہایت مدبّر اور ذی اقتدار امیر تھا اور تمام ہندوستان میں اُس کے یہ اوصاف مشہور تھے کہ حسنِ تقریر اور خوبی انشاوتحریر وفصاحتِ بیانی اور شیریں زبانی سے بڑے بڑے کام نکال سکتا ہے۔ اور مشہور ہے کہ کسی حقیقی یا خیالی تحقیر کے باعث جو دارا شکوہ کی طرف سے اُس کی لسبت ظہور میں آئی تھی یہ اُس سے نہایت نفرت رکھتا تھا اور اسی وجہ سے دارا شکوہ کی بربادی کے لئے اس موقعہ کو اس نے بھی غنیمت سمجھ لیا تھا۔[1]

باوجود اس فتح کے حضرت اورنگ زیب بہادر اپنی وہی چال چلے جاتے تھے۔ یعنی بے غرضی اور خلوص نیت کے لباس میں حصول سلطنت کے منصوبہ کو پوشیدہ کئے ہوئے تھے اور جو کچھ پیام وسلام اور وعدے وعید اور کارروائیاں کی جاتی تھیں وہ سب مراد بخش کے نام سے ہوتی تھیں۔ اور اُسی کو بادشاہ بنا رکھا تھا اور اپنے تئیں صرف اس کا نائب اور ایک فرماں بردار خیر خواہ بیان کرتا اور ایسی باتیں بناتا تھا کہ سلطنت کی شان وشوکت اور کروفر گویا اُسے مرغوب ہی نہیں بلکہ فقیرانہ گذران کرنا اور حالت فقیری ہی میں مرجانا اُس کی دلی مراد اور عین تمنا ہے۔

دارا شکوہ کا فرار

اس وقت دارا شکوہ خوف وخطر کے دریا میں ڈوبا ہوا سخت ناامید تھا۔ اگرچہ وہ فوراً آگرہ چلا آیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ الفاظ اُس کو یاد تھے جو شاہجہاں نے لڑائی پر جاتے وقت کہے تھے۔ اس لئے بادشاہ کے سامنے نہ ہو سکا مگر شاہجہاں نے بہرحال ایک وفادار خواجہ سرا کی زبانی اس بدنصیب شہزادہ کی تسلی اور تسکین کے لئے یہ کہلا بھیجا کہ

"میں اب بھی تم کو ویسا ہی چاہتا ہوں اور تمھاری اس مصیبت کا مجھے بہت رنج ہے۔ بلکہ یہ بھی کہلا بھیجا کہ ابھی سلیمان شکوہ کی فوج اور لشکر

---

[1] اورنگ زیب سے سازش رکھنے کے شبہ میں مالوہ کی صوبہ داری سے تو پہلے ہی معزول ہو چکا تھا۔ جیسا کہ ایک حاشیہ میں ہم لکھ آئے ہیں۔ مگر اس کے بعد جاگیر بھی ضبط ہو گئی تھی۔ بلکہ دو چار روز قید رہنے کی بے عزتی کا بھی صدمہ اٹھا چکا تھا۔ س م ح

سب صحیح و سلامت ہے نا اُمید ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اور ہماری صلاح یہ ہے کہ بالفعل تم دہلی کو چلے جاؤ صوبہ دار کو حکم بھیج دیا گیا ہے وہ تم کو بادشاہی اصطبل میں سے ایک ہزار گھوڑا اور خزانہ اور ہاتھی دے گا۔ اور آگرہ سے دور نہ جانا چاہیے۔ بلکہ ایک ایسے معقول فاصلہ پر ٹھیرنا مناسب ہے کہ جہاں ہماری تحریریں تم کو آسانی ملتی رہیں۔ اور ہم کو اب تک یہ اُمید ہے کہ ہم اورنگ زیب کو قابو میں لا سکیں گے بلکہ سزا دے سکیں گے۔"

مگر دارا شکوہ ایسا شکستہ خاطر اور اس قدر غمگین تھا کہ ان محبت آمیز باتوں کا کچھ جواب نہ دے سکا بلکہ معقول طور پر اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ آپ کا پیغام میرے پاس پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد بیگم صاحب کے پاس چند پیغام بھیج کر آدھی رات کے وقت مع اپنی بیگم اور بیٹوں اور اپنے فرزند سپہر شکوہ اور قریب تین چار سو آدمیوں کے دہلی کی طرف چل دیا۔

سلیمان شکوہ کی صحرا نوردی اب ہم دارا شکوہ کے دہلی جانے کے احوال کو کہ وہ کس غمگینی اور شکستہ دلی سے روانہ ہوا یہیں چھوڑتے ہیں۔ اور اورنگ زیب کے اس جوڑ توڑ کا حال لکھتے ہیں جو اس نے بڑی دور اندیشی اور حسنِ تدبیر سے آگرہ پہنچ کر کیے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ تدبیر کی کہ سلیمان شکوہ کے لشکر میں نا اتفاقی کا بیج بویا بلکہ بعض سرداروں کو اپنی طرف کر بھی لیا۔ اور اس تدبیر سے دارا شکوہ کی امیدوں کا بالکل خاتمہ کر دیا یعنی راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں جو سلیمان شکوہ کے لشکر کے سب سے بڑے سردار تھے۔ اُن کو لکھا کہ دارا شکوہ بالکل تباہ ہو گیا ہے اور وہ بڑا لشکر جس پر اُس کو اس قدر گھمنڈ تھا شکست فاش کھا کر ہمارا مطیع ہو گیا ہے اور وہ ایسی بے سروسامانی سے بھاگا ہے کہ سواروں کا ایک رسالہ تک ساتھ نہیں۔ اور اُمید ہے کہ ہم بہت جلد اس کو گرفتار کر لیں گے۔ اور حضرت شاہجہاں اس قدر علیل ہیں کہ صرف چند روز کے مہمان اور چراغ سحری ہیں۔ پس اس حالت میں اگر تم ہم سے مقابلہ کرو گے تو نتیجہ بجز خرابی اور ہلاکت کے کچھ نہ ہو گا۔ دارا شکوہ کی اس ابتر حالت میں اُس کی طرف داری کرنا نہایت ہی نادانی ہے۔ اور تمھارے حق میں اب یہی بہتر ہے کہ ہمارے پاس حاضر ہو جاؤ۔ اور سلیمان شکوہ کو جو آسانی گرفتار ہو سکتا

ہے پکڑ کر ساتھ لیتے آؤ۔

جے سنگھ اور دلیر خاں اگرچہ چندے متامل اور متردد رہے۔ کیونکہ اب تک شاہجہاں اور دارا شکوہ سے ڈرتے تھے اور شاہزادہ پر ہاتھ ڈالنے سے بھی اس وجہ سے خوف کھاتے تھے کہ ایسی حرکت بالفعل یا آئندہ کسی دن ہمارے حق میں مضر اور موجب سزا ہو سکتی ہے۔ اور عجب نہیں کہ خود اورنگ زیب ہی کے ہاتھ سے سزا مل جائے۔ اور یہ بھی خوب معلوم تھا کہ سلیمان شکوہ کیسا عالی دماغ و غیور اور بلند حوصلہ و دلیر شاہزادہ ہے اور بے شک جان دے دے گا مگر قید کبھی نہ ہوگا۔ مگر آخرکار دونوں نے یہ ٹھہرایا کہ راجہ جے سنگھ سلیمان شکوہ کے خیمہ میں جائے اور اورنگ زیب کی تحریریں دکھا کر اپنی رائے سے اُس کو مفصل اور پوست کندہ مطلع کر دے۔ چنانچہ راجہ نے شہزادہ سے جا کر کہا کہ جس خطرناک حالت میں آپ پڑے ہوئے ہیں مناسب نہیں کہ میں اُس کو آپ سے پوشیدہ رکھوں۔ اور معاملات کی حالت ایسی بدل گئی ہے کہ اب آپ کو نہ تو دلیر خاں ہی پر اعتماد کرنا چاہیے اور نہ داؤد خاں اور اپنی فوج ہی پر۔ اور اگر آپ اپنے باپ کی امداد کے ارادہ سے ذرا بھی آگے بڑھیں گے تو بے شک تباہ اور برباد ہو جائیں گے۔ پس مناسب یہ ہے کہ آپ سری نگر کے پہاڑوں کو چلے جائیں۔ وہاں کا راجہ یقیناً آپ کو بہت خاطرداری سے رکھے گا اور ملک کے دشوار گذار ہونے کے باعث اورنگ زیب سے اُس کو کچھ ڈر بھی نہیں ہے۔ اور اُس محفوظ جگہ میں کچھ دنوں ٹھہر کر آپ حالات اور واقعات پر نظر رکھیں اور جب موقعہ معلوم ہو تو با سانی وہاں سے آ کر مقتضائے وقت کے موافق عمل کر سکتے ہیں۔

شہزادہ یہ گفتگو سنتے ہی سمجھ گیا کہ اب نہ تو جے سنگھ ہی اپنا ہے اور نہ لشکر ہی اور سب برگشتہ ہیں۔ اور یہاں ٹھہرنا جان جوکھوں میں پڑنا ہے پس ناچار فوج و لشکر کو وہیں چھوڑ کر اپنے چند نمک حلال اور خالص رفیقوں کے ساتھ جو اکثر منصب دار اور زات کے سید تھے۔ اور جنھوں نے اُس کی رفاقت کا ترک کرنا خلافِ شرافت سمجھا کوہستان کی طرف چل دیا۔ مگر جے سنگھ اور دلیر خاں ایسے کمینے نکلے کہ کچھ سپاہی بھیج کر اُس بیچارے کا مال و اسباب لوٹ منگایا۔ جس میں اشرفیوں سے لدا ہوا ایک ہاتھی بھی تھا۔ اور ان کی اس نالایق حرکت کے باعث سلیمان شکوہ کے بہت سے ہمراہی شکستہ خاطر ہو کر اُس سے جدا ہو گئے۔ اور جو باقی رہے اُن کو اکثر دیہاتی گنواروں نے لوٹ کھسوٹ

کر تباہ کر دیا بلکہ ان کے ہاتھوں سے بہتیرے مارے بھی گئے مگر جس طرح بن پڑا یہ گرتا پڑتا اپنی بیگم اور اہل و عیال کو ساتھ لیئے ہوئے سری نگر جا پہنچا اور وہاں کا راجہ اُس کے رُتبہ کے لایق تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور تسلی کی کہ جب تک آپ اس ملک میں ہیں میری تمام سپاہ آپ کی مدد کے لیئے حاضر ہے اور آپ کو کچھ خوف و خطر نہیں ہے[1]

---

[1] عالمگیر نامہ میں سلیمان شکوہ کے سری نگر جانے کے حالات کو بہت طوالت سے لکھا ہے مگر ہم اُس کا خلاصہ یہاں لکھتے ہیں کہ "جب سلیمان شکوہ الہ آباد سے تین منزل اس طرف آپہنچا۔ تو لڑائی کے چوتھے دن باپ کی شکست کی خبر ملی۔ اور اس تشویش کی حالت میں جو راجہ جے سنگھ سے صلاح پوچھی تو اُس نے یہ مشورہ دیا کہ اول تو جس طرح بنے دہلی پہنچ کر اپنے باپ کے ساتھ شامل ہو جایئے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہٹ کر الہ آباد جا ٹھیریئے اور موقع وقت کا انتظار کیجیئے۔ اور جب وہ الہ آباد جانے کو تیار رہا تو رفاقت سے جواب دیدیا۔ بلکہ عین روانگی کے وقت اپنے دوست دلیر خاں کو بھی اونچ نیچ سمجھا کر ساتھ جانے سے روک لیا۔ اور اس حالت کو دیکھکر اور سرداروں نے بھی اُسی کی پیروی کی۔ اور اگرچہ شہزادہ کی ذاتی رائے دہلی پہنچنے کی تھی۔ مگر اُس کا اتالیق بہادر خاں اُس کو الہ آباد لے گیا۔ کیونکہ یہاں کا مستحکم قلعہ داراشکوہ کے ایک معتمد ملازم سید قاسم عرف سید کا سوبارہ وال کے قبضہ میں تھا۔ اور چند روز ٹھیر کر لکھنؤ کی راہ سے قصبہ نگینہ کی طرف (جو داراشکوہ کی بڑی بہن معروف بیگم صاحب کی جاگیر میں تھا اور جس کو اس کتاب میں نعدیۂ چاندپور کر کے لکھا ہے) روانہ ہوا تاکہ گنگا کے کسی گھاٹ سے اُتر کر اور پھر سہارنپور کے قریب بوڑیہ کے گھاٹ سے دریائے جمنا کو عبور کر کے پنجاب کو باپ کے پاس چلا جائے۔ مگر جب دشمن کے مقرر کیئے ہوئے سرداروں کی مزاحمت کے باعث اس طرف سے گنگا کو عبور نہ کر سکا تو مراد آباد کے نواح سے ہوتے ہوئے ہردوار کے قریب وہاں کے زمینداروں خصوصاً راجہ سری نگر کی مدد سے اس دریا سے اُترنا چاہا۔ اور اس ارادہ سے بمقام چانڈی پہنچ کر (جس کو صاحب عالمگیر نامہ نے "محاذی ہردوار متصل ملایت سری نگر" لکھا ہے) بھوانی داس نامی اپنے دیوان "بیوتات" کو جو پہلے بھی داراشکوہ کا بھیجا ہوا وہاں ہو آیا تھا کچھ تحایف دے کر سری نگر کے راجہ کے پاس کشتیوں کے بہم پہنچانے میں مدد کرنے کے لیئے بھیجا۔ مگر اتنے میں جو امیر الامرا شایستہ خاں اور فدائی خاں بہت سی فوج کے ساتھ سامنے آموجود ہوئے اور بجز سری نگر جانے کے کچھ چارہ نہ رہا تو چانڈی سے اُٹھ کر بمقام کاناتال جو سری نگر کی حد میں داخل تھا جا ڈیرہ کیا۔ اور یہاں سے راجہ کے اہل کار پہاڑ پرلے گئے اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ چار منزل راجہ خود آگے آیا اور سری نگر لے گیا۔ اور کہا کہ آپ مختصر طور پر یہاں تشریف رکھ سکتے ہیں ۔ مگر ان ہاتھی گھوڑوں اور فوج و لشکر کی میرے اس پہاڑی اور چھوٹے سے ملک میں گنجائش نہیں ۔ اب بہادر خاں تو مرض الموت کے سبب اجازت لے کر شہزادہ سے گیا بلکہ پہاڑ سے اترتے ہی دنیا سے رخصت ہوا۔ اور باقی ماندہ سردار جونا اُمیدیوں کے باعث ادھر اُدھر کھسک جانا چاہتے تھے مگر شہزادہ کی مرضی اور راجہ کے ملازموں کی رہنمائی کے بغیر اس پہاڑی ملک میں سے نکل نہیں سکتے تھے انھوں نے کچھ جھوٹ سچ بول کر اُس کو پھر الٰہ آباد جانے کے لئے آمادہ کیا تاکہ شجاع کے ساتھ شامل ہوجائے (کیونکہ اپنی شکست کے بعد داراشکوہ نے بذریعہ خط و کتابت مصالحہ کرکے اُس کو آگرہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی)۔ الغرض شہزادہ راجہ کا شکریہ ادا کرکے اور کچھ تحفے تحائف دے کر رخصت ہوا۔ مگر نگینہ میں واپس پہنچتے ہی یہ دغا باز اور خود غرض خیرخواہ اس کو چھوڑ کر ادھر اُدھر چل دیئے اور بہ ناچاری پھر سری نگر کی طرف لوٹنا پڑا۔ اور اب سوائے سید احمد کے جس کا بھائی سید قاسم اب تک قلعہ الٰہ آباد کو تھامے ہوئے تھا اور اُس کے کوکے محمد شاہ اور دو تین اور سرداروں اور بیچاری مصیبت زدہ بیگم اور چند اور عورتوں اور سترہ نوکر چاکروں اور ہمراہیوں کے اُس تمام فوج و لشکر میں سے کوئی بھی ساتھ نہ رہا۔ اور چونکہ اس کے پہاڑ سے اُترنے کی خبر سُن کر اورنگ زیب کے بعض سردار پھر اُس کا راستہ روکنے کے لئے آپہنچے تھے۔ اس لئے یہ خوف زدہ شہزادہ گھبراہٹ میں جس قدر جواہرات اور اشرفیاں ساتھ لے سکا لے کر راتوں رات نگینہ سے چل کھڑا ہوا اور خوف کے سبب معمولی راستہ چھوڑ کر راجہ کے آدمیوں کی رہنمائی سے ایک اور راستہ سے سری نگر کو چلا گیا جہاں شہر سے نیچے آکر راجہ اُسے اپنے ہاں لے گیا۔

واضح ہو کہ شہر سری نگر مع ان پہاڑی علاقوں کے ایک حصہ کے جو اس وقت کمایوں اور سری نگر کے راجاؤں کی خود سر حکومتوں میں تھے۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ انگلشیہ کے ماتحت اور کمشنری کمایوں کا جس کا صدر مقام المورہ ہے ایک جزو اور اُن کئی برفستانی نالوں میں سے جو کوہستان ہمالہ سے نکلنے کے بعد دریائے گنگا کہلاتے ہیں الکہ نندا نامے ایک نالہ کے کنارہ سطح سمندر سے سترہ سو انچاس فٹ بلند اور ایک یورپین اسسٹنٹ کمشنر کا جائے قیام ہے۔ اس عیسوی صدی کے شروع میں جو کوہستان نیپال کے رہنے والے گورکھا لوگ ہندوستان کے مغربی اور شمالی پہاڑوں پر بہت دور تک قابض ہو گئے تھے تو انھوں نے یہاں کے راجہ کو بھی حکومت سے خارج کر دیا تھا۔ مگر جب سرکار انگریزی نے اُن کو اُن سب پہاڑوں سے نکال دیا تو ۱۸۱۵ء میں وہاں کے خارج شدہ راجہ سُدرشن شاہ کو گڑھوال کا علاقہ دے کر ریاست پر پھر بحال کر دیا۔ لیکن اُس کے قدیمی ملک میں سے وہ حصہ جو الکہ نندا اور منڈاکنی کے مقام اتصال

اورنگ زیب آگرے میں

اب ہم اُن واقعات کا ذکر پھر شروع کرتے ہیں جو آگرہ کی طرف وقوع میں آئے سموگڈھ کی لڑائی کے تین چار روز بعد دونوں شاہزادوں نے ایک باغ میں جو آگرہ کے سامنے قریب تین میل کے ہے ڈیرے آن لگائے اور ایک خواجہ سرا کو جو اورنگ زیب کا نہایت معتمد علیہ اور چالاکی و عیاری میں گویا خود اورنگ زیب ہی تھا شاہجہاں کے حضور میں بھیجا اور اُس نے اس ڈھب سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ادائے تسلیمات کے بعد اپنے آقا کی طرف سے بے حد ادب و تنظیم اور محبت و فرماں برداری کا اظہار کیا اور عرض کی کہ

سے اوپر کی جانب شرق کی طرف تھا معہ علاقہ ڈیرہ دون اور پرگنہ رام گڈھ کے اپنے قبضہ میں رہنے دیا۔ چنانچہ ریاست مذکور کا صدر مقام اب ٹیہری نامے ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جو چونتیس درجے تیئس دقیقے عرض شمالی اور اٹھتر درجے اٹھائیس دقیقے طول شرقی پر سمندر سے دو ہزار فٹ بلند گنگا کی ایک شاخ بھاگیرتھی نامی کے بائیں کنارے سری نگر کے سامنے قریب دو منزل کے فاصلہ پر آباد ہے اور راجہ سورج بنسی راجپوت خاندان کے قوم سے ہے۔ اور اُس کے نام کے اخیر میں نیپال کے فرمان روا خاندان کے راجاؤں کی طرح شاہ کا لفظ لگایا جاتا ہے۔ مثلاً رئیس حال جس کا نام پرتاپ شاہ ہے بھوانی شاہ کا بیٹا اور سودرشن شاہ کا پوتا ہے اور بقول مسٹر ٹالبائے وہیلر مولف تاریخ جشن قیصری دہلی واقع یکم جنوری ۱۸۷۷ء رقبہ چار ہزار ایک سو اسی میل مربع اور آمدنی اسی ہزار اور آبادی ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کی ہے۔ اُس راجہ کا نام جس نے سلیمان شکوہ کو پناہ دی تھی فارسی زبان کی تاریخوں میں پرتھی سنگھ اور پرتھی پت لکھا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ کا لفظ سلاطین مغلیہ کے ادب کے منافی سمجھ کر لفظ سنگھ اور پت کے ساتھ دانستہ بدل دیا ہے۔ جیسا کہ گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کو بجائے قطب شاہ قطب الملک اور بجائے عادل شاہ عادل خاں لکھتے تھے۔ اور ناظرین تاریخ کے لئے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سلاطینِ مغلیہ کے زمانہ میں جو مقامات ایسے دشوار گذار اور بے ڈھب سمجھے جاتے تھے کہ اُن کے دشمن اور باغی وہاں کے آزاد مطلق راجاؤں کے پاس جا کر بے تکلف پناہ لیتے تھے سرکار عالیہ انگریزی کی کوششوں سے وہی مقامات بلکہ اُن سے بھی بہت آگے اور دور تک عمدہ سڑکوں اور پلوں کے بن جانے کی وجہ سے ایسے سہل العبور ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے ہر ایک حصہ سے ہر سال ہزاروں جاتری مرد اور عورت بدری نارائن وغیرہ تیرتھوں کے درشن کو جو ہمالہ کے برفانی اور سر بہ فلک پہاڑوں میں واقع ہیں اسی سری نگر اور ٹیہری کے راستہ سے بہت آرام کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔ س م ح

"یہ جو کچھ گذرا صرف داراشکوہ کی کج رائے اور بے جا جاہ طلبی کے خیالات کے باعث ہوا۔ اورنگ زیب نے حضور کی خدمت میں حصولِ صحت کی مبارک باد عرض کی ہے۔ اور اِن واقعات کے وقوع میں آنے کا اُس کو نہایت ہی رنج وافسوس ہے۔ اور اُس کا آگرہ آنا محض اس غرض سے ہے کہ جو کچھ ارشاد ہو وہ بسروچشم اُس کی تعمیل کرے۔"

جس کے جواب میں شاہجہاں نے بھی اپنے فرزند سعادت مند کے طور وطریق کی نسبت ایسی ہی ظاہرداری اور تملق کے ساتھ اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اس کی سعادت مندی اور ایسی فرماں برداری سے ہم نہایت راضی اور خوش ہیں۔" اگرچہ شاہجہاں اورنگ زیب کی مکاری اور شوق جہاں داری سے بخوبی واقف تھا۔ اور اُس کی ان ظاہری باتوں پر اُس کو ہرگز اعتماد نہ تھا۔ مگر باوجود اس کے اُس نے صفائی کے ساتھ معاملہ کو یک سو نہ کیا یعنی اگرچہ یہ ضروری تھا کہ دربار میں امرا اور ارکان دولت کو جمع کر کے خود اُس کے مقابلہ کو نکلتا اور اس طرح خلایق کی نظر میں اُس کو علانیہ باغی ثابت کرتا حالانکہ ان اُمور کے لیے اب تک موقعہ تھا۔ مگر کچھ نہ کیا اور اس کے عوض صرف چالاکی اور دم بازی سے اورنگ زیب جیسے شخص، پر جو ایسی باتوں میں دنیا بھر سے تیز تھا غالب آنا چاہا۔ پس اُس کا خود اسی حال میں پھنس جانا جو بیٹے کے لئے بچھایا تھا کچھ تعجب کی بات نہیں اور اس کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ شاہجہاں نے ایک معتبر خواجہ سرا کو اورنگ زیب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ

"بے شک داراشکوہ نے جو کچھ کیا وہ سب نامناسب تھا اور اُس کی بے سمجھی اور نالایقی کی باتیں یاد دلا کر کہا کہ تم پر تو ہم ابتدا ہی سے دلی شفقت رکھتے ہیں پس تم کو ہمارے پاس جلد آنا چاہیئے تاکہ تمھارے مشورہ سے ان امور کا انتظام کیا جائے جو اس افراتفری کے باعث خراب اور ابتر پڑے ہوئے ہیں۔"

مگر اس محتاط شہزادہ نے بدگمانی سے بادشاہ پر اعتماد کر کے قلعہ میں چلے جانے کی دلیری نہ کی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ بیگم صاحب کسی وقت بادشاہ سے جدا نہیں ہوتی اور اُس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہی ہوتا ہے۔ اور یہ پیغام اُسی کا ایک حیلہ ہے۔ اور اُس نے قلماقنیوں [1] میں سے جو محل سرا میں چوکی پہرہ کے کام پر متعین

[1] اصل کتاب میں "تاتاری عورتیں" ہے مگر چونکہ وہ ترک قوم کی عورتیں جو محل کے چوکی پہرہ کا کام دیتی ہیں

رہتی ہیں کچھ قوی ہیکل اور مضبوط اور مسلح عورتیں اس قصد سے لگا رکھی ہیں کہ جب وہ قلعہ میں داخل ہو تو فوراً اُس پر آن پڑیں۔ اور اگرچہ اُس نے بارہا اپنی حاضری کی تاریخیں اور دن معین کئے لیکن کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹالتا ہی رہا۔ اور ادھر اپنی معمولی کارروائیاں کرتا رہا یہاں تک کہ اکثر بڑے بڑے ذی اقتدار امیروں کا عندیہ دریافت کر لیا۔ اور جب سب بندوبست ہو گیا تو یکایک اُس کا بیٹا محمد سلطان آکر قلعہ پر قابض ہو گیا جس سے سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ اس جاں باز اور عالی ہمت جوان نے کچھ سپاہی پہلے سے قلعہ کے آس پاس لگا رکھے تھے۔ پس اس بہانہ سے کہ بادشاہ کی خدمت میں کچھ پیغام لے کر جاتا ہے یکایک اُن سپاہیوں پر آ پڑا جو قلعہ کے دروازے پر متعین تھے اور جو سپاہی ادھر اُدھر گھات میں لگائے ہوئے تھے جھٹ پٹ آ پہنچے اور اہل قلعہ کو مغلوب کر کے جن کو اس کا کچھ وہم و گمان بھی نہ تھا قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت شاہجہاں کو جس قدر خوف و اضطراب ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے پس جس شخص کے پکڑ لینے کے لئے وہ اتنے دنوں سے گھاتیں لگا رہا تھا اب خود ہی اُس کا قیدی بن گیا۔

محمد سلطان کا قلعہ پر قبضہ

کہتے ہیں کہ اس بدنصیب بادشاہ نے قید ہوتے ہی محمد سلطان کو یہ پیغام بھیجا کہ

میں تم سے تخت[۱] کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور قرآن مجید میرے تمھارے درمیان ہے کہ اگر تم اس وقت مجھ سے ایمان داری برتو تو میں تمھیں کو بادشاہ بنا دیتا ہوں۔ اور اس موقعہ کو غنیمت جان کر ہاتھ سے نہ دو اور فوراً چلے آؤ اور دادا کو قید سے چھڑا دو اور یاد رکھو کہ اس سے تم کو ثواب آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ایک دائمی نیک نامی حاصل رہے گی۔

لوگوں کا قول ہے کہ اگر محمد سلطان ذرا جرأت کر کے شاہجہاں کے کہنے کو مان لیتا تو غالبًا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ اُن کو قلماقنیاں کہتے تھے اس لئے ترجمہ میں وہی لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قلماق بھی ایک تاتاری ہی قوم ہے۔ س م ح

[۱] اصل کتاب میں تاج کا لفظ ہے جس کی جگہ ہم نے ہندوستان کے محاورہ کے بموجب تخت کا لفظ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ ہم کو یاد ہے کہ دہلی کے خاندان شاہی کے اکثر لوگ غدر ۱۸۵۷ء تک بھی (جس میں اس خاندان کا نام و نشان ہی مٹ گیا) بات بات پر تخت ہی کی قسم کھایا کرتے تھے۔ حالانکہ نہ کچھ تخت ہی رہا نہ تاج۔ مطلب یہ کہ تخت کی قسم اس خاندان میں بہت ہی موکد اور مقدس سمجھی جاتی تھی۔ س م ح

وہی سب کچھ ہو جاتا۔ کیونکہ اب تک یہی لوگوں کے دل میں شاہجہاں کا ادب اور لحاظ بہت کچھ باقی تھا۔ اور اگر یہ شہزادہ اُسے قلعہ سے نکلنے دیتا اور یہ بڈھا بادشاہ کچھ فوج لے کر بذات خود اورنگ زیب پر حملہ کرتا تو غالباً کل فوج اُس کی فرماں برداری کرتی اور ذی اقتدار امیر نمک حلالی اور وفاداری سے پیش آتے۔ اور اس بات پر بھی سب لوگ متفق الرائے ہیں کہ اس موقعہ پر محمد سلطان سے ویسی ہی غلطی سرزد ہوئی جیسی کہ سموگڈھ کی لڑائی کے بعد شاہجہاں سے ہوئی تھی۔

اب چونکہ اس جگہ بادشاہ کی غلطی رائے کا پھر ذکر آ گیا ہے تو انصاف یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی نسبت یہ بھی ظاہر کر دوں کہ تمام حالات پر نظر کر کے بہت سے ذی رتبہ مدبر لوگوں کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ داراشکوہ کی شکست کے بعد اس بوڑھے بادشاہ کو قلعہ ہی میں رہنا اور اورنگ زیب کو فریب ہی سے گرفتار کرنا مناسب تھا۔ اور اُن کا قول تھا کہ خلائق کا یہ قاعدہ ہی ہے کہ نتیجہ کے ظہور کے بعد کسی تدبیر کو بُرا یا بھلا بتلایا کرتے ہیں اور اکثر اوقات جب کہ نہایت ہی کچے منصوبے چل جاتے ہیں تو لوگ اُن کی بھی تعریف و توصیف کیا کرتے ہیں۔ پس شاہجہاں کا الفت و محبت اور صفائی نیت جتا کر اورنگ زیب کو گرفتار کر لینا کچھ ناممکن نہ تھا اور اس صورت میں اس کے فہم و فراست کی ویسی ہی تعریف اور ناموری ہو جاتی جیسے کہ اب سب بُرا کہتے اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ عقل سے خارج بادشاہ ایک ایسی عورت (بیگم صاحب) کے کہنے پر چلنے سے اس حال کو پہنچا جو صرف کینہ اور عداوت کے جوش سے اندھی ہو رہی تھی اور بے عقلی سے یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ وہ سیانا کوا اورنگ زیب قلعہ میں ہم سے ملنے کو آئے گا اور اُس جانور کی طرح جو خود بخود پنجرہ میں آن پھنسے گرفتار ہو جائے گا۔

اب محمد سلطان کی سنیئے۔ اُس کی نسبت عموماً اس ملک کے مدبر لوگ یہ کہتے ہیں کہ تاج شاہی اس کو مفت ہاتھ آتا تھا۔ مگر اس سے لیا نہ گیا حالانکہ اس میں بموجب قول مشہور "ہم خرما وہم ثواب" سلطنت اور دادا کے قید سے چھڑا دینے کی نیک نامی دونوں حاصل ہوتی تھیں۔ پس اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہ نوجوان شہزادہ بجائے اس کے کہ قلعہ گوالیار[۱] میں پڑا زندگی کے دن گنا کرتا ہے کل امور سلطنت کا وہی مالک و مختار ہو جاتا۔ اور اگرچہ چند شخص یہ

---

[۱] یہ محمد سلطان کے قید میں ڈالے جانے پر اشارہ ہے جس کا ذکر آئندہ آتے گا۔ س م ح

خیال کرتے ہیں کہ اُس نے باپ کی اطاعت اور حق پدری پر نظر کر کے بادشاہ کی درخواست کو قبول نہ کیا۔ مگر ظنِ غالب یہ ہے کہ اُس کو شاہجہاں کے عہد و پیمان پر سچائی کا بھروسہ نہ ہوا اور اُس نے یہ بھی سوچا کہ ایسے عقلمند اور شجاع شخص سے جیسا کہ اورنگ زیب ہے لڑائی مول لینا محض بے فائدہ اور سراسر خطرناک ہے۔ بہرحال شہزادہ کا خیال خواہ کچھ ہی ہو مگر خلاصہ یہ ہے کہ اُس نے اس بدنصیب بادشاہ کی تجویز نہ مانی بلکہ پاس جانے سے بھی یہ عذر پیش کر کے انکار کر دیا کہ

مجھے اورنگ زیب کی طرف سے حضور میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ تاکیدی حکم یہ ہے کہ قلعہ کے کل دروازوں کی کنجیاں خود اپنی سپردگی میں لے کر یہاں سے نہایت جلد واپس جاؤں کیونکہ وہ حضور کی قدم بوسی کے ازبس مشتاق ہیں اور صرف اتنی ہی دیر ہے کہ اس امر سے اطمینان ہو جائے تو فوراً حاضر ہو جائیں۔

اب دو دن تک تو شاہجہاں کنجیوں کے دینے میں ہیچر میچر کرتا رہا لیکن جب اُس نے دیکھ لیا کہ سب لوگ اُسے چھوڑے جاتے ہیں خصوصاً یہ سن کر کہ تھوڑی سی فوج جو درپچۂ خاص کی محافظ تھی وہ بھی چل دی۔ اور اب بچاؤ کی کوئی امید باقی نہیں ناچار قلعہ کی کنجیاں حوالے کر دیں اور بتاکید کہلا بھیجا کہ

"اورنگ زیب کو اب تو آنا ہی چاہیے۔ اور لازمہ دانائی یہی ہے کہ وہ جلد ہم سے ملنے کو آئے۔ کیونکہ سلطنت کے بعض ضروری اسرار ہم اُس کو سمجھانا چاہتے ہیں"

شاہجہاں کی گرفتاری

لیکن وہ سیاست داں فقیر" اپنی چال سے چوکنے والا نہ تھا چنانچہ بجائے اس کے کہ اس ارشاد کی تعمیل کرے فوراً اعتبار خاں نامی اپنے ایک معتمد خواجہ سرا کو قلعدار مقرر کر دیا[۱]

جس نے پہنچتے ہی سب بیگموں، بیگم صاحب اور خود شاہجہاں کو قید کر دیا۔ بلکہ قلعہ کے اکثر دروازے تک چنوا دیئے۔ اور بادشاہ اور اُس کے خیرخواہوں

---

[۱] عالمگیر نامہ سے ظاہر ہے کہ اعتبار خاں اس وقت دکن میں تھا۔ اُس کو نہیں بلکہ ذوالفقار خاں کو قلعہ دار بنایا گیا تھا۔ س م سعد

کے باہم آمد و رفت تو کیسی خط کتابت اور سلام پیام کے تمام ذریعے بھی مسدود کر دیئے۔ اور شاہجہاں کو اتنی بھی اجازت نہ رہی کہ قلعدار کی اطلاع کے بغیر اپنے کمرے سے باہر نکل سکے۔

بادشاہ کے نام اورنگ زیب کا عریضہ اب اورنگ زیب نے باپ کو ایک عریضہ لکھا جو روانہ کرنے سے پہلے قصداً سب لوگوں کو سنایا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "یہ بے ادبی مجھ سے اس لئے سرزد ہوئی ہے کہ حضور ظاہر امیری نسبت اظہار اُلفت و مہربانی فرماتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا کہ ہم داراشکوہ کے طور و طریق سے سخت ناراض ہیں مگر مجھے پختہ خبر ملی ہے کہ حضور نے اشرفیوں سے لدے ہوئے دو ہاتھی اُس کے پاس بھیجے ہیں۔ جن سے وہ نئی فوج تیار کرے گا۔ اور اس خوں ریز لڑائی کو طوالت دے گا۔ پس حضور ہی غور فرمائیں کہ یہ حرکتیں جو فرزندوں کے معمول اور طریق کے برخلاف اور سخت معلوم ہوتی ہیں مجھ سے ان کے سرزد ہو جانے کا باعث کیا صرف داراشکوہ کی خود سری اور عناد ہی نہیں ہے، بلکہ فی الواقع حضور کی اسیری اور اتنی دیر تک شرف قدم بوسی سے میری محرومی اور حضور کے خلاف توقع فرزندانہ خدمات کی بجا آوری میں اس قدر تاخیر کا باعث محض وہی ہے۔ اور میں حضور سے بکمال معذرت یہ التجا کرتا ہوں کہ میرے اس بظاہر حیرت انگیز طرزِ عمل سے صرف نظر کر کے اس نہ دوال آزادی کو جو صرف چندروز کے لئے ہے تحمل کے ساتھ گوارا فرمالیں اور جب داراشکوہ امن و امان میں خلل انداز ہونے اور حضور کو اور مجھکو ایذا دینے کے قابل نہ رہے گا تو میں فوراً قلعہ کی طرف از خود دوڑا چلا آؤں گا اور حاضر ہو کر دست بستہ عرض کروں گا کہ اب کچھ روک ٹوک نہیں ہے۔

اورنگ زیب کے الزام کی تحقیق اگرچہ میں نے سنا ہے کہ شاہجہاں نے فی الواقع یہ اشرفیاں اُسی رات کو داراشکوہ کے پاس بھیجی تھیں جب کہ وہ پنجاب کی طرف روانہ ہوا تھا اور اس کی خبر روشن آرا بیگم نے اورنگ زیب کو پہنچائی تھی اور یہ خبر بھی اُسی نے دی تھی کہ قلعہ میں آؤ گے تو قلماقنیاں تم پر حملہ کریں گی اور یہ بھی کہتے

ہیں کہ شاہجہاں کے کئی خط جو اُس نے داراشکوہ کے نام روانہ کئے تھے اورنگ زیب کے ہاتھ آگئے تھے۔ مگر اکثر دانشمند اور فہمیدہ لوگ ان باتوں کی صحت سے انکار کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ وہ کاغذ جو سرِ عام سنایا گیا تھا محض بے اصل اور صرف لوگوں کے دھوکا دینے اور شاہجہاں کے خیرخواہوں اور طرف داروں کی طفل تسلی اور زبان بندی کے لئے تھا جو اورنگ زیب کی اس ناشائستہ حرکت کا چرچا کرتے تھے۔

امرائے سلطنت کی اطاعت

خیر یہ باتیں صحیح ہوں یا غلط، لیکن یہ بات بالکل سچ ہے کہ جب بادشاہ ایسے سخت طور سے قید ہو گیا تو قریبًا تمام امرا اورنگ زیب اور مراد بخش کے دربار میں تسلیمات کے لئے جا حاضر ہوئے۔ اور میں جب یہ سوچتا ہوں کہ اس بیچارے بڈھے اور مظلوم بادشاہ کی حمایت میں کسی امیر نے ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہ ہلائے اور کسی کے چھوٹے منہ سے بات تک بھی نہ نکلی! تو مجھے نہایت ہی رنج ہوتا اور غصہ آتا ہے۔ افسوس، یہ لوگ اُن ظالموں کے آگے سر جھکانے کو جاتے تھے جنھوں نے ان کے آقا اور مالک پر ایسی سختی کی۔ حالانکہ ان کے موجودہ مرتبے اور درجے اور دولت وحشمت سب کچھ صرف اُسی کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ اور اس دربار کی رسم کے موافق اُس نے اُن کو ادنیٰ ادنیٰ درجوں سے مراتبِ اعلیٰ پر پہنچایا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے ان میں سے ایسے تھے جو غلامی کی حالت سے امارت کے درجہ کو پہنچے تھے۔ مگر ہاں چند شخص ایسے بھی تھے۔ مثلاً دانشمند خاں[1] جنھوں نے کسی کی بھی جانب داری اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن ان کے سوا اور سب کا عمومًا یہ حال تھا کہ اب اورنگ زیب ہی کا دم بھرتے تھے مگر اُمرا کی اس حالت پر جب میں غور کرتا ہوں تو ان کے اس کفرانِ نعمت اور احسان فراموشی کی لسبت لعن طعن کرنے کا جوش کچھ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یعنی ہندوستان کے امرا چونکہ فرانس وغیرہ ممالک یورپ کے اُمرا کی طرح کسی جائداد زمینداری وغیرہ کے مستقل مالک نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ان کی آمدنیوں کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے۔ جس کو بادشاہ وقت سے کچھ تعلق نہ ہو۔ بلکہ جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں ان کی آمدنیاں صرف وہ

[1] داراشکوہ کی مخالفت کے باعث میر بخشی کے عہدہ سے استعفا دے کر اس وقت تک یہ دہلی ہی میں خانہ نشین تھا اور عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب داراشکوہ کے تعاقب میں آگرہ سے دہلی کے قریب پہنچا تو یہ خضر آباد کے مقام پر (جو پرانی دلی کے پاس تھا) اُس کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ س م م

روزینے ہوتے ہیں جن کا تعین محض بادشاہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اور اُن کا جاری رکھنا یا بند کرنا صرف اُسی کے اختیار میں ہے اور جب یہ وظائف بند ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ بالکل تباہی میں آجاتے ہیں یہاں تک کہ تھوڑا سا قرض کبھی ان کو کہیں سے نہیں مل سکتا۔[ل]

[ل] باپ بیٹے کی منافقانہ کارروائیاں۔ امرا کا اورنگ زیب کے پاس حاضر ہو جانا۔ اور آخر کار شاہجہاں کا قید ہونا۔ ان سب واقعات کو عالمگیر نامہ۔ تاریخ عاقل خاں۔ عمل صالح۔ اور سیر المتاخرین میں جس تفصیل و ترتیب سے لکھا ہے اُس کا خلاصہ اُس خط و کتابت کی کمل نقل کو جو باپ بیٹے کے درمیان ہوتی رہی مفید اور دلچسپ سمجھکر اُسی ترتیب سے اس جگہ درج کیا جاتا ہے۔ اس خط و کتابت کی نقلیں جو عملِ صالح اور تاریخ عاقل خاں میں درج ہیں اُن کے الفاظ مختلف اور مطلب واحد ہے۔ مگر عاقل خاں جو اورنگ زیب کے خاص امیروں میں سے تھا اس کی تحریروں کو زیادہ مستند سمجھکر سب نقلیں اُسی کتاب سے لی گئی ہیں بجز ایک عرضی کے۔ جو اُس میں نہ تھی اور عمل صالح سے لی گئی۔

اگرچہ اورنگ زیب کی وہ تحریر جس کو برنیئر نے نقل کیا ہے ان دونوں کتابوں میں نہیں ہے مگر عالمگیر نامہ میں (جس کے مسودات خود اورنگ زیب کے ملاحظہ کے بعد صاف ہوتے تھے) داراشکوہ پر فتح یابی کے دوسرے دن بمقام عماد پور (عرف سموگڈھ) اورنگ زیب کے قیام کے تذکرہ کے بعد یہ عبارت تحریر کی ہے کہ

"دریں روز خجستہ معذرت نامہ مشتمل بر صورت حال۔ واعتذار وقوع صف آرائی و قتال کہ باعثِ بدبادیِ آں داراشکوہ بے خرد مغرور بود۔ وجنود منصور بحکم شرع وفتوائے عقل در اقدام برآں معذور۔ نگاشتۂ کلک ادب دانی ساختہ بخدمت اعلیٰ حضرت فرستادند"۔

اور لڑائی سے تیسرے دن شہر آگرہ کے قریب جب باغ نورمنزل معروف باغ دہرہ میں ڈیرہ ہوا تو اُس کے اس معذرت نامہ کے جواب میں شاہجہاں نے جو شقہ اپنے قلم خاص سے لکھا تھا اُس کا خلاصہ بقول عاقل خاں یہ ہے۔

"چوں بمقتضائے مشیت بے چونی درمیان آں قرۂ باصرۂ سلطنت وجہاں بانی وغرۂ ناصیۂ عظمت وکامرانی وشاہِ بلند اقبال صحبت بہ کدورت وملال انجامید وآنچہ درپردۂ غیب وحجاب تقدیر مستور بود بر روئے بروز افتاد ازاں جا کہ در فرمانِ قضا و قدر وارداتِ خالقِ خیر و شر چون و چرائے بشر را مدخلے نیست اغماض عین ازاں از متممات نشار خود شناسی وخدا دانی دانستہ باظہار امرے کہ اکنوں انشراحِ خاطر وانبساط طبع اقدس بداں متعلق ومنوط آمدہ بذل توجہ والا ناگزیر شرف وقوع پذیرفت وغرض از تبیین ایں مقولہ آنکہ تقاضائے باطن وتمنائے خاطر

بہ تماشائے جمال لقائے فرحت انتمائے آں فرزند ہوشمند بیدار خرد کہ چراغ ضیا بخش و فروغ افزائے این دودمان دولت و اقبال است بغایتے است کہ حوصلہ تقریر و بیان اندازہ آں را برنمی تابد خاصۃً کہ آں درۃ التاج خلافت و دارائے وشین فریدۂ زینت افزائے اکلیل فرماں روائے را بنابر ارادت لم یزلی پس از روزگارِ دراز و زماں طویل بایں ہمہ قرب مکان و محل قریب اتفاق نزول افتادہ و ما را پس از آں چناں امراض متضادہ شدیدہ کہ رشتہ امید توقف دریں نشار اہل سوز حوادث اندوز قطعًا مفقود و منقطع بود از شفاخانہ عنایت حکیم علی الاطلاق شربت گوارائے صحت کرامتِ وصول پذیرفتہ فی الحقیقت حیاتِ تازہ و زندگی دوبارہ عطا گردید التہاب نیران شوق و لوابح اشتیاق باقصٰی نہایت رسیدہ یقین کہ خواہش قلبی و آرزوئے باطنی آں فرزند نیک اختر والا گہر نیز دریں باب از باب غلیسان نشار محبت و کیفیت طلب عزیز مصر بلقائے بزرگ کنعاں خواہد بود چوں زیادہ بریں حوصلہ طاقت بار انتظار را برنمی تابد پسندیدۂ عالم استحسان آنست کہ آں ادب داں خرد و رسم شناس عقل بزودی ہرچہ تمامتر مرہم راحت بر جراحت ترصد نہادہ خاطر اقدس را بمشاہدۂ جمال لقائے بہجت افزائے خود فرحت آگیں و مسرت آمود سازد۔

ع

"زود آ و دلِ تنگ مرا مونسِ جاں باش"

اس شقہ کے پہنچنے پر اورنگ زیب نے تملق کی راہ سے نہایت ہی ادب اور فرماں برداری کا اظہار کیا اور فاضل خاں میر ساماں اور سید ہدایت اللہ صدر یعنی منتظم اوقاف، کو جو یہ شقہ اور الفت و محبت اور شوق ملاقات کے پیغام زبانی لے کر آئے تھے بڑے بھاری خلعت عنایت کئے اور جواب میں یہ عرضی حوالہ کر کے بہت خاطر و مدارات کے ساتھ رخصت کیا۔

"مراسم سجدہ و سلام و لوازم تعظیم و تکریم بجا آوردہ بعرض می رساند کہ فرمان فرخندہ عنوان مشتمل بر کیفیت آرزومندی خاطر فیض مظاہر و زود رسیدن ایں پروردۂ نعمت و برآوردۂ تربیت بہ زمیں بوس حضور فائض النور شرف صدور و عزّ ورود یافتہ۔ از دریافت مضمونِ اشفاق شحون آں جریدۂ فیض کہ ہر کلمہ اش سرمایہ دہ انوار برکات و ہر فقرہ اش پیرایہ پیرائے حیات بود سرتاسر صفحہ خاطر زینتِ جمعیت و طراز شگفتگی یافتہ رو کش نسخہ رنگین بہار گردید و فروغ ایں آیات رحمت و شموس سمائے عاطفت از سر نو پرتو بر بام و طارم دماغ

گسترده سرشار نشۂ مسرت وطراوت ساخت۔ شکر ایں عنایات تازه ومرحمت بے اندازه کہ از ظرف طاقتِ تحریر وتقریر بیرون است از تنگیٔ دست گاه لفظ ومعنی چگونہ بہ تقریر زبان کز مژ بیان راست آید؂ ہم مگر لطف شما پیش نہد گامے چند۔ الحمد للہ والمنتہ کہ خاصیت صدق ارادت مضمر وخلوصِ عقیدتِ مکنون درضمیر منیر آں حضرت کار نمود کرده تازگی فروغ ظہور از نہان کده باطن بر روئے بروز انداخت وسلسلہ جنبانی اقبال آسمانی وفیضِ خواہش جسمی وجانی بفور کمال عنایت حضرت ظل سبحانی رسیده گلشن امید ومراد را شگفتہ وخنداں ساخت اکنوں کہ از اظہار عواطف رسمی ومراحم ظاہری گذشتہ بخواہش حقیقت رسیده فاتحہ التفاتِ معنوی بمشام آرزو فائز گشتہ باعث مزید حیات گردیده امیدوار است کہ اسباب مواصلتِ ایں دورافتاده در وقت مسعود وساعت سعادت آمود دست بہم دہد واز فیضِ قدم بوس مبارک آں حضرت کہ فی الحقیقت برکت روزگار وآیۂ رحمت پروردگار ند در روزگاران انتظار ایں وقت وآرزوے روزی شدن ایں روزداشت بر مراد خاطر فیروز گشتہ وتجلی دیدار فائض الانوار روزنہ منظر دیده را روکش دریچۂ مشرق مہر انور سازد۔ زیاده ازیں درازنفسی کوتہ اندیشی می داند۔"

اگرچہ اورنگ زیب کے ہتھکنڈوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ نہیں وقت مسعود و ساعت سعادت آمود۔ کا اظہار اس دیر و توقف میں اپنے انتظامات پورا کرنے کے لئے محض ایک حیلہ تھا۔ کیونکہ اس عرصہ میں بادشاہی سردار اور امیر روز بروز اس کے پاس حاضر ہوتے جاتے تھے اور اس حالت میں بادشاہ کے پاس جانے سے بجز ضرر کے کوئی فائدہ متصور نہ تھا۔ اور بقول صاحب سیر المتاخرین حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کرنے کی وجہ صرف اتنی ہی تھی کہ لوگوں کی زبانِ طعن ذرا بند رہے۔ مگر عاقل اور صاحب عمل صالح کے بیان سے (جو اورنگ زیب کے خوشامدی مورخ نہیں ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ارادہ فی الحقیقت باپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا۔ مگر فاضل خاں کے چلے جانے کے بعد بعض امرانے اُسے خوب بہکایا اور شاہجہاں کے پاس جانے سے ڈرا دیا۔ چنانچہ فاضل خاں جب اگلے روز اس اُمید میں کہ باپ بیٹے کی ملاقات اب جلد ہونے والی ہے۔ خوش خوش پھر آیا اور بادشاہ کی طرف سے بطور علامت اُس کی رضامندی اور خوشنودی کے بعض عمدہ تحائف معہ ایک مشہور تلوار کے جس کا نام عالمگیر تھا (جس کی نسبت مورخ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب اور اُس کے رفیقوں نے اُسے ایک ایسی فال مبارک سمجھا تھا کہ آخر کار تخت نشینی کے وقت اس لفظ کو اپنے القاب شاہی کا

اُس نے ایک جز بنا لیا) لایا اگرچہ اورنگ زیب نے ادب اور اطاعت کی ظاہری باتیں تو اب بھی بہت سی بنائیں مگر شاہجہاں کے پاس حاضر ہونے کی اصل بات پہ نہ آیا۔ جس کو فاضل خاں نے بھی تاڑ لیا اور بادشاہ سے جا کر صاف کہدیا۔ ناچار شاہجہاں نے دوسرے روز پھر ایک رقعہ لکھا بلکہ اورنگ زیب کی بدگمانی رفع کرنے کے خیال سے خلیل اللہ خاں کو بھی فاضل خاں کے ساتھ بھیجا اور وہ یہ تھا۔ نقل شقہ ثانی۔

- باوجود حقوق پرورش نیاز و نعیم و ترتیب و تلقین و تعلیم و بہ نوازشات بیکراں و عنایات بے پایاں اختصاص بخشیدن و بمناصب بلند و مراتب ارجمند فائز گردانیدن و با این ہمہ حقوق ابوت داولوالامری کہ بفرمان شاہنشاہ علی الاطلاق اطاعت و امتثال حکم لازم و واجب است دکلام ربانی و کتاب آسمانی بدان ناطق ادان فرزند سعادت مند کہ آراستہ حسن اعتقاد و مجموعہ دانش و بینش خداداد ست و پیوستہ عمر گرامی را بہ رضا جوئی و نیک نامی و حق شناسی و خدا دانی صرف کردہ بسیار بعید می نماید کہ قدر مہربانی و رتبہ شوق و خواہش خاطر اقدس را بہ دریافت دیدار فرحت آثار خویش ندانستہ بنا بر اغوا و اضلال صاحب اغراض فاسدہ چند بیت؛ مدد رشوندار بدمانے رسندہ باد شوندار بہ چراغے رسند۔ از احراز سعادت حضور باز ایستد و بواسطہ دست کامی مشتے بے مہر بد طینت مار دشمن کام پسند و دخصت مارادر فرمان فرمایاں جہان و اہل روزگار تجویز کردہ از وخامت عاقبت نیندیشد و برائے دو روزہ زندگی این سرائے حادثہ را شرمساری و خجالت ابد در پیش خدا و رسول بر خود گوارا و آسان گیرد۔ زنہار اے فرزند بکار ے جرات منماکہ آخر منتج ندامت و پشیمانی گردد و ندامت سود ندہد۔ ابیات

(۱) شاہجہاں

اے خلف از راہ مخالف بتاب	تیغ بیفگن کہ منم آفتاب
گر ز خود این نقش گرفتی بدست	سوئے خدا بین و مشو خود پرست
ورز بد آموز شد این رہ پدید	گفت بد آموز نباید شنید
گرچہ کنی دعوی دانش و لیک	نیک بدانم کہ ندانی تو نیک
چوں تو شب و روز ادب افزوں کنی	بے ادبی با جو منے چوں کنی
گرچہ جوانی ہمہ فرزانگی است	این نہ جوانی است کہ دیوانگی است
اے پسر ار چہ پسری در خوری	لیک مکن با پدران سروری
بر سر خوان آے کہ ہم توشہ	یاد نمک کن کہ جگر گوشہ

خون منی ودل من مہر جوست جوشش بسیار کمن زیر پوست

چنانچہ جب یہ دونوں امیر اورنگ زیب کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو صرف خلیل اللہ خاں جو پہلے ہی سے ادھر ملا ہوا تھا اندر بلا لیا گیا جس نے جا کر اورنگ زیب سے کہا کہ آپ ہرگز نہ جائیے وہاں آپ کی نسبت بُرے ارادے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُس نے بادشاہ کو قید کر لینے کی صلاح دی اور رفع بدنامی کے لئے خود اپنی درخواست سے بہ ظاہر نظر بند ہو کر وہیں رہ گیا۔ اور اورنگ زیب نے فاضل خاں کی زبانی بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ مجھے وہاں جانے میں کئی طرح کا خوف اور اندیشہ ہے اس لئے بالفعل حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ بادشاہ نے جب فاضل خاں سے یہ سب ماجرا سُنا اور دیکھا کہ میرے ہی امرا اُسے بہکاتے ہیں تو اس اندیشہ سے کہ ایسا نہ ہو کہ یکایک مجھ سے کچھ اور سلوک کر بیٹھیں قلعہ کے دروازے بند کرا دیئے جس کی خبر پہنچتے ہی ذوالفقار خاں اور بہادر خاں اورنگ زیب کے سرداروں نے آن کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا اگرچہ اُنھوں نے رات کو قلعہ کی فصیل کے نزدیک پہنچ کر بقول عاقل خاں بہت سا "کروفر" دکھایا مگر یہ قلعہ ایسا نہ تھا کہ وہ ایسی آسانی سے اُس پر قابض ہو جاتے اس باعث سے اورنگ زیب کے سردار اور سپاہی قلعہ کے نزدیک کے مکانوں اور درختوں اور دیواروں کی آڑ میں اُتر پڑے اور دونوں طرف سے توپ اور بندوق کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اگرچہ بادشاہ کی طرف سے بعض چھوٹے سردار اور بندوقچی پیارے نمک حلالی اور بہادری سے بخوبی مقابلہ اور مدافعت کرتے رہے۔ مگر اکثر بڑے امرا اور منصب دار پہلے ہی روز یہ بہانہ بنا کر چمپت ہوتے کہ دریچہ کے راستہ دریا سے پانی لانے والوں کی مدد کو جاتے ہیں۔ چونکہ گرداگرد کی عمیق خندق کی وجہ سے اس قلعہ میں نہ تو سرنگ ہی لگ سکتی تھی اور نہ ملبہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے اہل قلعہ کو پیاسا مار کر مغلوب کرنے کے قصد سے دوسرے دن اورنگ زیب کے لوگ ذرا جرأت کر کے خضری دروازہ تک جا پہنچے اور قلعہ میں پانی پہنچنے کا راستہ بند کر دیا۔ وہ لوکا موسم اور آگرہ کی سخت گرمی بے چارے اہل قلعہ لاچار ہو گئے۔ پس اس بیمار اور بڈھے بادشاہ نے یہ حادثہ دیکھکر بجز غیر مشروط اطاعت کے (جس کو ان فارسی تاریخوں میں "مصالحہ" لکھا ہے) اور کوئی صورت نہ دیکھی اور پھر اپنے اُسی دلی خیر خواہ بیچارے فاضل خاں کو فرزند بلند اقبال کی خدمت میں ایک اور تحریر دیکر روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"مالک الملک تعالیٰ شانہ کہ ملکتش از تغیر و زوال مصئون است کوکب اقبال فرزند برومند قوی طالع راچوں کوکب جہاں فروز فروغ بخش شبستان دولت وضیا افزائے ساحت جہاں دارد۔ از کجبازی سپہر نیرنگ ساز وناسازی روزگار شعبدہ باز امرکیہ اصلاً بحیطہ تصور و حیز

تعقل در نمی آمد بعین الیقین مشاہدہ فتاد۔ آں فرزند اقبال مند طالع بلند بیک بارگی مہر
فرزندی بریدہ بر آتشِ شوق کہ در کانون درون اقدس سمت التہاب پذیرفتہ نظرے نیفگندہ و
چشم از حقوق ابوت و تربیت عمرے پوشیدہ مارا دشمن کام پسندیدہ و ایذا و آزار ماراکہ موجب
بدنامی دنیا و مورث ناکامی عقبی است سہل و آسان انگاشتہ از پرس روز شمار غافل و بے خبر
افتادہ اما در یوم "یقوم الحساب" ازیں جرأت و ارتکاب حق شکنی چہ جواب خواہد داد۔ نظم

پیش کہ گویم زخودت شرم باد — کز پئے خونِ خودم اندر فتاد
بندہ کہ با شاہ بود کینہ جو — خلق چہ گویند تو ہم خود بگو
در ز تو در قلب من آمد غبار — ہم تو شوی در رخ خود شرمسار
باش بکامم کہ بکام توام — زندہ و نازندہ بنام توام
بہر خدا صورتِ خویشم نما — روئے بگردان و بترس از خدا

لائق آنست کہ آں قرۃ باصرہ دولت و دارائے بر صف شکنی و کشور کشائی خود مغرور بنود تکیہ
و اعتماد بر سازگاری زمانہ و رفاقت روزگار نکند کہ ایں چرخ پر نیرنگ و جہان دو رنگ
اصلا اعتماد را نشاید و ازیں پیمان شکن بدعہد قطعاً وفا نیاید و دریں صورت شائستہ خرد
آنست کہ کارے کہ موجب وہن و فتور ایں دودمان عالی شان گردد از ارتکاب آں اجتناب
واجب شمردہ در حفظ ناموسِ سلطنت چندیں سالہ ما کہ طنطنۂ عظمت و شکوہ و کنت و اقتدار
ایں دولت در ساحتِ زمیں و زماں پیچیدہ و سائر فرماں روایان روئے زمیں از آں شمارے
بر می گرفتند کوشیدہ آنچہ از فرزنداں قابل توقع باشد بہ ظہور آرد کہ نام نیک و اسم قابلیت
آں تو بادۂ گلشن جاہ و جلال در صحیفۂ روزگار و صفحہ لیل و نہار ثابت و پائدار بماند"

جس کے جواب میں اورنگ زیب نے یہ عریضہ لکھا۔

"للہ الحمد و المنۃ کہ ایں نیاز مند درگاہ شاہنشاہ بے مثل و مانند از بدو اختیار و داغ عقل و
تمیز الی الآن باندازہ امکان بشری و طاقت انسانی در تمہید قواعد ارادت و اعتقاد و تشئید
مبانی صدق و سداد خود را مقصر نساختہ و در ضبط سر رشتہ استرضائے خاطر ہمایوں کوشیدہ
از صراط مستقیم عبودیت و جاں فشانی انحراف جائز نداشتہ و نمی دارد و در راہ بندگی و عقیدت
ثابت و راسخ است۔ لیکن از ثمر ظہور ایں مقدمات کہ بنا بر ارادت ازلی و مشیت لم یزلی در میان
آمدہ بمقتضائے طبیعت بشری مغلوب واہمہ و ہراس گشتہ جرأت آں نماندہ کہ باطمینان

قلب وجمعیت باطن عازم احراز سعادت حضور پر لزر تواند شد والا از روئے خاطر فاترایں مستمند سراپا ارادت واخلاص بہ نیلِ دولت استلام سدرہ سپہرالتیام زیادہ ازآنست کہ حوصلہ تقریر وتبیین آں را برتابد وزبان از شکرِ عنایاتِ سرشار ومراحم واشفاق بے شمار اقدس قاصر اگر آئین مرید نوازی مرعی فرمودہ حکم والا بشرف نفاذ رسانند کہ بعضے از مردم ایں مرید نجست بقلعہ باریافتہ بجائے جمعے از ملازمان سرکار عالم مدار کہ بہ محافظت مداخل ومخارج مامور ند قرار گیرند واز پیش گاہ عنایت خسروانی بحراست ابواب قلعہ امتیاز واختصاص یا بند ایں فدوی جاں سپار بخاطر جمع وسکونِ باطن واطمینانِ دل بحضور اقدس رسیدہ سعادت زمیں بوس اشرف حاصل نماید وزبانِ عقیدت بیان بعذر تقصیرات بکشاید غایت مرید نوازی خواہد بود۔“

تحریر اورنگ زیب

اس کاغذ کے پہنچنے پر شاہجہاں نے ناچار حکم دیدیا کہ سب بادشاہی ملازم قلعہ سے باہر چلے جائیں اور قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور شاہزادہ محمد سلطان معہ ذوالفقار خاں اور شیخ میر اور بہادر خاں اور اسلام خاں کے روز جمعہ گیارھویں رمضان ۱۰۶۸ھ کو داخل قلعہ ہو گئے۔ اور جب سب جگہ اپنا بندوبست کر چکے اُس وقت محمد سلطان اسلام خاں کے ساتھ کورنش کے لئے داداجان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اگرچہ اب بیچارہ بادشاہ قلعہ بھی حوالہ کر چکا۔ مگر جب اس پر بھی حضرت اورنگ زیب ملاقات کو نہ آئے تو اگلے روز شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب باپ کی طرف سے ملاقات وغیرہ کے پیغام لے کر اورنگ زیب کے لشکر کو خود گئی۔ مگر اُس طرف سے اُس کے اعزاز واحترام کے مقررہ دستور کے برخلاف اُس کا استقبال وغیرہ نہ کیا گیا۔ اور یہ کہلا بھیجا کہ آپ محل سرا میں چلیں، میں وہیں آتا ہوں۔ اور جب وہ محل سرا میں پہنچ گئی تو اورنگ زیب نے کسی قدر اعزاز واکرام سے ملاقات کی بیگم صاحب نے پہلے تو باپ کی طرف سے اپنے فتح مند بھائی کی نسبت اظہار عنایت اور شوقِ دیدار بیان کیا۔ بعد اس کے یہ بے موقعہ پیغام دیا کہ حضرت ظل سبحانی کی شاہانہ مرضی اس طرح پر ہے کہ ملک پنجاب معہ اُس طرف کے اور اضلاع کے داراشکوہ کو عنایت فرمائیں اور گجرات پر مراد بخش اور بنگالہ پر شجاع کا بدستور تصرف رہے اور ملک دکن محمد سلطان کو عطا ہو اور شاہ بلند اقبال کا خطاب اور باقی کل ممالک محروسہ کی ولی عہدی کا منصب عالی آپ کو مبارک ہو۔ پس آپ قبول کیجئے۔ اور غرض مند لوگوں کی باتوں پر نہ جایئے۔ بغیر دغدغہ اور وسواس کے حضرت کی خدمت میں چل کر اپنے دیدار سے اُن کی خاطر مشتاق کو مسرور کیجے اورنگ زیب نے اس کے جواب میں داراشکوہ کی خصومت کی سخت شکایتیں کر گئے ان باتوں کی قبولیت سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ داراشکوہ کا معاملہ یکسو ہوئے تک حضور میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بیگم صاحب یہ جواب لے کر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ واپس ہوئی۔ اور سب اندوہناک ماجرا بادشاہ سے عرض کیا۔ اس کے بعد پھر اسی طرح پیام و سلام ہوتے رہے۔ اور جب آخر کار بہت سی گفت و شنید کے بعد اورنگ زیب تیسرے دن شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر کے باغ نور منزل سے سوار ہو کر چل پڑا تو یکایک شائستہ خاں اور شیخ میر نے سامنے سے آکر عرض کیا کہ

"حضور کہاں جاتے ہیں! یہ ارادہ عقل اور دور اندیشی کے برخلاف ہے۔ خدا کے واسطے اس سے احتراز فرمایئے۔ اور جب خدا کے فضل سے قلعہ میں حضور کا عمل و دخل خاطر خواہ ہو چکا ہے اور اعلیٰ حضرت کا اختیار و اقتدار کچھ بھی نہیں رہا تو بلا ضرورت اندیشے اور خطر کی جگہ میں جانے سے اب کیا حاصل؟"

ان باتوں سے اورنگ زیب کی طبیعت میں پھر ایک مذبذب سا پیدا ہو گیا اور وہ اپنے ڈیرے کو چلا آیا۔ اور بادشاہ کے پاس جانے نہ جانے کی نسبت ابھی گفتگو میں درمیان ہی میں تھیں کہ اسی اثنا میں ناہر دل نامی ایک چیلے نے شاہجہاں کا ایک شقہ جو اس نے داراشکوہ کے نام اپنے ہاتھ سے لکھ کر بڑے اعتماد اور احتیاط سے اس کو سپرد کر کے یہ ہدایت کی تھی کہ نہایت جلد دہلی پہنچ کر اس کا جواب لائے۔ پیش کیا۔ خلاصہ اس کاغذ کا عاقل خاں نے یہ لکھا ہے کہ

"داراشکوہ در شاہجہاں آباد ثبات قدم ورزد۔ کمی خزانہ و لشکر در آنجا نیست۔ زینہار از انجا پیشتر نگذرد کہ ما بدولت دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم۔"

اس آخر فقرہ کا پڑھنا تھا کہ اورنگ زیب کو اپنے خیر خواہوں کی باتوں کا یقین ہو گیا۔ اور اس نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا اور چونکہ بیگم صاحب کے آنے کے بعد جعفر خاں وزیر۔ حکیم تقرب خاں (جو قرب و منزلت میں وزیر سے کم نہ تھا) اور رائے رایان راجہ رگھناتھ دیوان سلطنت بھی معاً دیوانی خاص ہو چکے تھے اب شہزادوں کے دستور کے موافق بہ نشست مسند منعقد کر کے سب امرا اور منصب داروں کی نذریں (شاہانہ طور پر) لیں اور بعد ازاں بڑے طمطراق اور کر و فر کے ساتھ بہ سواری فیل قلعہ کے دروازے کے آگے سے گذر کر داراشکوہ کی حویلی میں جا ڈیرہ کیا۔ اور محمد سلطان نے باپ کے حکم سے تمام بادشاہی خزانوں کارخانوں توشہ خانوں کو ضبط کر کے سر بمہر کر دیا۔ اور اکیسویں رمضان سنہ مذکور سے شاہجہاں ایسی سخت قید میں رہا کہ حرم سرائے سے باہر نکلنے کی اجازت نہ رہی۔ بلکہ بقول مصنف عمل صالح مدت تک بجز چند خادمہ عورتوں کے کوئی خدمت گار تک پاس پھٹکنے نہ پاتا تھا۔

ذوالفقار خاں آگرہ کا قلعہ دار اور شاہجہاں کا محافظ مقرر ہوا۔ اسلام خاں کو آگرہ کی صوبہ داری دی

گئی ۔ اور آپ صرف تین روز دارا شکوہ کی حویلی میں ٹھہر کر دلی کو کوچ کر دیا ، اور اگرچہ سیاسی مصلحتوں کے لحاظ سے اپنی غیبت میں محمد سلطان کو بھی آگرہ رہنے کا حکم دیا مگر نہ تو اُس کو فوج وغیرہ پر اختیار کلی ہی دیا نہ قلعہ میں رہنے کی اجازت دی بلکہ اسلام خاں کو اس پر اتالیق مقرر کر کے یہ حکم دیا کہ دارا شکوہ کی حویلی میں قیام رکھے ۔ اور اگرچہ بادشاہ کے قید اور بے بس کر دینے کے لئے ایک طرف تو مذکورہ بالا اہتمام و انتظام تھے مگر ظاہر داری سے ان حرکتوں پہ پردہ ڈالنے اور لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچنے کی خاطر دلی کو کوچ کرنے سے پہلے فاضل خاں میر ساماں کو بادشاہ کی خدمت گذاری اور "پرداخت مہمات بیوتات و انتظام کارخانہ جات خاصہ شریفہ" کے لئے (جو اکثر وہیں تھے) مقرر کیا ۔ اور تقرب خاں کو جو شاہجہاں کا مزاج داں معالج تھا ۔ رہے سہے امراض کے علاج کے لئے مقرر کر کے تین ہزار اشرفیوں کے انعام اور عنایات "خلعت خاص و جمدھر مرصع با علاقہ مروارید" سے سرفراز کیا ۔ اور جب آگرہ سے چل کر پہلا ڈیرہ بہادر پور میں ہوا تو اپنے فرزند ثالث محمد اعظم کو بھی سلام کے لئے روانہ کیا جس نے جد امجد کو پانچ سو مُہریں اور چار ہزار روپیہ نقد نذر کیا اور بادشاہ نے بھی تملق اور ظاہری پیار محبت کے بعد بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا ۔ شاہجہاں کی قید کے پُر عبرت واقعہ کا مادہ تاریخ جو نہایت ہی حسب حال ہے عاقل خاں نے یہ لکھا ہے ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔ س م ح

مراد بخش کی گرفتاری الغرض دونوں شاہزادوں نے باپ کے معاملہ سے فارغ ہو کر اُمرا کی نذریں لیں اور اپنے ماموں شائستہ خاں[1] کو آگرہ کا صوبہ دار بنا کر اور خزانہ شاہی سے اخراجات ضروری کا انتظام کر کے داراشکوہ کے تعاقب میں کوچ کیا ۔ اور جب فوج آگرہ سے کوچ کرنے والی تھی تو مراد بخش کے مخلص ہواخواہوں خصوصًا شہباز خواجہ سرا نے اُس کو بہت سمجھایا کہ

"آپ کو مع اپنے لشکر کے آگرہ یا دلی سے دور جانا نہیں چاہیئے اور غایت درجہ کا ادب و آداب اور بے حد میٹھی باتیں جو اورنگ زیب کر رہا ہے فریب اور دغا بازی کا نشان ہیں ۔ اور جب کہ خاص و عام بلکہ خود وہ بھی اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اب بادشاہ آپ ہیں تو پھر یہ کیوں کر مناسب ہے کہ آپ آگرہ اور دہلی کے نزدیک نہ رہیں اور کہیں دور چلے جائیں ۔ پس آپ اُسی کو داراشکوہ کے

---

[1] پچھلے حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ اس وقت اسلام خاں کو آگرہ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا البتہ شائستہ خاں بھی آگرہ کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا مگر اس سے کچھ عرصہ بعد ۔ س م ح

تعاقب میں جانے دیجئے"۔

چنانچہ میری دانست میں اگروہ یہ معقول صلاح مان لیتا تو اورنگ زیب بڑی مشکل میں پڑ جاتا لیکن اُس نے ایک نہ مانی اور بھائی کے ساتھ دہلی کو چل کھڑا ہوا کیونکہ اُس کے موکد اور مستحکم وعدوں اور اُن بیہودہ قسموں پر جو بارہا قرآن درمیان رکھکر کھائی ہوئی تھیں اُس کو پورا بھروسہ تھا۔ لیکن جب دونوں نے متھرا پہنچ کر مقام کیا جو آگرہ سے قریب تین چار منزل کے ہے تو مراد بخش کے خیر خواہوں نے جو اس عرصہ میں بہت کچھ دیکھ اور سُن چکے تھے ناچار ہوکر آپس میں یہ صلاح کی کہ ایک دفعہ تو اس کو پھر سمجھانا چاہیئے آگے وہ جانے۔ مانے یا نہ مانے۔ چنانچہ انھوں نے اُس سے کہا کہ

"ہم کو متعدد ذرائع سے پختہ خبریں ملی ہیں کہ اورنگ زیب کا کچھ بُرا ارادہ ہے اور کسی خوفناک منصوبہ کے لئے بہت کچھ بندشیں ہو چکی ہیں اس واسطے اُس کی ملاقات کو خاص اُس کے لشکر میں آپ کا جانا مناسب نہیں اور زیادہ نہیں تو آج کی رات تو ہرگز نہ جائیے۔ اور اس آفت کے ٹال دینے کی بہت آسان سبیل یہ ہے کہ ناسازی طبیعت کا بہانہ کر لیجئے اور وہاں نہ جائیے"۔

یہ سُن کر جیسا کہ معمول ہے اورنگ زیب خود ہی چند آدمیوں کے ساتھ آپ کے پاس آجائے گا۔

۔لیکن نہ تو ان تقریروں اور دلیلوں ہی نے کچھ اثر کیا! اور نہ منت وسماجت ہی کچھ کارگر ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک ایسی حالت میں تھا گویا کسی نے اُس پر جادو کیا ہوا ہے چنانچہ اورنگ زیب کی ظاہری اطاعت اور دکھاوے کی محبت سے فریب میں آکر اپنے رفیقوں اور خیر خواہوں کی ممانعت کے باوجود اورنگ زیب کے لشکر میں، جہاں میر خاں اپنے تین چار محرم راز مصاحبوں کے مشورہ سے گھات میں لگا ہوا اس کے آنے کا منتظر تھا۔ ضیافت کھانے چلا گیا۔ اور جب یہ سادہ لوح شہزادہ وہاں پہنچا تو اورنگ زیب نے معمول سے زیادہ بڑھ چڑھ کر تعظیم وتکریم کی اور اس قدر خوشی کا اظہار کیا کہ آنکھوں سے چند آنسو بھی نکال دیئے اور خاص اپنے ہاتھ سے مراد بخش کے چہرہ کی گرد صاف کی اور پسینہ پونچھا اور جب کھانا کھانے کو بیٹھے تو نہایت ہی گرم جوشی دکھائی اور اظہارِ مسرت کے لئے ہنسی اور مذاق کی بے حد باتیں بنائیں اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب عمدہ کابلی اور شیرازی شراب پیش ہوئی تو آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کر بولا۔

"حضرت کو معلوم ہے کہ میں اپنے مذہبی خیالات کے باعث اس صحبت عیش و نشاط میں حاضر رہنے سے قاصر ہوں اگرچہ میں رخصت ہوتا ہوں لیکن یہ سب لوگ جو اس پر لطف جلسہ کے شریک ہیں اور میر خاں[1] اور میرے مصاحب آپ کی خدمت گذاری کے لیے حاضر ہیں۔"

پس مراد بخش شراب دوست تو تھا ہی اُس پر یہ طرہ کہ ایسی عمدہ صحبت اور ایسی لطیف شرابیں۔ غرض خوب پی اور یہاں تک پی کہ بالکل سرشار ہو گیا اور اورنگ زیب کا جو یہ مدعا تھا کہ وہ مدہوش ہو کر سو جائے پورا ہو گیا۔ پس اول تو مراد بخش کے نوکروں کو اس حیلہ سے رخصت کر دیا گیا کہ اُس کے خواب راحت میں خلل نہ آئے۔ اور اس کے بعد میر خاں نے اُس کی تلوار اور جمدھر کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد اورنگ زیب اُس کو اس نازیبا خواب سے جگانے کے بہانہ سے خیمہ میں آیا اور اس تمام مصنوعی ادب و لحاظ کو خیرباد کہہ کر اس خفتہ بخت کے اول تو چند ٹھوکریں ماریں اور جب اُس نے ذرا آنکھیں کھولیں تو یہ ذو فنون! ملامت کی راہ سے بولا کہ بڑی شرم کی بات ہے کہ

"تم بادشاہ ہو کر ایسے غافل اور بے خبر ہو جاؤ۔ بھلا دنیا کے لوگ تم کو بلکہ مجھ کو بھی کیا کہیں گے۔ اور لوگوں کو اشارتاً کہا کہ اس بدمست و مخمور کے ہاتھ پاؤں باندھ کر خلوت خانہ میں لے جاؤ کہ نشہ کے اُترنے تک اس بے شرمی کا سونا وہاں موئے۔"

پس تعمیل حکم میں کیا دیر تھی فوراً پانچ چھ مسلح شخصوں نے آن دبایا اور مراد بخش ہر چند چلاتا اور زور کرتا رہا۔ لیکن اس کے پاؤں میں بیڑی اور ہاتھوں میں ہتکڑی ڈال ہی دی اور قیدی بنا کر ایک علیحدہ جگہ میں ڈال دیا۔

یہ سختی اور بدسلوکی خواہ کیسی ہی مخفی طور پر کی گئی تھی مگر مراد بخش کے اُن ملازموں پر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی جو باہر بھیج دیئے گئے تھے پس جب اُنھوں نے اس کی بھنک سُنی تو کسی قدر شور و غوغا مچایا اور چاہا کہ بزور اندر گھس آئیں لیکن مراد بخش کے میر آتش علی قلی نے جس کو اورنگ زیب نے کچھ دے کر پہلے سے گانٹھا ہوا تھا سمجھا اور دھمکا کر خاموش

[1] شیخ میر اور سید میر دونوں بھائی تھے ان میں سے سید میر اورنگ زیب کا بے تکلف مصاحب تھا اور غالباً اس جگہ وہی مراد ہے۔ س م ح

کرا دیا۔ اسی طرح اُس کے لشکر میں بھی اگرچہ کچھ شور و شر شروع ہو گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ کہیں وہ یکایک چڑھ نہ آئے لیکن رات ہی کو کچھ لوگ بھیج دیئے گئے جنھوں نے جا کر یہ مشہور کر دیا کہ اورنگ زیب کے ڈیرہ میں جو ماجرا گذرا ہے وہ کچھ بڑی بات نہیں ہے کیونکہ ہم بھی وہیں تھے اور بات صرف اس قدر ہے کہ مراد بخش شراب ذرا زیادہ پی گیا تھا اور یہاں تک بدکلامی کرنے لگ گیا تھا کہ اور تو کوئی کیا خود اورنگ زیب کو بھی مغلظات گالیاں دیں اور ایسا اودھم مچایا کہ ناچار خلوت خانہ میں بند کرنے کی ضرورت پڑی... بہرحال تشویش کی کوئی بات نہیں ہے صبح کو جب نشہ اُتر جائے گا تو وہ صحیح و سلامت اپنے لشکر میں آ جائے گا۔

اب ادھر تو اہل سپاہ کو یہ دم دے کر چپ کرایا گیا اور اُدھر راتوں رات بڑی بڑی رشوتیں اور بڑے بڑے وعدے دے کر لشکر کے بڑے سرداروں کو الگ گانٹھ لیا گیا اور معًا تمام فوج کی تنخواہ بڑھا دی گئی غرضکہ وہ شورش اور ہنگامہ جو برپا ہوا تھا صبح ہوتے اُس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی تھوڑے تھے جو یہ نہ سمجھتے ہوں کہ مراد بخش کسی بلا میں پھنسنے والا ہے ورنہ اُس کے سب سردار اور سپاہی اس بات کو بخوبی جانتے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ ضرور پھنس جائے گا۔

جب یہ سب بندوبست ہو چکا اور اطمینان ہو گیا کہ اب کچھ اندیشے کا مقام نہیں ہے تو اس نامراد کو ایک زنانی عماری میں بند کر کے دہلی کو چلتا کیا اور قلعہ سلیم گڈھ میں جو جمنا میں بنا ہوا ہے قید کیا گیا[1]

---

[1] مسٹر اروِنگ براک صاحب اصل کتاب کے مترجم انگریزی نے کرنل ڈو صاحب کی تاریخ ہندوستان سے اس موقعہ پر مندرجہ ذیل حاشیہ لکھا ہے۔

قولہ "جب مراد بخش کیمپ میں جو متھرا کے قریب تھا آ پہنچا تو اس سے اگلے دن سلطان مراد بخش نے اورنگ زیب کو ضیافت کا پیغام بھیجا اور چونکہ وہ طبعًا کشادہ مزاج اور رنگین طبع شخص تھا اس وجہ سے اورنگ زیب نے بغیر کسی طرح کے شک و شبہ کے اُس کی دعوت کو قبول کر لیا جب دونوں بھائی دسترخوان پر بیٹھ گئے اور شہباز نے جو مراد بخش کے محلات کا ناظر اور اس دعوت کے اصلی منصوبہ کا رازدار تھا یکایک کان میں آ کر کہا کہ "عمدہ پوشاک میں چاک کرنے کا اب وقت ہے" یعنی اورنگ زیب سے یہیں سمجھ لینا چاہیئے تو اورنگ زیب جو لوگوں کی صورتوں اور چہروں سے دلوں کے بھید سمجھ لیتا

تھا اس سرگوشی اور بھائی کی بناوٹی رنگینیوں سے جو اُس وقت دکھا رہا تھا اصل مدعا کو تاڑ گیا۔ مگر تحمل اور متانت کی راہ سے خاموش ہو رہا اور جب مراد بخش نے سمجھا کر شہباز کو رخصت کر دیا کہ فلاں علامت اور اشارہ کا منتظر رہے تو اورنگ زیب نے یہ سمجھ کر کہ اس وقت میرے قتل کا منصوبہ ہے یکایک یہ ظاہر کیا کہ میرے پیٹ میں سخت درد ہے اور مجلس سے اٹھکر جھٹ پٹ باہر چلا آیا اور اپنے اہالی موالی اور ہم رکاب سپاہیوں کے پاس جو ڈیوڑھی پہ حاضر تھے آپہنچا اور وہاں سے سیدھا اپنے لشکر میں آگیا۔ اور اس تمارض کی چال کو ایسی خوبصورتی سے چلا کہ مراد بخش یہی خیال کرتا رہا کہ وہ فی الواقع بیمار ہے اور اُس کو گمان بھی نہ ہوا کہ وہ اس منصوبہ کو سمجھ گیا ہے۔ چنانچہ آخر تین روز کے بعد جب اورنگ زیب کا مصنوعی دردِ شکم جاتا رہا تو مراد بخش نے بہت خوشیاں منائیں اور بڑے تپاک سے مبارکباد دیں اور اس سے اگلے دن اورنگ زیب نے دعوت کی تیاری کی اور پیغام دیا کہ آپ کی تفریح طبع کے لئے ایسی حسین وجمیل اربابِ نشاط بلائی گئی ہیں جو اپنے حسن وجمال اور لطافت ونزاکت اور گانے بجانے کے فن میں ایسی بے نظیر ہیں کہ ایسے کمالات کی رنڈیاں اس سے پہلے کبھی ہندوستان بھر میں نہیں دیکھی سُنی گئیں۔ اور اس مضمون کو ایسی آب وتاب سے بیان کیا گیا کہ مراد بخش جو بالطبع عیش وعشرت کا پُتلا اور راگ رنگ کا شیدا تھا ہزار جان سے اُن کا مشتاق ہو گیا اور اپنے تمام خیر خواہوں میں سے کسی کی بھی نہ سُنی اور اپنے مکار بھائی کے خیمہ گاہ میں چلا ہی گیا۔ چنانچہ جب بادشاہ سلامت (جیسا کہ اورنگ زیب اُس کے بیوقوف بنانے کو کہا کرتا تھا) خیمہ گاہ میں داخل ہوئے تو وہ نازنینیں اُسی کو ایک اور اندر کے خیمہ میں لے گئیں اور یہ مغلوب النفس شہزادہ اُن کے حیرت افزا حسن وجمال کو دیکھکر جو فی الواقع بے مثال تھا بالکل لٹو ہو گیا۔ الغرض ناچ رنگ شروع ہوا اور عیش ونشاط کا وہ سماں بندھا کہ مراد بخش نے مزے میں آکر شرابِ شیرازی منگائی۔

اب دور چل رہا ہے اور "بادشاہ سلامت" پریوں کے اکھاڑے میں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں اور اورنگ زیب بھی اپنے معمولی تقویٰ وطہارت سے ہاتھ دھوئے اس بزمِ شراب میں شریک ہے۔

آخر جب حضرت کے ہوش وحواس رخصت ہونے لگے تو اورنگ زیب نے شیرازی خاص شراب کی جگہ تیز شراب کے پیالوں کی اور بھی بھرمار شروع کر دی۔ جس سے وہ تھوڑی ہی دیر میں بیہوش ہو کر ایک نازنین کی بغل میں سر دیئے کر سو گیا۔ اور چونکہ اورنگ زیب نے اپنے سرداروں کو حکم دے رکھا تھا کہ جو اُمرا وغیرہ مراد بخش کے ساتھ آئے ہیں اُن کی تواضع بھی اسی

تکلف سے کی جائے اس لئے اس کے باڈی گارڈ کے لوگوں تک کو بھی شرابیں پلا پلا کر مدہوش کردیا گیا اور اس تدبیر سے وہ بدبخت شہزادہ بالکل بے حفاظت رہ گیا۔ اور اورنگ زیب نے موقع پاکر ظفر جنگ اور تین اور امیروں کو حکم دیا کہ خیمہ میں جاکر اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ لیں۔ چنانچہ وہ عورت تو ان کو آتے دیکھکر کھسک گئی اور انھوں نے آکر مراد بخش کو جو پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ اور جس کے ہتھیار تلوار اور خنجر وغیرہ اورنگ زیب نے چالاکی سے پہلے ہی اٹھوا لئے تھے آن گھیرا۔ اور آہستہ آہستہ اُس کے ہاتھ باندھنے شروع کردیئے۔ پس اس حرکت سے مراد بخش چونک پڑا اور جھنجلا کر باندھنے والوں کے کچھ لاتیں وغیرہ مارنے لگا۔ جس سے وہ ذرا ڈر گئے اور شہزادہ پکار پکار کر اپنی تلوار مانگنے لگا۔ اب اورنگ زیب نے جو اس کارروائی کے وقت خیمہ کے دروازے پر کھڑا تھا پردہ کے پیچھے سے سر نکالا اور اپنے امیروں کو خوب ڈانٹ کر کہا کہ اگر یہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے تو ابھی قتل کر ڈالو۔ جس کو سُن کر مراد بخش نے کچھ برا بھلا تو کہا۔ مگر آخر کار چُپ ہوکر ہاتھ پاؤں بندھوا لیے۔ اور ناظر شہباز جو اُس کا ولی رفیق اور خیر خواہ اور عمدہ مشیر تدبیر تھا اُس کو بھی اُسی وقت اس طرح سے قید کرلیا گیا۔ کہ وہ شامیانہ جو میر بخشی کے ڈیرہ کے آگے لگا ہوا اور یہ اُس کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اشارہ ہوتے ہی اُس کی چاروں چوبوں کی طنابیں یک لخت کاٹ کر گرا دیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اس ناگہانی الجھیڑے سے اپنے تئیں نکال سکے پکڑ لیا گیا۔ اور باقی اُمرا کو مسلح آدمیوں نے گھیر لیا۔ اور اورنگ زیب کے حضور میں حاضر کئے گئے جنھوں نے فرمانبرداری قبول کرلی۔

اس واقعہ سے اگرچہ خفیف سا چرچا مراد بخش کے لشکر میں پھیلا مگر اُس سے کوئی مزید پیدا نہیں ہوا۔ اور اہلِ فوج تھوڑی دیر کے بعد اس طرح سے چپ چاپ ہوگئے جیسے کوئی شخص خواب پریشاں سے ذرا چونک کر پھر سو جاتا ہے۔

جب سلطان مراد بخش کو قید کیا گیا تھا۔ اُس وقت کچھ زیادہ رات نہیں گئی تھی اور دن نکلنے سے پہلے ہی اُس کو اور اُس کے رفیق کو ایک ہاتھی پر زنانی عماری میں بند کرکے بحفاظت کامل آگرہ کو روانہ کردیا گیا تھا۔ (انتہےٰ کلامہٗ)

مگر واقعات کی ترتیب اور اُن چالوں اور منصوبوں کی تفصیل جو دارا شکوہ پر فتح پانے سے مراد بخش کے قید ہونے اور اُس کے سلیم گڑھ میں بھیج دینے تک اورنگ زیب اپنے اس سادہ لوح بھائی کی نسبت عمل میں لاتا رہا جس طرح پر کتاب عالمگیر نامہ۔ عمل صالح۔ اور سیر المتاخرین

میں بطور مجمل اور عاقل خاں کی تاریخ میں مفصل درج ہے (اور ڈو صاحب کی تحریر سے آمادہ اعتماد کے لائق ہے) خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ جب اورنگ زیب دارا شکوہ پر فتح پا چکا تو مراد بخش کے ساتھ بہت ہی چرب زبانی اور ملائمت سے پیش آیا۔ اور چونکہ اس لڑائی میں اُس نے زخم کھائے تھے اس لئے۔ اطبایانِ حاذق وجراحانِ ماہر اس کے علاج کے واسطے مامور کئے۔ اور جب دونوں بھائی آگرہ کے قریب پہنچ کر باغ نور منزل میں ڈیرہ کر چکے تو اب اورنگ زیب نے چاہا کہ بغیر مراد بخش کی شرکت کے شہر آگرہ (یعنی دارالسلطنت) پر خاص اپنا قبضہ کرے اس لئے اس بہانہ سے کہ اہلِ شہر اس ہنگامہ اور شور وشر کے باعث بہت خوف زدہ ہو رہے ہیں اور مراد بخش کی سپاہ کے لوگ اپنے آقا کی بے پروائی کے سبب سے براہ خودسری حکم کے خلاف شہر میں داخل ہو کر دست درازیاں اور بے اعتدالیاں کرتے ہیں رعایا کی تسلی اور انتظام کا حیلہ بنا کر اپنے بیٹے محمد سلطان کو معہ اپنی سپاہ کے شہر میں بھیج کر اپنا عمل دخل کر لیا اور جب بادشاہ کے قید کر لینے کے بعد بڑی شان وشوکت کے ساتھ شہر میں خود داخل ہوا تو اُس روز بھی مراد بخش کو اس حیلہ سے کہ آپ کے زخم ابھی کچے ہیں! سواری وغیرہ کی حرکت مناسب نہیں۔ وہیں باغ نور منزل میں پڑا رہنے دیا! اور خود دارا شکوہ کی حویلی میں (جو ولی عہد سلطنت اور مدعی بادشاہت کی حویلی تھی) آڈیرہ کیا۔ مگر میاں مراد بخش باوجود ان تمام حالتوں کے اپنے خیال میں بدستور بادشاہ بنے ہوتے تھے اور تخت وچتر وغیرہ سلطنت کا سارا سوانگ گجرات سے کر اب تک اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

مذکورہ بالا مورخوں کا قول ہے کہ اب اس کے دل میں اورنگ زیب کا یہ عروج دیکھکر کچھ تو خود ہی حسد ہوتا تھا اور کچھ اس کے سردار اور امیر خواہ ازراہ خیر خواہی خواہ ازراہ خود غرضی اُس کو سمجھاتے تھے کہ اورنگ زیب کے قول وقسم اور عہد وپیمان پر بھروسہ نہ کرکے اپنا بندوبست کرنا چاہیئے۔ چنانچہ کچھ نئے سپاہی بھی بھرتی کئے جاتے تھے اور سرداروں اور امیروں کو بھی فضول انعام دے کر اپنی طرف ملانے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ قریب بیس ہزار سوار کے مراد بخش کے لشکر میں جمع ہو گئے۔ بلکہ بعض سردار اور سپاہی عالمگیر سے بھی جدا ہو کر اس کے لشکر میں جا شامل ہوئے۔

جب اورنگ زیب نے آگرہ سے بائیسویں رمضان ۱۰۶۸ھ کو کوچ کرکے پہلا ڈیرہ بہادر پور میں کیا اور وہاں سے چوبیسویں کو سامی گھاٹ پہنچ کر وہاں بھی دو روزہ مقام کیا تو اُس کو خبر

(حاشیہ: [illegible])

ملی کہ مراد بخش جس نے اب تک آگرہ سے کوچ نہیں کیا تھا اس مہم میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ پس اورنگ زیب کو نہایت اندیشہ ہوا اور اُس نے اس امر کو اپنے مدعا کی خرابی کا باعث سمجھ کر معتمدوں کی زبانی مراد بخش سے ترکِ رفاقت کا سبب دریافت کیا اور جب اُس نے اس کے جواب میں اپنی ناداری اور اس وجہ سے فوج کی پریشان حالی کا اظہار کیا تو ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا اور یہ کہلا بھیجا کہ

بالفعل اُس کو اپنی اور اپنی فوج کی ضروریات میں خرچ کیجئے۔ اور جیسا کہ آپ کے ساتھ قرار پا چکا ہے کہ تیسرا حصہ خزانہ اور لوٹ کا مال آپ کو دیا جائے گا وہ بھی جلد پہنچ جائے گا۔ اور خدا نے چاہا تو بعد اتمام مہم داراشکوہ کے ملک پنجاب اور کابل اور کشمیر اور ملتان بے شک آپ کو ملے گا۔ پس اس معاملہ کی طرف سے مطمئن رہیے اور جلد تشریف لائیے۔ تاکہ بالاتفاق اس مہم عظیم کو جو درپیش ہے حسب دلخواہ انجام کو پہنچایا جائے۔ اور جب تک داراشکوہ کا معاملہ درمیان ہے اس تکرار کا موقعہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مراد بخش دم میں آکر آگرہ سے سوار ہوا۔ مگر اب بھی اورنگ زیب کے لشکر سے ایک کوس پیچھے ڈیرہ کیا اور اسی طرح آگے پیچھے اُترتے ہوئے۔ جب متھرا پہنچے تو اس سے بھی کچھ زیادہ فاصلہ پر قیام کیا۔

پس اُس کے ان اوضاع و اطوار کو دیکھکر یہ صلاح ٹھیری کہ مراد بخش کو قید کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ پہلے تو طرح طرح کے لالچ اور وعدے دے کر اُس کے مقربوں اور بڑے بڑے امیروں کو گانٹھ لیا اور پھر مشورہ اور صلاح کے بہانہ سے مراد بخش کو اپنے ہاں بلانا چاہا مگر وہ اپنے بعض خیر اندیش اور ہواخواہوں کے منع کرنے سے کچھ بہانہ بنا کر اُس روز نہ آیا۔ چونکہ اورنگ زیب اُس کا کھٹکا مٹانے میں زیادہ تاخیر کو مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے متھرا میں (کہ جہاں حسن اتفاق سے عید الفطر کا بنا بنایا عمدہ حیلہ بھی موجود تھا) مقام کیا اور اس کے پھسلانے کی غرض سے کبھی تو نہایت ہی شوق ملاقات ظاہر کیا جاتا تھا اور کبھی معاملات ملکی میں صلاح مشورہ کا حیلہ پیش کیا جاتا تھا۔ غرض کہ جب مراد بخش اپنی صاف دلی سے جانے کو تیار ہوا تو اُس کے ہواخواہوں اور خیر اندیشوں نے جو اس فریب کی بھنک پا چکے تھے پھر روکا اور کہا کہ ہم کو اورنگ زیب کی طرف سے نہایت کھٹکا ہے ایسا نہ ہو کہ دغا کرے اور پھر پچھتانا کچھ کام نہ آئے۔ مگر بدقسمتی سے مراد بخش نے اُن کی بات پر یقین نہ کیا بلکہ یہ جواب دیا کہ

"این محض واہمہ است کہ بر طبیعت شما غالب گشتہ وباوجود عہد و پیمانِ موکدہ غلاظ ایمان ازاں حضرت (اورنگ زیب) ایں واہمہ ہارا بخاطر راہ دادن از طریقہ سلمانی نباشد۔"

مختصر یہ کہ وہ دن بھی یوں ہی گذر گیا۔ اور اورنگ زیب نے اس معاملہ کو ادھورا چھوڑ کر آگے کو کوچ کرنا کسی طرح سے مناسب نہ جانا۔ اور ہر روز کئی کئی دفعہ یہ کہہ کر بھیجتا رہا کہ چونکہ بڑے بڑے معاملات درپیش ہیں اور بغیر آپ کی صلاح و مشورہ کے آگے کو کوچ نہیں کیا جا سکتا۔ اور آپ کے تشریف لانے کا انتظار حد سے زیادہ گذر گیا ہے پس اگر تشریف لائیں تو ملاقات کی خوشی کے علاوہ پیش نظر مہم پر مشورہ بھی ہو جائے مراد بخش سادہ لوحی سے اس کے ان فقروں کو سچ مان کر ملاقات کرنے پر رضا مند تو ہو ہی گیا تھا اس پر یہ واقعہ پیش آیا کہ علی الصبح وہ سیر و شکار کے ارادہ سے جب باہر گیا تو واپس آتے ہوئے نورالدین نامی اُسی کا ایک ملازم خاص جو اورنگ زیب سے ملا ہوا تھا۔ سامنے سے گھوڑا دوڑائے آیا۔ اور عرض کیا کہ

"اورنگ زیب کے پیٹ میں یکایک سخت درد پیدا ہو گیا ہے اور وہ بستر پر پڑا لوٹ رہا ہے۔ اور محبت کے سبب سے بار بار آپ کو یاد کرتا ہے۔ پس ایسی حالت میں بہت جلد اُس کے پاس تشریف لے جانا ہی مناسب ہے"!

مراد بخش جو بیچارہ ایک سیدھا سادا اور مکر و فریب سے محض ناآشنا تھا اُس کے قول کو سچ سمجھ کر وہیں سے اورنگ زیب کے لشکر کی طرف چل پڑا۔ اور صرف چند خدمت گاروں اور خاص خاص لوگوں کے ساتھ گھوڑا دوڑائے بپائے خود بگور آمد کا مصداق بن گیا۔ اور اورنگ زیب کے چالاک ملازم جو منصوبے سے واقف تھے نہایت اچھی طرح استقبال کر کے اُس کے خیام خاص میں (جو کئی ڈیوڑھیوں کے اندر محل سرا کے قریب بیماری کا بہانہ بنائے پڑا تھا) لے گئے۔ اور جگہ کی تنگی کے عذر سے اُس کے ملازموں کو باہر ٹھیرا لیا۔ اور اندر پہنچنے پر خود اورنگ زیب نہایت ہی شوق و اشتیاق اور تعظیم و احترام سے پیش آیا۔ اور حد سے زیادہ مسرت اور خوش دلی کا اظہار کیا۔ کیونکہ سموگڈھ کی لڑائی کے بعد اس تمام عرصہ میں مراد بخش کا اُس کے پاس آنا نہیں ہوا تھا۔ غرض کہ بہت سے تکلفات کے بعد اپنی خلوت گاہ خاص میں اور بھی اندر لے گیا۔ اور کہا کہ اب تو حاضری تناول فرمانے کا وقت ہو گیا ہے اول کچھ ماحضر نوش فرما کر ذرا قیلولہ اور استراحت فرمائیے اور قیلولہ سے فارغ ہو کر معاملات سلطنت میں فراغ خاطر سے گفتگو اور مشورہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مراد بخش

(ترجمہ واقعات عالمگیری گذشتہ)

کچھ کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹ گیا اور اورنگ زیب بھی اب یہ دیکھکر کہ سب کام ٹھیک ہوگیا۔ استراحت کے بہانے سے حرم سرا کو چلا گیا۔ اور اورنگ زیب کے خدمت گار مراد بخش کی چپی وغیرہ کرنے لگے۔ اور اورنگ زیب کا جو اس تمام تدبیر سے یہ مدعا تھا کہ مراد بخش اپنے ہتھیار کھول ڈالے وہ پورا ہوگیا۔ یعنی اُس بیوقوف نے نہایت بے تکلفی سے ہتھیار بھی کھول کر رکھدیئے اور اپنے نصیب کی طرح سو گیا۔ جوں ہی مراد بخش کی ذرا آنکھ لگی اورنگ زیب کے اشارے سے خدمت گار تو باہر چلے گئے۔ اور ایک لونڈی اندر سے آکر اُس کی تلوار اور ہتھیار اٹھا کرلے گئی۔ اور شیخ میر اور بعض اور لوگ جو اسی امر کے منتظر تھے فوراً خواب گاہ میں آن گھسے "اُن کے پاؤں کی آہٹ اور شیخ میر کی ڈھال کے اتفاقاً کھڑک جانے کی آواز سے جو آنکھ کھلی تو عجیب صحبت دیکھی۔ متحیر ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور جب ہتھیاروں کا پتہ نہ پایا تو اب سمجھا کہ معاملہ کیا ہے۔ پس ناامیدی سے ٹھنڈی سانس بھر کر بولا کہ

(تاریخ شاہ شجاعی)

"آخر با ہمچو منے درست اخلاص صاف باطن چنیں کردید۔ وحق عہد وپیمان درست

کہ قرآن مجید ضامن طرفین بود چنیں بجا آوردید"

جس کو حضرت اورنگ زیب نے پردہ کے پیچھے سے فرمایا کہ

"برادر عزیز چونکہ تم سے ان دنوں میں کچھ ایسی باتیں سرزد ہوئیں جن سے فتنہ وفساد اور خلقت اور ملک کی بربادی کا گمان ہوتا تھا اور چند احمق اور شریر لوگوں کے بہکانے سے جو تمھارے گرد وپیش جمع تھے تمھارے دماغ میں کچھ ایسا غرور اور نخوت سما گئی تھی کہ عقلمند اور سمجھدار لوگوں کو ملک کے امن وامان میں خلل پڑنے اور سلطنت کے انتظام میں فتور آجانے کا یقین ہوگیا اس لئے تمھارے مزاج کی اصلاح اور ملک وسلطنت کی مصلحت کے لئے کچھ دنوں تم کو گوشہ عافیت میں بٹھانا اور زمانہ کی کشمکش سے علیحدہ رکھنا لازم ہوا ورنہ خدانخواستہ کوئی ایسا امر کہ جو آپ کی پیاری جان کے اندیشہ کا باعث ہو ہمارے دل میں نہیں ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اُس عہد وپیمان میں جو آپ کے ساتھ کیا گیا ہے کسی طرح کا خلل وفتور نہیں آیا۔ اور تمھاری جان عزیز خدا کے حفظ وحمایت میں ہے پس مقتضائے عقل یہی ہے کہ اس کو اپنے لئے موجب بہتری سمجھ کر حزن وملال کو طبیعت میں جگہ نہ دیجئے۔ ع در طریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست"

غرض کہ یہ بیچارہ سیدھا سادا شہزادہ متھرا میں شوال کی چوتھی ۱۰۶۸ھ کو اپنے پُرکار بھائی کے دام تزویر میں پھنس گیا۔ اور اسی وقت دلیر خاں اور شیخ میر کی حفاظت میں ہاتھی پہ بٹھا کر شاہجہان آباد

داراشکوہ کا تعاقب

اب بجز شہباز خواجہ سرا کے جس کے ساتھ اورنگ زیب کو کسی قدر دقت اٹھانی پڑی مراد بخش کے ہمراہیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اورنگ زیب کی ملازمت اور اطاعت قبول نہ کرلی ہو۔پس اُس کی فوج کو بھی اپنی سپاہ میں شامل کرکے داراشکوہ کے تعاقب میں جو نہایت تیزی کے ساتھ لاہور کو بھاگا جارہا تھا روانہ ہوا۔کیونکہ داراشکوہ کا یہ ارادہ تھا کہ اس شہر کی مورچہ بندی کرکے اپنے رفیقوں اور خیرخواہوں کو وہاں جمع کرلے۔لیکن اُس کا یہ مستعد دشمن ایسی چستی سے پیچھے لگا چلا آتا تھا کہ اُس کے مستحکم کرنے کی مہلت نہ ملی اور اُس نے وہاں سے ملتان کا راستہ لیا۔مگر اورنگ زیب کے متعدانہ تعاقب نے وہاں بھی پاؤں جمنے نہ دیئے۔اورنگ زیب جس چستی اور چالاکی سے اس مہم میں کام کرتا تھا اُس کی کچھ تعریف نہیں ہوسکتی۔یعنی موسم اگرچہ نہایت گرم تھا۔لیکن اُس کی فوج رات دن برابر کوچ کرتی تھی اور وہ خود سپاہ کی جرأت اور ہمت بڑھانے کے لئے صرف چند آدمیوں کے ساتھ اکثر چار یا پانچ کوس فوج سے آگے رہتا تھا اور ایک ادنیٰ سپاہی کی مانند بُرے بھلے پانی اور روکھی سوکھی روٹی پر قناعت کرکے رات کو پلنگ اور امیرانہ فرش فروش کے بغیر صرف زمین پر بستر جما کر لیٹ رہتا تھا۔

داراشکوہ پناہ کی تلاش میں

ہندوستان کے دانا لوگوں کی یہ رائے ہے کہ داراشکوہ کے لئے لاہور سے کابل جانا مناسب تھا۔اُس کے خیرخواہوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔کو ایسی جلدی اور سرعت کے ساتھ چلتا کیا کہ اُس کی فوج کو جو قریب بیس ہزار سوار جرار کے تھی اُس روز مطلقاً خبر نہ ہوئی۔اور صرف اُس وقت معلوم ہوا کہ جب موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔اور یہ قصہ مشہور عام ہوگیا۔پس بناچاری فوج نے بھی اورنگ زیب کی اطاعت اور نوکری قبول کرلی اور اُس کے بعض ملازم جو ساتھ آتے تھے مثل شہباز خاں خواجہ سرا کے جو پنج ہزاری کا منصب رکھتا تھا۔اور دو تین اور سردار وہ بھی اُسی وقت گرفتار کرلئے گئے۔ فقط

کرنل ٹوڈ صاحب کی منقولہ بالا تحریر میں اکثر باتیں تو صریحاً غلط ہیں مگر کھانے کے وقت جلد غافل کرنے کے لئے شراب پلانے اور خواب گاہ میں کسی عورت کے پہنچا دینے کا مضمون خواہ وہ رنڈی ہو یا لونڈی قریب القیاس اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ شراب کے بغیر اُس کو جلد غافل بنانا مشکل تھا اور کسی عورت کے بغیر اُس کے مصاحب اور خدمتگار بلا اندیشہ بدگمانی الگ کرکے باہر نہیں بھیجے جاسکتے تھے۔ س م ح

نے بھی ہر چند اُس کو وہاں جانے کے لئے کہا مگر یہ معمہ کسی پر نہ کھلا کہ اُس نے ایسی دانشمندانہ صلاح کیوں نہ مانی۔ کیونکہ مہابت خاں جو امرائے ہندوستان میں ایک بڑا پرانا اور زبردست امیر تھا اور جس کی اورنگ زیب کے ساتھ ہمیشہ سے اَن بن چلی آتی تھی وہاں کا صوبہ دار تھا۔ اور افغانوں اور ازبکوں اور ایرانیوں کے مقابلہ کے لئے دس ہزار سے زیادہ فوج موجود تھی۔ اور چونکہ اُس کے پاس روپیہ بھی کافی تھا۔ یہ تمام فوج اور خود مہابت خاں بخوشی مدد دینے کو تیار ہوجاتا اور ان فوائد کے علاوہ سرحد ایران اور ملک ازبک سے بھی نزدیک ہوجاتا۔ اور اغلب تھا کہ وہاں کے فرماں روا بہت کچھ مدد دے سکتے اور اُس کو یاد کرنا چاہیئے تھا کہ ہمایوں نے شیر خاں سے شکست کھانے کے بعد جو پٹھان قوم کا بادشاہ تھا۔ اور جس نے اُسے ہندوستان سے نکال دیا تھا۔ ایرانیوں ہی کی مدد سے پھر اپنی سلطنت حاصل کرلی تھی[1]۔ لیکن بدنصیب داراشکوہ کی قسمت میں ہمیشہ یہی لکھا ہوا تھا کہ خواہ کیسی ہی نیک صلاح اُس کو دی جاتی وہ اس پر التفات ہی نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی اُس نے ایسا ہی کیا کہ کابل کے عوض سندھ چلا گیا اور قلعہ ٹھٹھہ میں جاکر پناہ لی جو دریائے سندھ کے وسط میں ایک مشہور مستحکم مقام ہے۔

جب اورنگ زیب کو معلوم ہوگیا کہ داراشکوہ کا ارادہ کابل جانے کا نہیں ہے اور اطمینان ہوگیا کہ اب معاملہ چنداں مشکل نہیں تو خود اُس کے تعاقب میں جانا غیر ضروری خیال کیا اور سات آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اپنے کو میر بابا شیخ میر کو داراشکوہ کی نقل وحرکت کی دیکھ بھال کے لئے مامور کردیا اور اس اندیشہ سے کہ نہ معلوم پیچھے کیا کیا فتور برپا ہوجائیں ویسی ہی جلدی سے جیسی کہ داراشکوہ کے تعاقب میں کی تھی آگرہ کو لوٹ آیا[2]۔

---

[1] شیر شاہ سے ہمایوں کا شکستیں کھاکر ہند سے ایران جانا اور شاہ طہماسپ صفوی فرمانروائے ایران کی امداد سے پھر ہند کو آنا۔ اور دوبارہ تسلط ہونا نہایت مشہور واقعہ ہے۔ س م ع

[2] ان واقعات کو جس طرح عالمگیر نامہ میں لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے روانہ ہونے سے پہلے خلیل اللہ خاں اور بہادر خاں کو داراشکوہ کے تعاقب میں روانہ کردیا تھا۔ بعد ازاں متھرا سے دہلی پہنچ کر باغ اعزآباد متصل شہر دلی سے ذیقعدہ کی ساتویں ۱۰۶۸ھ کو مطابق سترھویں امرداد [illegible] کے پنجاب کو خود روانہ ہوا۔ داراشکوہ نے کرنال انبالہ کے معمولی راستہ سے تلون کے گھاٹ جو اس زمانہ میں پھلور کی طرح ستلج کا مشہور گھاٹ تھا عبور کرکے تعاقب کرنے والوں کے

اُس کو یہ خدشہ تھا کہ مبادا جسونت سنگھ یا جے سنگھ سا کوئی زبردست راجہ شاہجہاں کو قید سے چھڑا دے یا سری نگر کے راجہ کی مدد سے سلیمان شکوہ سیلاب کی طرح پہاڑوں سے یکایک اُتر آئے یا موقعہ دیکھکر سلطان شجاع ہی پھر آگرہ کی طرف چڑھائی کر دے۔

اورنگ زیب کا استقلال اور حسنِ تدبیر

اب میں ایک مختصر سے واقعہ کا جو اورنگ زیب کو اسی سفر میں پیش آیا تھا ذکر کرتا ہوں جس سے اس کتاب کے پڑھنے والے یہ اندازہ کر سکیں گے کہ وہ کسی ناگہانی مشکل کے پیش آجانے پر کیسی چستی سے اُس کا فی الفور انتظام کر لینے کی صلاحیت رکھتا تھا ملتان سے واپسی کے وقت جب کہ وہ حسب معمول سرعت کے ساتھ کوچ کرتا چلا آتا تھا راجہ جے سنگھ کو چار پانچ ہزار جرار راجپوتوں کے ساتھ آتا دیکھکر حیرت میں آگیا۔ یہ اس وقت حسب معمول تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ اپنی فوج سے آگے تھا اور راجہ کا شاہجہاں کے ساتھ جو گہرا تعلق تھا وہ اس سے مخفی نہ تھا۔ پس بآسانی خیال میں آسکتا ہے کہ اُس نے خود کو سخت خطرے کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ، روکنے کے لئے یہ بندوبست کر دیا تھا کہ اُس کا نامی سردار داؤد خاں بنی تلوں کے اُس پار اور اسی طرح سپہر شکوہ بیاس کے دوسرے کنارے کچھ عرصہ تک ٹھہر کر اور کشتیوں کو جلوا کر اور غرق کرا کر لاہور آکر اُس سے مل جائیں۔ اس لئے جب اورنگ زیب کو کرنال میں خلیل اللہ خاں کی عرضی سے یہ حال معلوم ہوا تو وہاں سے روپڑ کو ہولیا اور کشتیوں کی قلت کی وجہ سے کئی دن میں لشکر کو ستلج سے پار اُتار کر ماچھی واڑہ۔ راہوں۔ گڈھ شنکر کو ہوتا ہوا گوبندوال کے گھاٹ دریائے بیاس سے بھی پار ہو گیا۔ اور پچیسویں ذی الحجہ کو قصور جا پہنچا۔ چونکہ دارا شکوہ لاہور سے ملتان کو بھاگ گیا تھا۔ اور وہ سردار جو تعاقب میں مامور تھے کچھ سستی کرنے لگ گئے تھے۔ اس لئے "یلغار" کے طور پر نہایت تیزی کے ساتھ بلا توقف کوچ کرتا ہوا ملتان کو روانہ ہوا اور ساتویں محرم کو جب کہ دارا شکوہ ملتان سے سندھ کی طرف بھاگ چکا تھا۔ ملتان جا پہنچا اور اس جگہ سے اوّل صف شکن خاں کو معہ چند اور سرداروں کے اور بعد ازاں اس خیال سے کہ اب بھی دارا شکوہ کے پاس بارہ چودہ ہزار سوار اور ایک اچھا توپ خانہ اور بہت سا مال و دولت موجود تھا۔ شیخ میر کو بھی جو اورنگ زیب کے نہایت محل اعتماد ہونے کے علاوہ بڑا صاحب تدبیر اور شجاع امیر سمجھا جاتا تھا اور جس کو برنی ار میر بابا لکھتا ہے روانہ کر کے خود واپس ہو پڑا۔ اور معمولی منزلیں کرتا ہوا چوتھی ربیع الاول ۱۰۶۹ھ کو دلی پہنچ گیا پس جس غیر معمولی چستی اور جفاکشی کی برنیئر نے تعریف کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس "ایلغار" سے مُراد ہے جو اُس نے قصور سے کی تھی۔ س م ح

حالت میں پایا اور طبعًا اُس کو یہی اندیشہ ہونا چاہیئے تھا کہ جے سنگھ اپنے محترم آقا کو اس قید بے جا کی تکلیف سے جھٹ پٹ چھڑا لینے اور ایسے بے رحم اور ناخلف فرزند کو سزا دینے کے اس عمدہ موقعہ کو جس کے ہاتھ سے اُس پر بلا وجہ ظلم و ستم ہوا ہرگز ضائع نہیں کرے گا اور یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ فی الواقع راجہ کا آنا صرف اسی ارادہ سے تھا کہ اورنگ زیب کو گرفتار کرے اور اس رائے کے قرار دیئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب کو تھوڑی ہی دیر پہلے خبر لگ چکی تھی اور وہ یقین کئے ہوئے تھا کہ راجہ دہلی میں ہے مگر اُس نے ایسی عجیب سرعت سے ایسی بعید مسافت طے کی کہ لاہور اور ملتان کے راستہ میں آملا۔ لیکن اورنگ زیب کی ہوشیاری اور متانت نے اُسے اس بڑی جوکھوں سے بچا لیا۔ چنانچہ اُس نے مطلق کچھ خوف و اضطراب ظاہر نہ کیا بلکہ یہ دکھانے کو کہ اُس کا آنا اس کی بڑی ہی خوشی کا باعث ہے گھوڑا دوڑا کر نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ ہاتھ سے جلد آیئے، جلد آیئے کا اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھا اور پکار کر کہا۔

"سلامت باشید راجہ جی! سلامت باشید بابا جی!" اور جب دونوں ذرا نزدیک پہنچے تو پھر کہا خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کے آنے کا کس قدر انتظار تھا۔ بہت ہی خوب ہوا کہ آپ آ گئے۔ مگر لڑائی ختم ہو گئی اور دارا شکوہ تباہ و برباد خاک چھانتا پھرتا ہے اور میں نے میر بابا کو اُس کے پیچھے بھیج دیا ہے اور اغلب ہے کہ جلد گرفتار ہو جائے گا۔ اور نہایت مہربانی اور التفات کے اظہار کی غرض سے موتیوں کی مالا جو پہنے ہوئے تھا اُتار کر راجہ کے گلے میں ڈال دی اور کہا کہ ہماری فوج بہت تھکی ہوئی ہے اس لئے آپ کو بہت جلد لاہور پہنچ جانا چاہیئے۔ مبادا وہاں کچھ بے انتظامی اور شورش ہو جائے اور میں آپ کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کرتا ہوں اور کل اختیار نظم و نسق دیتا ہوں اور میں بھی جلد آپ کے پاس پہنچتا ہوں لیکن رخصت کرنے سے پہلے میرے لئے ضروری ہے کہ سلیمان شکوہ کے معاملہ میں جو آپ نے کارگذاری دکھائی ہے اُس کا شکریہ ادا کروں۔ مگر آپ نے دلیر خاں کو کہاں[1] چھوڑا؟ میں اُس کو خوب سزا دوں گا۔ آپ جلدی لاہور تشریف لے جایئے۔ خدا حافظ

[1] خدا جانے مصنف نے یہ کیا بے سر و پا قصہ لکھ دیا ہے کیونکہ عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان شکوہ

داراشکوہ گجرات میں

جب داراشکوہ ٹھٹھہ میں پہنچا تو اُس نے ایک خواجہ سرا کو جو دانشمندی اور شجاعت دونوں میں مشہور تھا وہاں کا قلعہ دار بنایا اور بہت سے پٹھان اور پرتگیز اور انگریز اور فرانسیس اور ملک جرمنی کے رہنے والے فرنگی توپ خانہ میں نوکر رکھ لیے اور اُن سے وعدہ کیا کہ اگر ہم بادشاہ ہو جائیں گے تو تم کو امارت کے درجے دیئے جائیں گے۔ اور اس طرح پر قلعہ کا بندوبست کر کے اپنا خزانہ وہاں چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب تک اُس کے پاس اشرفی اور روپیہ بہت تھا اور تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے کنارے شان وشوکت سے کوچ کرتا ہوا راجہ کچھ کی عملداری سے گذر کر گجرات میں پہنچ گیا اور احمد آباد کے باہر جا ڈیرہ کیا۔ یہاں کا صوبہ دار شاہ نواز خاں جو اورنگ زیب کا خسر تھا اگرچہ مسقط کے سلاطین سابق کے خاندان سے تھا اور بہت مہذب اور نہایت ذی لیاقت شخص تھا مگر سپاہی منش نہ تھا بلکہ عیش دوست تھا۔ احمد آباد میں شاہی فوج بہ تعداد کثیر موجود تھی اور خوب مقابلہ کر سکتی تھی لیکن اس کی کم ہمتی یا داراشکوہ کے ناگہاں آ پہنچنے سے شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور شاہ نواز خاں بڑی تعظیم وتکریم اور نہایت ادب سے پیش آیا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اُس کی اس قدر خاطرداری اور تعظیم

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کی رفاقت چھوڑ کر اول دلیر خاں متھرا کے قریب بمقام سلیم پور اور پھر چار پانچ روز بعد راجہ جے سنگھ خاص متھرا میں اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا بلکہ ستلج سے عبور کرنے کے بعد یہ دونوں سردار بہادر خاں اور خلیل اللہ خاں کی مدد کے لئے جو اورنگ زیب کی سپاہ خاص کے آگے آگے داراشکوہ کے تعاقب میں لاہور کو جاتے تھے بھیجے گئے تھے۔ س م ح

لہ شاہ نواز خاں جس کا نام میرزا بدیع الزماں تھا ایران کے بادشاہ شاہ سلیمان صفوی کی اولاد سے تھا اور اُس کا باپ مرزا رستم جو بہت خوش سلیقہ اور شاعر شہزادہ قندھار سے آ کر شاہجہاں کا ملازم ہو گیا تھا۔ اور شرافت اور علو خاندان کی وجہ سے شاہجہاں نے اپنے بیٹے سلطان شجاع کی شادی اُس کی بیٹی اور اورنگ زیب اور مراد بخش کی شادی اُس کی دو پوتیوں یعنی شاہ نواز خاں کی بیٹیوں سے کر دی. چنانچہ اورنگ زیب کا تیسرا بیٹا محمد اعظم اور مشہور و معروف بیٹی زیب النسا بیگم اسی بیگم سے تھی جس کا نام دل رس بانو بیگم تھا پس مصنف کی یہ غلطی ہے کہ اس کو سلاطین مسقط کے خاندان میں سے بتایا ہے۔ کیونکہ خاندان صفوی کا مسقط سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ اُس کا نشوونما اردبیل سے ہوا جو ملک ایران کا ایک مشہور شہر ہے اور اپنے بزرگ شاہ صفی کے نام کی مناسبت سے جو قوم کا سید اور صوفی مشرب

وتکریم کی کہ اُس نے اُس کو اپنا خیر خواہ اور طرف دار سمجھ لیا اور اگرچہ لوگوں نے اُس کو اس کی خیانت سے آگاہ کر دیا تھا لیکن شہزادہ نے دھوکہ میں آکر بے احتیاطی سے بھروسہ کر لیا اور اپنے تمام منصوبے اور ارادے اور راز اُس پر ظاہر کر دیئے اور جسونت سنگھ اور دوسرے خیر خواہ لوگ جو سپاہ جمع کر کے مدد کی تیاریاں کر رہے تھے اُن کے خط وغیرہ سب اُس کو دکھا دیئے

اورنگ زیب اور سلطان شجاع کا مقابلہ

اورنگ زیب کو جب یہ خبر لگی کہ داراشکوہ نے احمد آباد لے لیا تو وہ نہایت حیران اور مضطرب ہوا کیونکہ جانتا تھا کہ داراشکوہ کے پاس روپیہ پیسہ ابھی بہت ہے اور اگر وہاں اُس کے قدم جم گئے تو نہ صرف اُس کے متوسل اور خیر خواہ بلکہ وہ لوگ بھی جو کسی سبب سے مجھ سے ناراض مند ہیں سب کے سب ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آکر اُس کے پاس جمع ہو جائیں گے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ داراشکوہ کو زیر کرنے کے لئے اس کا بذات خود جانا نہایت ضروری ہے لیکن اُس نے سوچا کہ شاہجہاں کو آگرہ میں پیچھے چھوڑ کر اس قدر دور چلے جانا اور اپنے لشکر کو ایسے صوبہ (راجپوتانہ) میں سے لے جانا جہاں جے سنگھ اور جسونت سنگھ جیسے بڑے بڑے راجاؤں کے علاقے ہیں خطرناک اور خلاف مصلحت ہے اس کے علاوہ شجاع کی طرف سے بھی جو ایک بڑی فوج ساتھ لئے ہوئے تیزی سے بڑھا چلا آرہا تھا اُس کو سخت تردد تھا اور سلیمان شکوہ کی طرف سے بھی کھٹکا تھا جو سری نگر کے راجہ کے تعاون اور مدد سے فوج کشی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ غرض کہ وہ اس وقت چند در چند مشکلات اور خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے سوچ سمجھ کر یہی طے کیا کہ سردست داراشکوہ اور شاہ نواز خاں کے معاملہ کو چھوڑ کر شجاع کی خبر لینی چاہیئے جو الہ آباد کی طرف دریائے گنگا کے پار اُتر آیا تھا۔ سلطان شجاع

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ تھا صفوی مشہور تھا۔ اور اُس وقت کی فارسی تاریخوں میں اُس کے داراشکوہ سے مل جانے کی اصل وجہ یہ لکھی ہے۔ کہ جب اورنگ زیب دکن سے چڑھائی کر کے برہان پور سے آگرہ کی طرف چلنے کو تھا تو شاہنواز خاں یہ خیال کر کے کہ خدا جانے انجام اس مہم کا کیا ہو اُس کی رفاقت سے بچنا چاہتا تھا اس وجہ سے اورنگ زیب نے ناراض ہو کر قلعہ برہان پور میں اُس کو قید کر دیا تھا مگر جب سموگڈھ کی لڑائی میں داراشکوہ پر فتح پائی تو قید سے چھوڑ کر گجرات کا صوبہ دار کر دیا۔ مگر وہ اپنی اس بے عزتی کو ہنوز بھولا نہیں تھا۔ اور اس وجہ کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ فوج بھی اُس کے پاس کچھ زیادہ نہ تھی کہ جس سے داراشکوہ کا مقابلہ کر سکتا۔ س م ع

نے اپنا کیمپ موضع کھجوہ[1] میں جو ایک بڑے تالاب کے کنارے نہایت عمدہ موقعہ پر تھا قائم کیا اور اس بات کو مناسب سمجھا کہ یہیں ٹھہر کر اورنگ زیب کے حملہ کا انتظار کیا جائے۔ اورنگ زیب نے آکر اپنا لشکر دریا کی شاخ کے ایک کنارے مخالف فوج سے ساڑھے چار میل کے فاصلہ پر قائم کیا۔ چنانچہ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک بہت وسیع میدان تھا جس میں دونوں طرف کی فوجیں لڑائی کے وقت بخوبی دوڑ دھوپ کر سکتی تھیں۔ اور چونکہ اورنگ زیب یہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو لڑائی کا خاتمہ کیا جائے اس لئے لشکرگاہ میں پہنچتے ہی باربرداری دستوں کو دریا کے اسی کنارے چھوڑ کر خود حملہ کے ارادہ سے اس پار جا اترا دوسرے ہی دن لڑائی شروع ہونے سے پہلے صبح کے وقت میر جملہ[2] بھی دولت آباد سے آکر شامل ہو گیا تھا۔ دارا شکوہ کے بھاگ جانے کے بعد اُس کے اہل وعیال قید سے رہائی پا ہی چکے تھے اور اورنگ زیب کی مصلحتوں کے لحاظ سے بھی اُس کا مزید قید میں رہنا ضروری نہیں رہا تھا لڑائی بڑے جوش وخروش سے شروع ہوئی اورنگ زیب کی فوج نے بے حد شجاعت اور سرگرمی سے حملے کئے لیکن شجاع اپنے مورچوں سے ہرگز آگے نہ بڑھا اور اپنی ہی جگہ قائم رہ کر حملہ آوروں کو بڑے نقصان کے ساتھ پسپا کرتا رہا اُس کی اس تدبیر نے اورنگ زیب کو نہایت ہی پریشان کیا۔

شجاع کی اس تدبیر کا اصل مدعا یہ تھا کہ اگر ہم بدستور اپنے مورچوں میں قائم رہ کر لڑتے جائیں گے تو گرمی[3] کے مارے تھوڑی دیر کے بعد اورنگ زیب خود ہی دریا کی طرف ہٹنے

---

[1] فارسی تاریخوں میں اس جگہ کا نام کھجوہ کا تالاب لکھا ہے جو قصبہ کوڑا اور جہاں آباد سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ضلع فتحپور قسمت الہ آباد میں ہے۔ یہاں جمنا اور گنگا کا ایک بہت ہی تنگ دوآبہ ہے اور یہ سب مقامات اُسی میں ہیں۔ س م ح

[2] دارا شکوہ کی شکست کے چند روز بعد میر جملہ کو اورنگ زیب کے احکام کے بموجب سلطان محمد معظم نے جو باپ کی غیبت میں دکن کا منتظم تھا رہا کر دیا اور تمام مال ومتاع واپس دیدیا تھا اور اس وقت وہ خاندیس کی صوبہ داری کے عہدہ پر برہان پور میں تھا اور حسب الطلب وہیں سے آن کر اس لڑائی میں جو دارا شکوہ کی شکست سے آٹھویں مہینے ہوئی تھی شامل ہوا تھا۔ س م ح

[3] پانچویں جنوری ۱۶۵۹ء کو یہ لڑائی ہوئی تھی جو عین جاڑے کا موسم تھا۔ پھر معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف نے گرمی کا ذکر کیوں کیا ہے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ لڑائی لڑنے والوں کو پانی کی ضرورت ہر موسم میں ہوتی ہے س م ح

پر مجبور ہوگا اور اُس وقت ہم کو اُس کی فوج کے پچھلے حصے پر حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اورنگ زیب بھی بھائی کی اس حکمت کو خوب سمجھے ہوئے تھا اور اس لئے وہ برابر آگے بڑھے جانے پر زور دے رہا تھا۔ لیکن ایسے نازک وقت میں یہ ناگہانی حادثہ پیش آیا کہ راجہ جسونت سنگھ نے جو بظاہر بڑے خلوص کے ساتھ اُس سے آن ملا تھا اُس کی پچھلی فوج پر ایک ایسا حملہ کر دیا کہ وہ شکست کھا کر بھاگ گئی اور اُس نے تمام خزانہ اور اسباب کو لوٹنا شروع کر دیا اور چونکہ یہ خبر بہت جلد تمام لشکر میں پھیل گئی اس لئے ایشیائی فوجوں کے دستور کے مطابق اورنگ زیب کی سپاہ بہت ہی ہراساں اور بے دل ہو گئی۔ اس ناگہانی حملہ سے اورنگ زیب کے خطرات اور بڑھ گئے۔ لیکن اُس کی مستقل مزاجی میں ذرا بھی فرق نہ آیا وہ خوب جانتا تھا کہ اگر پیچھے ہٹا تو سب اُمیدیں خاک میں مل جائیں گی اس لئے اُس نے جس طرح کہ داراشکوہ کے مقابلہ میں یہ ٹھان لی تھی کہ خواہ کچھ ہی ہو میدانِ جنگ میں قائم رہ کر نتیجہ کو دیکھنا چاہیئے اُسی طرح اب بھی جمے رہنے کا پکا ارادہ کر لیا اور اگرچہ اُس کی فوج میں دم بدم پریشانی بڑھتی جاتی تھی اور شجاع نے اس حالت کو غنیمت سمجھ کر ایک بڑا سخت حملہ کیا اور اتفاقاً ایک تیر لگ کر مہاوت کے مارے جانے سے اورنگ زیب کا ہاتھی ایسا بے قابو ہو گیا کہ وہ گھبرا کر اس پر سے اُترنا چاہتا تھا مگر میر جملہ نے جو قریب تھا اور جس کی جرأت اور بہادریوں کو دیکھ کر سب اہلِ فوج دنگ ہو رہے تھے پکار کر کہا۔ دکن کو، دکن کو! یعنی خیال کرو کہ دکن کہاں ہے اور کیا غضب کرتے ہو کیا اب بھاگ کر دکن جاؤ گے؟ اور اس بہادرانہ نصیحت سے اُس کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

اگرچہ اورنگ زیب کی تباہی میں اس وقت کوئی دقیقہ باقی نہ رہا تھا اور اُس کی مشکلات کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کو یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ اب کوئی دم میں دشمن کے پنجہ میں پھنس جاؤں گا۔ مگر قسمت کا پھیر بھی ایک عجیب چیز ہے کہ اس فکر و تردد کے باوجود فتحیاب ہو گیا اور جس طرح سموگڈھ کی لڑائی میں ایک ادنےٰ حرکت کے باعث داراشکوہ کو اپنی جان بچا کر میدان سے بھاگنا پڑا تھا۔ شجاع کو بھی وہی حادثہ پیش آیا یعنی وہ بھی اورنگ زیب کی بھاگی ہوئی فوج پر زیادہ چستی کے ساتھ حملہ کرنے کے لئے اپنے ہاتھی سے اُتر پڑا اور اگرچہ یہ تحقیق نہیں ہے کہ اس کو بھی یہ صلاح بدنیتی سے دی گئی تھی یا خیرخواہی سے۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اللہ وردی خاں نے جو اس کا ایک بڑا سردار تھا اس وقت

بڑی ہی التجا سے کہا کہ گھوڑے پر سوار ہو جائیے اور جو لفظ خلیل اللہ خاں نے سموگڑھ کی لڑائی میں کہے تھے اس کے لفظ بھی بعینہ ویسے ہی تھے یعنی دست بستہ ہو کر بڑی منت سے یہ کہا کہ "حضور! اس بڑے ہاتھی پر ایسی جان جوکھوں میں کیوں بیٹھے ہیں کیا ملاحظہ نہیں فرماتے کہ دشمن بھاگے جاتے ہیں اور اب چستی سے اُن کا تعاقب نہ کرنا سخت غلطی ہے پس جلدی گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کا پیچھا کیجئے۔ اور پھر دیکھ لیجئے کہ ہندوستان کا تخت آپ کے قدموں کے نیچے ہے اور آپ ہندوستان کے بادشاہ ہیں"۔

چنانچہ اس حرکت سے جو حادثہ دارا شکوہ کو پیش آیا تھا وہی شجاع کو پیش آیا یعنی جوں ہی وہ فوج کی نظر سے غائب ہوا سب کے دل میں شبہ گذر گیا کہ یا تو مارا گیا یا کہیں فریب سے پکڑا گیا اور اُس کی فوج ایسی بے انتظام اور تتر بتر ہو گئی کہ دوبارہ جمع کرنا ممکن نہیں رہا[۱]

---

[۱] شاہجہاں کی بیماری کی خبر پا کر جب شجاع نے بنگالہ سے فوج کشی کی تھی اُس وقت الہ وردی خاں بہار کا صوبہ دار تھا۔ جب شجاع پٹنہ پہنچا اُس نے لڑے بھڑے بغیر ہی اُس کی اطاعت کرلی اور اُس وقت سے یہ اُس کے پاس بہ حیثیت وزیر کے تھا اور وہ اس کی اس قدر عزت کرتا تھا کہ ہمیشہ اُس کو خان بھائی کہتا تھا عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ سنجر نامی اس کا بڑا بیٹا کھجوہ کی شکست کے بعد شجاع سے جدا ہو کر اورنگ زیب کے پاس حاضر ہو گیا تھا۔ اور جب ان واقعات کے بعد شجاع نے میر جملہ اور محمد سلطان کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے مونگیر سے پیچھے راج محل کی طرف کوچ کر دیا تو الہ وردی خاں فوج مخالف میں آ ملنے کی نیت سے مونگیر میں ٹھہر گیا۔ اور بعض اور ...دے لوگ بھی اُس کے ساتھ ہو گئے۔ چونکہ ایسے بڑے سردار کے علیحدہ ہو جانے سے نہایت اندیشہ تھا۔ اس لئے شجاع واپس آکر مونگیر کے باہر اپنے باغ میں آکر ٹھہرا اور چند سرداراور کچھ سپاہ الہ وردی خاں کو حاضر کرنے کے لئے جو مقابلہ پر آمادہ ہو بیٹھا تھا مامور کئے جو وہ دھمکا کر اُس کو پکڑ لائے اور شجاع نے اُس کو اور اس کے بیٹے سیف اللہ کو تہِ تیغ کرادیا۔

پس ان حالات پر خیال کرنے سے تعجب نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے بھی ہاتھی سے اترنے کی صلاح خیانت ہی سے دی ہو۔

س م ح

آگرہ میں اورنگ زیب کی شکست کی افواہ

جسونت سنگھ نے جب دیکھا کہ معاملہ برعکس ہو گیا تو لوٹ کا مال سمیٹ کر فی الفور اس ارادہ سے آگرہ کو چل دیا کہ وہاں سے اپنے وطن کو چلا جائے اور چونکہ آگرہ میں یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ اورنگ زیب شکست کھا کر قید ہو گیا ہے اور شجاع بھاری فوج لئے ہوئے آگرہ کو آرہا ہے۔ یہ افواہ یہاں تک پھیل گئی تھی کہ شائستہ خاں نے بھی اس کو سچ جان لیا چنانچہ یہ سن کر کہ جسونت سنگھ جس کی دغا بازیوں سے وہ خوب واقف تھا شہر کے قریب پہنچ گیا ہے ایسا مایوس ہوا کہ زہر کا پیالہ پی کر مر جانے پر آمادہ ہو گیا اور بے شک پی ہی لیتا اگر اس کی مستورات اس پر نہ آگرتیں اور پیالہ چھین کر نہ پھینک دیتیں۔ لڑائی کے اصل حال سے آگرہ والے دو دن تک اس قدر بے خبر تھے کہ اگر جسونت سنگھ ذرا جرأت کر کے لوگوں کو دھمکاتا وعدوں اور ترغیبوں سے کام لیتا تو بے شبہ شاہجہاں کو قید سے چھڑا لیتا۔ لیکن حقیقت حال اس پر روشن تھی اس لئے آگرہ میں زیادہ ٹھہرنا یا ان بکھیڑوں میں پڑنا اس نے مناسب نہ جانا اور صرف شہر میں سے ہوتا ہوا اپنے ملک کو چلا گیا[1]

---

[1] جب اورنگ زیب نے دارا شکوہ کو مغلوب کر کے شاہجہاں کو قابو میں کر لیا تو سب سے پہلے اس نے یہ کام کیا کہ شجاع کے ساتھ اپنا قدیمی حسن سلوک جتانے کے لئے بادشاہ سے بڑے اصرار کے ساتھ اس مضمون کا فرمان حاصل کیا کہ صوبہ بنگالہ کے علاوہ صوبہ بہار بھی جس کو سلطان شجاع نہایت خواہشمند تھا اور سلیمان شکوہ سے شکست کھانے کے بعد دارا شکوہ نے بادشاہ سے اپنے نام کرا لیا تھا شجاع کو دیا جائے اور اس کو اپنے ایک نہایت پر تپاک اور محبت آمیز خط میں ملفوف کر کے اس کے پاس بھیجا جس میں دارا شکوہ کی شکست اور تباہی اور اپنے قدیمی اتحاد کی یاد دہانی کے علاوہ یہ چلتا ہوا فقرہ بھی درج تھا کہ فی الحال آپ اس طرح پر اپنے اُس نقصان کا تدارک کیجئے جو سلیمان شکوہ کے مقابلہ میں اٹھا چکے ہیں۔ اور جب دارا شکوہ کے معاملہ سے فارغ ہو کر میں پنجاب سے واپس آؤں گا تو ملک اور مال دونوں میں آپ کے حقوق کا پورا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ اس خط کو پا کر وہ بہت ہی شکر گذار ہوا۔ مگر پٹنہ میں آ کر جب اُس نے دیکھا کہ اورنگ زیب دارا شکوہ کے پیچھے پنجاب کی طرف بہت دور نکل گیا ہے تو آگرہ پہنچنے اور سلطنت ہتیا لینے کے قصد سے بنارس اور الہ آباد کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ چونکہ دارا شکوہ نے پنجاب بھاگنے سے پہلے بذریعہ خط و کتابت شجاع سے صلح کر لی تھی۔ اور اورنگ زیب کی چال بگاڑنے کے لئے پٹنہ سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ الہ آباد تک اپنے تمام قلعداروں کے نام اُس کی اطاعت کرنے کے احکام بھیج دیئے تھے۔ اس سبب سے وہ بلا مزاحمت الہ آباد پر قابض ہو گیا۔ ادھر اورنگ زیب کا یہ حال تھا کہ وہ دو طرفہ لڑائی سے بچنے کے لئے یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح شجاع لڑے بھڑے بغیر ہی واپس چلا جائے اور آگے نہ بڑھے۔ اس لئے پنجاب سے جلد دلی پہنچ کر اول شاہزادہ محمد سلطان کو آگرہ سے جواب تک وہیں مامور تھا اُس کی راہ روکنے کے لئے روانہ کیا۔ اور بعد ازاں موقعہ سے قریب رہنے کی خاطر شکار کھیلنے کا حیلہ کر کے خود بھی "سواروں" میں جو الہ آباد کے رخ گنگا کے کنارے ایک جگہ ہے جا پہنچا۔ اور اس عرصہ میں شجاع کے پاس کئی بار نصائح آمیز خط اور پیغام بھیجے۔ مگر جب اُس نے نہ مانا اور الہ آباد سے بھی کھجوہ تک بڑھ آیا تو ستر ھویں ربیع الاول ۱۰۶۹ھ مطابق تیسری جنوری ۱۶۵۹ء کو محمد سلطان کے لشکر سے کوڑہ میں جا ملا۔ جو شجاع کے لشکر سے قریب چار کوس کے تھا۔ اور انیسویں ربیع الاول کو خیمہ گاہ اور کارخانہ جات شاہی کو اسی جگہ چھوڑ کر نوے ہزار سواروں کے ساتھ لڑنے کے لئے روانہ ہوا۔ اگرچہ طرفین سے لڑائی ہوتی رہی لیکن دور دور سے صرف توپوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ جب شام کو لڑائی بند ہوئی تو شجاع نے یہ غلطی کی کہ اُس کا توپ خانہ جو اونچی جگہ پر تھا۔ اور اس وجہ سے اچھا کام دیتا رہا تھا اپنے لشکر گاہ کے قریب بلا لیا اور میر جملہ نے موقعہ پا کر اُس کی جگہ اپنی توپیں جا جمائیں۔ اور چونکہ شجاع کی سپاہ اور توپ خانہ کے پیچھے ہٹ جانے سے اس طرف والوں کو شب خون کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اورنگ زیب پیچھے ہٹ کر اپنے لشکر گاہ کو نہ گیا بلکہ اُس کی کل فوج اور تمام امیر جس ترتیب سے میدان جنگ میں قائم تھے وہیں اُتر پڑے۔ اور حکم دیا گیا کہ گھوڑوں کے زین اور سپاہیوں کی کمریں اُسی طرح بندھی رہیں۔ علاوہ بریں ہوشیار اور خبردار رہنے کے لئے میر جملہ امرا اور سرداروں کو بہت تاکیدیں کرتا پھرا۔ اور بعد نماز عشا جب اورنگ زیب اپنے مختصر سے خیمہ گاہ میں جو میدان جنگ ہی میں لگا دیا گیا تھا جا کر سو رہا۔ تو آخر شب کو ایک عجیب ہنگامہ برپا ہوا جس سے اُس کے لشکر کو بڑا نقصان پہنچا۔ یعنی مہاراجہ جسونت سنگھ جس کی تقصیر معاف کر کے اورنگ زیب دہلی سے اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ اور اس وقت وہ اُس کے لشکر کے دائیں بازو کا سردار تھا شجاع کو یہ خبر بھیج کر کہ ادھر میں فساد اور شور و شر برپا کرتا ہوں اُدھر سے آپ آئیں اور اس طرح اورنگ زیب کو تباہ کر ڈالیں — بڑے بڑے راجپوت امیروں کو جو اُس کی کمان میں تھے ہمراہ لے کر میدانِ جنگ سے پیچھے کی طرف سے نکل بھاگا اور اول محمد سلطان کے کیمپ کو جو سرِ راہ تھا۔ اور بعد ازاں اور امیروں اور خود اورنگ زیب کے

محمد سلطان اور میر جملہ شجاع کے تعاقب میں

اورنگ زیب کو جسونت سنگھ کے کرتوتوں کا بڑا کھٹکا تھا اور خیال تھا کہ آگرہ سے شورش کی کوئی نہ کوئی خبر آئے گی اس لئے شجاع کا زیادہ پیچھا نہیں کیا اور تمام لشکر سے کر تیزی سے دارالسلطنت کی طرف کوچ کر دیا۔ مگر اس کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ غنیم کے لشکر کا اس لڑائی میں کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ شجاع کی دولت مندی اور فیاضی کی شہرت کے باعث ‏«

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لشکر گاہ اور کارخانہ جات شاہی کو بے دھڑک لوٹتا ہوا چلا گیا۔ اس حادثہ سے ایک عجیب پریشانی اور ابتری پھیل گئی۔ اور بہت سے لوگ رات ہی کو شجاع سے جا ملے مگر ابھی کچھ رات باقی تھی کہ اورنگ زیب اس حال کی خبر پا کر تخت رواں پر سوار ہو کر کمال استقلال سے اپنے خیمہ کے باہر آن کھڑا ہوا۔ اور ہنس ہنس کر اپنے رفیقوں اور امیروں کو اس طرح تسلی دیتا رہا۔ کہ خوب ہوا کہ ہمارا لشکر منافقوں کے خس و خاشاک سے پاک ہو گیا۔ اگرچہ اس ناگہانی فساد کے سبب سے نصف فوج رہ گئی تھی۔ مگر بڑے استقلال سے باقی ماندہ سپاہ کو از سر نو جا بجا جنگی ترتیب سے پھر مامور کیا۔ اور اس غرض سے کہ فوج اس کو اور یہ فوج کو دیکھتا رہے اپنے معمول کے موافق صبح کو ایک بڑے ہاتھی پر سوار ہو کر اور شہزادہ محمد اعظم کو ساتھ بٹھا کر لڑائی کے لئے نکلا۔ چنانچہ اول توپوں اور بانوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ پھر دونوں لشکر دست بدست ٹکرانے لگے۔ شجاع کے لشکر نے اس کی فوج کے دائیں بازو کو شکست دے کر ہٹا دیا۔ جس سے بڑی پریشانی ہوئی۔ اور بہت سے سپاہی دشمنوں سے جا ملے اور بعد ازاں انہوں نے فوج کے قلب کو جہاں اورنگ زیب خود موجود تھا خوب دبایا اور کئی دفعہ اس کی جان پر بن گئی۔ چنانچہ ایک جنگی ہاتھی تو اس کے اس قدر قریب پہنچ گیا کہ کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ اگر اورنگ زیب کا ایک بندوقچی جو ساتھ کے ہاتھیوں کے ایک ہودے میں بیٹھا ہوا تھا اس کے فیلبان کو گولی سے نہ اڑا دیتا تو خدا جانے اورنگ زیب پر کیا گذرتی غرض اورنگ زیب اپنے استقلال سے ہر خطرناک موقعہ پر غالب آیا اور دشمنوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور ایک سو چودہ توپیں اور بہت سے ہاتھی ہاتھ آئے۔ اور تالاب کھجوہ پر جہاں شجاع کا لشکر مقیم تھا جا کر ڈیرہ کیا۔ اور اسی روز محمد سلطان کو شجاع کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اور پھر میر جملہ کو "ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار" کا منصب دے کر اس کی مدد کو بھیجا۔ اور خود آگرہ ہوتا ہوا اجمیر کو چلا گیا۔ کیونکہ داراشکوہ گجرات سے اور مہاراجہ جسونت سنگھ اپنے وطن جودھپور سے بالاتفاق اجمیر پر چڑھ کر آنے والے تھے۔ (ماخوذ از عالمگیرنامہ وغیرہ)

م م ح

سب راجے جن کی ریاستیں گنگا کے دونوں کناروں پر ہیں اُس کی مدد کے لئے اپنی فوجیں بھیج رہے ہیں اور اُس کی طاقت بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ بھی اطلاع پہنچی ہے کہ وہ الہ آباد میں اپنے پاؤں جمانا چاہتا ہے تاکہ گنگا کے اس مشہور گھاٹ کو جو حقیقت میں صوبہ بنگالہ کا دروازہ ہے ہاتھ سے نہ جانے دے پس اُس نے سوچا کہ صرف دو شخص اس قابل ہیں جو ان مشکلات میں مجھے مدد دے سکتے ہیں ایک محمد سلطان دوسرا میر جملہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ جو شخص بھی کوئی نمایاں خدمت بجالاتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خواہ اُس کو کیسا ہی صلہ کیوں نہ دیا جائے وہ اُسے اپنی خدمت کے مقابلہ میں بے حقیقت ہی سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھتا تھا کہ محمد سلطان کو میری اطاعت ابھی سے ناگوار ہے۔ اور قلعہ آگرہ پر قابض ہو جانے اور شاہجہاں کو قید کر لینے کی وجہ سے بڑی ودن کی لیتا ہے۔ اب رہا میر جملہ۔ اگرچہ وہ اُس کی کمال دانائی سنجیدگی اور دلاوری کا قائل تھا لیکن اُس کے انھیں اوصاف سے ڈرتا بھی تھا۔ کیونکہ ایک تو اُس کی دولتمندی کا بڑا شہرہ تھا اُس کے علاوہ تمام ہندوستان میں ایک ایسا دانا اور دور اندیش اور کامل وزیر سمجھا جاتا تھا کہ مشکل سے مشکل معاملات کو اپنے حسن تدبیر سے بخوبی سرانجام دے سکتا ہے ان وجوہ سے اورنگ زیب اس کی حیرت انگیز شخصیت کو بھی اُس کی حوصلہ آزمائی اور جاہ طلبی کی وجہ سے محمد سلطان سے کچھ کم خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔ یہ مشکلیں ایسی تھیں جو ایک معمولی عقل کے آدمی کو ضرور دقتوں میں پھنسا دیتیں۔ لیکن اورنگ زیب نے ایسی حکمت اور ہوشیاری سے کام لیا کہ دونوں کو دارالسلطنت سے چلتا بھی کر دیا اور دونوں میں سے کوئی شاکی بھی نہ ہونے پایا۔ یعنی ایک بڑی فوج سپرد کر کے ان کو شجاع کے مقابلہ پر روانہ کر دیا اور رخصت کے وقت میر جملہ کو تو یہ سمجھا کر راضی کر دیا کہ فتح کے بعد بنگالہ کے زرخیز صوبہ کی حکومت مدت العمر کے لئے آپ ہی کے واسطے ہے بلکہ آپ کے بعد آپ کا بیٹا بھی اس صوبہ داری کا مستحق سمجھا جائے گا۔ اور اگرچہ آپ کی خدمات بہت سی عنایتوں کے قابل ہیں مگر اُن میں سے فی الحال یہ ایک ہے۔ اور جب آپ شجاع پر فتح پالیں گے تو امیر الامرا[1] کا خطاب جو ہندوستان میں سب سے بڑا خطاب ہے آپ کو عطا کیا جائے گا اور محمد سلطان سے یہ کہا کہ بیٹا

---

[1] فارسی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شجاع کی بربادی کے بعد میر جملہ کے لئے خانخاناں سپہدار بنگالہ خطاب لکھا جاتا تھا اور امیر الامرا کا خطاب شائستہ خاں کو دیا گیا تھا۔ س م ح

خیال کرو کہ میری اولاد میں تم سب سے بڑے ہو اور اپنے ہی کام پہچانتے ہو اور بے شک تم نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو ابھی کچھ بھی نہیں کیا کیونکہ تا وقتیکہ شجاع کو جو ہمارے مخالفوں میں ایک بہت بڑا شخص ہے شکست دے کر پکڑ نہ لاؤ سارے ہی کام ادھورے ہیں۔ اس فہمائش کے بعد اورنگ زیب نے دونوں کو حسب معمول بڑے قیمتی "سراپا" یعنی خلعت دیئے۔ اور چند گھوڑے اور ہاتھی عمدہ ساز و سامان سمیت عنایت کیے۔ اور جس طرح سے ہو سکا محمد سلطان کی بیگم اور میر جملہ کے بیٹے محمد امین کو اُن کے ساتھ نہ جانے دیا یعنی محمد سلطان کی بیگم کو تو جو شاہ گولکنڈا کی بیٹی تھی اس حیلہ سے ٹھیرالیا کہ ایسی عالی خاندان شہزادی کا لڑائی کے وقت لشکر کے ساتھ جانا کسی طرح زیبا اور مناسب نہیں۔ اور محمد امین خاں کو اس بہانہ سے روک لیا کہ ابھی یہ بہت کم سن ہے اور ازراہ شفقت ہم چاہتے ہیں کہ خاص اپنے زیر نظر رکھکر اس کو تعلیم و تربیت دیں۔ لیکن دراصل ان دونوں کو یرغمال بنا رکھا تھا تاکہ شہزادے اور میر جملہ سے کسی بے وفائی کا اندیشہ نہ رہے

شجاع کی بنگالہ واپسی

اب شجاع کا حال سنیئے کہ چونکہ اُس کو برابر یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ مبادا زمیندار بنگالہ کے وہ راجہ جو میری چھینا جھپٹیوں اور زیادتیوں سے دل میں ناراض ہیں کسی کے بہکانے سے پیچھے فساد کر بیٹھیں اس وجہ سے جب اورنگ زیب کی ان کارروائیوں سے مطلع ہوا تو فوراً الہ آباد سے ڈیرہ ڈانڈا اٹھا بنارس اور پٹنہ کی طرف کوچ کر گیا۔ کیونکہ اُسے یہ اندیشہ تھا کہ غالباً میر جملہ بجائے الہ آباد کے کسی اور گھاٹ سے گنگا عبور کر کے بنگالہ کی واپسی راستہ کو روکنا چاہے گا۔ چنانچہ انھیں اندیشوں سے بنارس اور پٹنہ سے بھی پیچھے مونگیر کو چلا گیا جو گنگا کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہے اور ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب جنگل اور دریا ہونے کی وجہ سے ایک محفوظ مقام اور بنگالہ کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس نے مورچہ بندی کر لی اور شہر اور دریا کے کنارے سے لے کر پہاڑ تک ایک بڑی گہری خندق[1] کھدوائی۔ چنانچہ اس واقعہ کے کئی سال

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ مونگیر کے ایک طرف جو قدرتی پہاڑ اور دوسری جانب دریائے گنگا ہے ... نے اپنی حکومت کے زمانہ میں پہاڑ سے لیکر دریا تک سوا کوس لمبی دیوار کھنچوا کر اُس کے مقابل کی سمت میں خندق کھدوائی تھی۔ شجاع نے ان باہمی فساد کے دنوں میں اس دیوار کی مرمت کرا کر ہر بیس گز پر ایک ایک برج بنوا تھا اور خندق کو پانی تک گہرا کرا دیا تھا۔ س م ح

بعد اس خندق کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ غرض اس مستحکم مقام میں گنگا کے گھاٹ کو روکے ہوئے وہ فوج مخالف کے حملہ کا منتظر تھا۔ کہ یکایک اُسے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ وہ لشکر جو بتدریج دریا کے کنارے کنارے بڑھا آتا تھا صرف دھوکا دینے کی غرض سے تھا اور میر جملہ اُس میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ اُن راجاؤں کو جن کی ریاستیں دریا کے دائیں کنارے کوہستان میں ہیں اپنا معاون بنا چکا ہے اور پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا محمد سلطان اور اپنی چیدہ و منتخب سپاہ کو لیئے ہوئے راج محل کی طرف اس غرض سے جا رہا ہے کہ ہمارے پیچھے ہٹنے کا راستہ روک کر ہم کو بنگالہ کے اندر جانے نہ دے۔ چنانچہ یہ خندق اور مورچے جو اتنے اہتمام سے تیار ہوئے تھے یوں ہی چھوڑ دینے پڑے۔ مونگیر اور راج محل کے درمیان گنگا اس طرح حائل ہے کہ کئی چکر اور پھیر کھا کر گذرتی ہے اس سبب سے اسے بڑی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں مگر پھر بھی میر جملہ سے کئی روز پہلے راج محل میں جا پہنچا بلکہ کچھ مورچے باندھ لینے کی بھی فرصت مل گئی۔ کیونکہ میر جملہ اور محمد سلطان یہ دیکھکر کہ اس کو اب راج محل پہنچنے سے روکنا ناممکن ہے اپنے بائیں ہاتھ بعض نہایت دشوار گذار راستوں سے گذرتے ہوئے اس غرض سے گنگا کے رخ ہو گئے کہ اپنے بھاری توپ خانہ اور بقیہ فوج اور بار برداری دستوں کو جو دریا کے راستہ سے آرہے تھے اپنے ساتھ شامل کرلیں اور جب ان کا یہ مدعا حاصل ہو گیا تو راج محل پہنچ کر لڑائی شروع کردی پانچ روز تک شجاع خوب جم کر لڑا مگر جب دیکھا کہ میر جملہ کے توپ خانہ کی متواتر ضرب میرے مورچوں کو (جو درختوں کی شاخوں اور لکڑیوں سے برج کی صورت میں مٹی اور ریت بھر کر بنالئے گئے تھے) برباد کئے جاتی ہے۔ اور اس خیال سے بھی کہ برسات کا موسم قریب آگیا ہے اُس وقت اُن کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچے گا راتوں رات وہاں سے نکل گیا مگر دو توپیں جو بہت بھاری تھیں یہیں چھوڑ گیا۔ اور میر جملہ اس خوف سے اُس کا پیچھا نہ کر سکا کہ شب خون کے ارادے سے کہیں وہ ہماری گھات میں لگا ہوا نہ ہو اور شجاع کی خوش نصیبی سے صبح ہونے سے پہلے اس زور کا مینہ برسا کہ اُس کے تعاقب کے لئے راج محل سے کوچ کا خیال تک کرنا ناممکن

---

(۱) جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ سے پہلے وہاں اکثر آگ لگتے رہنے کے سبب سے عوام الناس اس جگہ کو آگ محل کہنے لگے تھے۔ راجہ مان سنگھ بنگالہ کا صوبہ دار ہوا اس نے اپنے رہنے کے لئے وہاں اینٹ مٹی سے ایک مستحکم حصار تیار کراکر اس کا نام راج محل رکھدیا بعد ازاں اس جگہ کا نام بادشاہی دفتروں میں اکبر نگر لکھا جاتا رہا اور اب بدستور راج محل مشہور ہے۔ س م ح

ہو گیا۔ یہ بارش نہایت ہی شدید اور برسات کا آغاز تھی جو بنگالہ میں جولائی سے اکتوبر تک بہت ہی کثرت سے ہوا کرتی ہے۔ اور راستے ایسے خراب ہو جاتے ہیں کہ کسی حملہ آور فوج کے سفر کے قابل نہیں رہتے۔ پس میر جملہ کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ وہ برسات کے ختم ہونے تک راج محل میں ٹھہر کر اپنی فوج کو شجاع کی سپاہ کے مکانوں میں آرام لینے دے۔

شجاع کی از سر نو تیاریاں برسات کی وجہ سے شجاع کو بڑی مہلت مل گئی کہ جس جگہ مناسب سمجھا وہاں ٹھہر کر اپنے حسب حال تدبیریں کرتا رہا۔ اور بہت سی نئی فوج نوکر رکھ لی۔ جس میں بہت سے پرتگیز بھی تھے۔ جو معہ چند توپوں کے بنگالہ کے اُن ضلعوں سے آ گئے تھے۔ جو نیچے کی طرف ہیں۔ واضح رہے کہ ملک کی انتہائی زرخیزی کے باعث اکثر اہل فرنگ اس نواح میں بسے ہوتے ہیں۔ اس آڑے وقت میں فی الحقیقت یہ شجاع کی خوش تدبیری اور دانائی تھی کہ اُس نے اِن اجنبی لوگوں کی ہمت افزائی اور خاطر داری کی اور اُن کو اپنی سپاہ میں بھرتی کر لیا۔ کیونکہ پرتگیز اصیل اور دوغلے سب ملا کر اس وقت کم سے کم نو دس ہزار یہاں موجود تھے۔ اور فی الواقع اُس کو بڑی مدد دے سکتے تھے۔ اُس نے اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ اُن کے پادریوں کی بہت دل داری اور تالیف قلوب کی اور انعام و اکرام کے وعدوں کے علاوہ یہ وعدہ بھی کیا کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہو اپنے گرجا بنا لینا۔

محمد سلطان کی بغاوت اس عرصہ میں میر جملہ کے لشکر میں نہایت پریشان کُن حالات پیدا ہو گئے کیونکہ اُس میں اور محمد سلطان میں سخت نا اتفاقی ہو گئی جس کی وجہ محمد سلطان کی یہ آرزو تھی کہ کل لشکر کی حکمرانی میرے اختیار میں ہو۔ دوسرے وہ میر جملہ کے ساتھ توہین و تحقیر سے پیش آتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات باپ کی نسبت بھی کچھ ایسے الفاظ کہہ بیٹھتا تھا جو نہ فرزندانہ اطاعت اور ادب ہی کے شایاں تھے اور نہ باپ کے شاہانہ منصب ہی کے، علانیہ کہہ دیا کرتا تھا کہ آگرہ کی تسخیر میں میں نے وہ کام کئے ہیں کہ حضرت کے لئے ضروری ہے کہ اپنی کامیابی کے لئے میرے ممنون ہوں۔ ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے باپ کو سخت ناراض کر لیا اور جب اُس کی ناراضگی کی خبریں سنیں تو اس ڈر کے مارے کہ مبادا میر جملہ کے پاس میری گرفتاری کا حکم آ جائے

اور وہ مجھے قید کرے صرف گنتی کے آدمیوں کے ساتھ راج محل سے چل دیا[1] اور سلطان شجاع کی خدمت میں اطاعت ظاہر کر کے بجا آوری خدمات کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کی لیکن شجاع کو ان باتوں پر کچھ یقین نہ آیا بلکہ یہ شبہ کرتا رہا کہ شاید اورنگ زیب اور میر جملہ نے مجھے بیوقوف بنانے کے لئے کوئی چال چلی ہے چنانچہ اُس کے بڑے بڑے وعدوں اور قسموں پر اعتبار کیا اور نہ اپنی فوج کا کوئی بڑا عہدہ اُسے سپرد کیا بلکہ ہمیشہ اس پر نگرانی قائم رکھی۔ اس طرز سلوک کا انجام یہ ہوا کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں شجاع سے بھی متنفر ہو گیا۔ آخر کار چند مہینوں کے بعد نا اُمید ہو کر پھر میر جملہ کے پاس چلا آیا اور میر جملہ نے خاطر داری اور کسی قدر اعزاز و اکرام کے ساتھ اسے لشکر میں اُتار لیا۔ اور کہا کہ اگرچہ آپ نے بہت بڑا قصور کیا ہے مگر خیر میں بادشاہ سے سفارش کر کے معافی کی درخواست کروں گا۔

میں نے بہت لوگوں سے سُنا ہے کہ یہ عجیب حرکت جو محمد سلطان سے ظہور میں آئی تھی حقیقت میں اورنگ زیب کا ایک منصوبہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ میرا بیٹا خواہ اپنے آپ کو کسی خطرناک کام ہی میں کیوں نہ ڈال دے مگر سلطان شجاع تباہ ہو جائے[2]۔ بہرحال اصل حقیقت خواہ کچھ ہی ہو مگر جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ راج محل کو لوٹ آیا ہے تو موقعہ دیکھکر کہ اب محمد سلطان کو بھی کسی حراست کی جگہ بھیج دینے کا خاصہ بہانہ ہاتھ آگیا ہے واقعی یا بناوٹی خفگی کے ساتھ اُس کو ایک تاکیدی فرمان بھیجا کہ فوراً بلا توقف دہلی کو چلا آئے۔ اب بدنصیب شاہزادہ تعمیل حکم سے سرتابی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پس جوں ہی گنگا کے اس پار اُترا لوگوں کے ایک مسلح گروہ نے گرفتار کر لیا اور زبردستی ایک

---

[1] یہ عجیب اتفاق تھا کہ اُنتیسویں رمضان ۱۰۶۹ھ کو ادھر تو یہ شہزادہ باغی ہوا اُدھر دارا شکوہ اور سپہر شکوہ ٹھیک اسی تاریخ میں ملک جیون کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ س م ح

[2] فارسی تاریخوں سے محمد سلطان کی بغاوت کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو شہزادگی اور لیاقت کا غرور تھا ہی اس پر میر جملہ کی ماتحتی اور بھی ناگوار تھی اور کوتہ اندیش مصاحبوں کی ترغیبیں اور سلطان شجاع کے دم جھانسے اور اپنی لڑکی سے شادی کر دینے کا وعدہ جس کا ذکر پیچھے ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے سب مل کر اس حرکت کا باعث ہوئے تھے چنانچہ جب شجاع کے پاس جا پہنچا تو بمقام ٹانڈہ جہاں مونگیر اور راج محل کے چھن جانیکے بعد شجاع نے برسات کا موسم بسر کیا تھا اُس لڑکی سے اس کی شادی کر دی اور اُس کے واپس آنے کا سبب شجاع کی سرد مہری نہ تھی بلکہ روز مرہ کی شکستوں سے جب اُس نے دیکھ لیا کہ شجاع کی بہبودی کی کوئی اُمید نہیں ہے تو مایوس اور نادم ہو کر آٹھ مہینے سے کچھ زیادہ اُسکے پاس رہکر واپس چلا آیا۔ س م ح

عماری میں بٹھا کر گوالیار کو لے گئے اور یقین ہے کہ اُس کی عمر کا خاتمہ اب اسی جگہ ہوگا۔[1]

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ محمد سلطان اول پانچویں شعبان ۱۰۶۹ھ کو سلیم گڈھ میں قید کیا گیا اور پھر پچیسویں جمادی الاول ۱۰۷۰ھ کو یہ اور سلیمان شکوہ جو سری نگر سے گرفتار ہو کر آیا تھا دونوں گوالیار بھیج دیئے گئے تھے۔ مگر ۱۰۸۶ھ میں ملتفت خاں کو بھیج کر محمد سلطان اور دارا شکوہ کے دوسرے بیٹے سپہر شکوہ کو وہاں سے بلا لیا اور کچھ دنوں پھر سلیم گڈھ میں زیر حراست رکھکر تقریباً چودہ برس کی قید کے بعد شروع ۱۰۸۷ھ میں خلعت وغیرہ دے کر چھوڑ دیا۔ اور مراد بخش کی بیٹی دوست دار بانو بیگم سے نکاح کر دیا اور اپنے ہاتھ سے موتیوں کا سہرا باندھ کر قلعہ کے اندر کی مسجد میں سلام کرانے لے گیا۔ اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کر دیا۔ اور جشن عید اضحیٰ کے موقعہ پر ایک گوسفند کی تو خود قربانی کی اور ایک اونٹ محمد سلطان سے ذبح کرایا اور ۱۰۸۸ھ میں کشتواڑ کے راجہ کی بیٹی بائی بھوپ دیبی نامی سے اس کا نکاح کیا گیا اور سات لاکھ روپیہ کا زیور عطا ہوا۔ اور کتاب مآثر عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۸۵ھ میں درۂ خیبر کے پٹھانوں کی بغاوت کی وجہ سے جب اورنگ زیب کو ایک عرصہ تک بمقام حسن ابدال رہنا پڑا تھا محمد سلطان کو بست ہزاری وہ ہزار سوار کا منصب معہ خلعت کے اور ایک لاکھ روپیہ نقد اور نقارہ و نشان وغیرہ عطا ہو گیا تھا۔ اور وہاں سے لوٹنے کے بعد اگلے برس سات لاکھ روپیہ نقد عنایت ہوا۔ مگر باوجود اس کے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قید سے چھوٹنے کے بعد کس جگہ کی صوبیداری ملی ہو یا اس کے اور بھائیوں کی طرح اُس کو کسی مہم میں سرلشکر بنا کر بھیجا گیا ہو بلکہ ایسا پایا جاتا ہے کہ بادشاہ کی سرد مہری اپنے اس بیٹے کی نسبت چلی ہی جاتی تھی۔ کیونکہ جب یہ شہزادہ اڑتیس برس دو مہینے ہو کر ۱۰۸۷ھ میں مرا ہے اس کی نسبت اسی کتاب زمانہ عالمگیری میں یہ عبارت لکھی ہے کہ

"پادشاہزادہ را مرض شدید عارض شد۔ مدتے بستر گزین بیتابی بودند در مقام خاص شکار خبر ملالت اثر رسید کہ صرصر فنا آن نخل باغ مجد و علا را از باغ دنیا برداشتہ بحدیقۂ عقبیٰ نشاندند۔ باوجود قوت حوصلہ حضرت را از استماع ایں واقعہ ناگزیر پائے قرار از جا رفتہ دل پر غم و دیدہ پُر نم شد و روح اللہ خاں خانساماں و سیادت خاں و عبدالرحیم خاں و شیخ نظام و ملا محمد یعقوب فرمان رفت کہ در روضۂ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی برحمت حق سپارند۔"

جس سے بہرحال یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باوجود اُس کے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بھی اورنگ زیب نے اُس کو جا کر نہیں دیکھا۔ بلکہ سیر و شکار میں مصروف رہا اور اسی کتاب میں عالمگیر کی اولاد ذکور کے ذکر میں مصنف نے اس شہزادہ کی لیاقت اور قابلیت کی نسبت یہ عبارت لکھی ہے۔

سلطان محمد معظم کو اورنگ زیب کی نصیحت

اس طرح پہلے اپنے بڑے بیٹے کا خرخشہ مٹا کر اورنگ زیب نے شہزادہ محمد معظم سے فرمایا کہ

"ایسا نہ ہو کہ کہیں تم بھی بھائی کی تقلید کر بیٹھو اور وہی معاملہ تم کو بھی پیش آئے جو اُس کو پیش آیا ہے۔ یاد رکھو کہ جہاں بانی ایک ایسا نازک معاملہ ہے کہ بادشاہوں کو اپنے سایہ سے بھی حسد اور بدگمانی ہو جاتی ہے پس یہ خیال کبھی نہ کرنا کہ اورنگ زیب بھی بیٹوں کے ہاتھ سے وہی کچھ دیکھ سکتا ہے جو جہانگیر نے شاہجہاں[1] کے ہاتھوں دیکھا تھا۔ جس طرح شاہجہاں نے تخت و تاج کھو دیا اورنگ زیب کبھی اسی طرح کھو سکتا ہے"

لیکن سلطان محمد معظم کے طور و طریق پر نظر کرتے ہوئے میری تو یہ رائے ہے کہ اورنگ زیب کا اُس کی طرف سے کسی بُرے ارادہ کا شبہ کرنا بے وجہ ہے کیونکہ وہ تو ایک ادنیٰ غلام سے بھی زیادہ فرماں برداری کرتا ہے اور مطیع سے مطیع شخص سے کبھی یہ ممکن نہیں کہ غیر قانع اور حریص طبیعت کے جوش و ولولہ پر اپنے اقوال و افعال سے پردہ ڈال رکھے۔ چنانچہ خود اورنگ زیب بھی حصول اختیار و اقتدار کے معاملہ میں کبھی اس قدر بے پروا نہیں نظر آیا۔ اور نہ خیرات اور عبادات ہی میں اتنا مصروف دکھائی دیا۔ مگر بااین ہمہ اکثر ہوشیار لوگوں کی یہ رائے ہے کہ بمقتضائے (اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ) اس کی بناوٹ ہے اور حصولِ سلطنت کے خیالات اُسی طرح دل میں چھپائے ہوئے ہے جس طرح اس کا باپ چھپائے ہوئے تھا[2]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

"اولیں فروغ دودمان محبد احسان پادشاہزادہ محمد سلطان ولادت ایشان از بطن نواب باقی چہارم رمضان ۱۰۴۹ھ وقوع یافت بشرائف آداب و محاسن اوصاف متصف و بحفظ کلام حمید و اکثر کمالات و خواندن و نوشتن عربی و فارسی و ترکی بہرہ دانی داشتند و در محاربائی کہ آنحضرت را پیش از جلوس با اعادی دولت اتفاق افتاد مصدر تر ددات شائستہ شدہ داد شجاعت و دلیری دادند و در سنہ بست و یک جلوس حضرت اعلیٰ خاقانی بسیر ریاض آخرت رفتند" س م ح

[1] جہانگیر سے شاہجہاں کی اکثر ان بن ہی رہتی تھی اور جب وہ مرا ہے تب تو یہ دکن میں علانیہ باغی تھا۔ س م ح

[2] محمد سلطان اور محمد معظم دونوں ایک ہی ماں سے تھے اور محمد معظم قریب چار سال کے اس سے چھوٹا تھا اور اورنگ زیب کے بعد یہی بادشاہ ہوا تھا۔ اور اپنی چند سالہ بادشاہی کے مختصر زمانہ میں ایک نیک سیرت

اورنگ زیب کی تخت نشینی

اب بنگالہ کا حال سنئے وہاں لڑائی بدستور جاری تھی۔ اگرچہ قدر سستی کے ساتھ شجاع حتی المقدور مقابلہ کئے جاتا تھا اور اُس کا ہوشیار دشمن میر جملہ گنگا سے اُترنے اور بے شمار ندی نالوں کے طے کرنے میں جو اُس ملک میں بکثرت ہیں جس جس طرح سے مناسب اور مصلحت وقت جانتا تھا عمل کرتا تھا اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ لکھا ہے کہ یہ بچپن ہی میں قرآن مجید کا حافظ ہو گیا تھا اور فن قرأت اور تجوید سے خوب واقف تھا اور علم حدیث۔ فقہ میں تو ایسا کامل تھا کہ ہم عصر علما بھی مانتے تھے اور مسائل فقیہہ کا استنباط و استخراج خود قرآن و حدیث سے کر سکتا تھا۔ عربی ایسی بولتا تھا کہ فصحائے عرب پسند کرتے تھے اور ترکی اور فارسی تو گویا اُس کے گھر کی دو بانیں تھیں خوش نویسی میں بھی کامل تھا اور کئی طرح کے خط لکھنے جانتا تھا۔ نیک اوقات ایسا تھا کہ راتیں نماز و وظائف اور تلاوت قرآن مجید اور مطالعہ کتب تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف میں بسر کرتا تھا۔ اور صبح کی نماز ہمیشہ اول وقت ادا کر کے کچھ دن چڑھے تک اوراد و وظائف پڑھتا۔ اور اس کے بعد منتظران دیدار کے لئے "جھروکہ درشن" میں بیٹھتا۔ اور مستغیثوں اور فریادیوں کی داد دیتا پھر وہاں سے اُٹھکر دیوانِ خاص یا عام میں بیٹھکر ملکی و مالی معاملات سنتا اور نماز ظہر کے بعد محل سرا میں جاکر کھانا کھاتا۔ اور کسی قدر سوتا۔ اور نماز عصر پڑھکر پھر فریادیوں کی دادرسی کرتا۔ اور لوگوں کا سلام مجرا لیتا اور نماز مغرب کے بعد درود و وظائف میں مصروف رہتا۔ اور قریب ڈیڑھ پہر رات گذرے نماز عشا پڑھکر محل سرا میں چلا جاتا تھا۔ مگر باوجود ان تمام صفات حمیدہ اور کمال اطاعت کے آخرکار اُس کو بھی بدگمان باپ کے قہر و غضب کا نشانہ بننا ہی پڑا۔ یعنی جب اورنگ زیب نے سکندر عادل شاہ نابالغ والی بیجاپور کی بربادی کے لئے محمد معظم کے سوتیلے بھائی محمد اعظم شاہ کو اور ابوالحسن تانا شاہ والی حیدرآباد دکن کی بیخ کنی کے لئے اس کو مامور کیا تو اعظم شاہ اور دوسرے لوگوں کی دراندازی سے اورنگ زیب کو یہ شبہ ہو گیا کہ والی دکن سے اسکی سازش ہے۔ اور باوجودیکہ خود بادشاہ کے بعض معتمدان خاص نے اُسکی بے جرمی کی شہادت دی مگر بدگمانی رفع نہ ہوئی اور ۱۰۹۷ھ میں اس کو بیوی بچوں اور متوسلوں سمیت نہایت ذلت اور سختی سے قید کر دیا اور پانچ برس سے زیادہ تک قید رکھا اور تمام مال و اسباب اور جاگیر وغیرہ ضبط کی گئی یہانتک کہ اُس کی زوجہ نورالنسا بیگم کے کانوں اور گلے کے زیور تک چھین لئے گئے اور اُس کو اور اُس کے بیٹوں کو حجامت بنوانے ناخن کٹوانے ٹھنڈا پانی پینے۔ گرم روٹی کھانے اور مناسب حال لباس پہننے سے مدتوں ممانعت اور محرومی رہی اور لطف یہ ہے کہ مآثر عالمگیری میں جس کا مصنف التزام کے ساتھ بڑے ادب و اعتقاد سے پیش اورنگ زیب کی تعریف لکھتا ہے، لکھا ہے کہ اگرچہ حضرت اورنگ زیب کو اُسکی قید کے زمانہ میں اس امر کا بھی اقرار تھا کہ ہمارے ہاتھ سے ایسا ظلم ہوا ہے۔ مگر فرماتے تھے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ خداوند کریم ہمارے دل کو اُسکے حال پر مہربان کرے (ماخوذ مآثر عالمگیری و سیر المتاخرین) تمام شد

اس عرصہ میں اورنگ زیب آگرہ کے نواح میں مقیم تھا۔ مگر آخرکار جب مراد بخش کو قلعہ گوالیار میں بھیج چکا تو دہلی جاکر اُن سب دھوکے کی ٹٹیوں کو جواب تک لوگوں کو فریب دینے کے لئے بنا رکھی تھیں اُٹھا ڈالا اور تخت سلطنت پر جلوس کرکے بادشاہ بن بیٹھا[1]

دارا شکوہ اجمیر کے میدان جنگ میں اب اورنگ زیب کی تمام توجہ دارا شکوہ کو گجرات سے نکالنے کی تدبیروں پر لگی ہوئی تھی لیکن اُن وجوہ سے جو پہلے بیان کی جاچکی ہیں اس دلی مدعا کا حاصل ہونا آسان نہ تھا مگر آخرکار اس کی عجیب وغریب ہنرمندی اور

---

[1] دارا شکوہ کے تعاقب میں پنجاب کو جاتے ہوئے اگرچہ سرسری طور پر تخت نشینی کی رسم بمقام باغ اعز آباد جو شاہجہاں آباد کے قریب لاہور کے راستہ پر تھا پہلی ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ کو عمل میں آچکی تھی۔ مگر باقاعدہ جلوس اُس وقت کیا گیا تھا جب کہ شجاع کو بمقام کھجوہ شکست دینے کے بعد مراد بخش کو قلعہ گوالیار میں بھیج دیا گیا۔ اور دارا شکوہ کو بمقام اجمیر اُنتسویں جمادی الثانی ۱۰۶۹ھ کو دوبارہ شکست ہوئی اور وہ اُلٹے پاؤں احمد آباد کی طرف نہایت بے سروسامانی کے ساتھ بھاگ گیا۔ اس تخت نشینی کو مصنف نے دارا شکوہ کی شکست کے واقعہ سے پہلے خدا جانے کس طرح لکھدیا ہے اور یہ جلوس چوبیسویں رمضان سنہ مذکور کو قلعہ شاہجہاں آباد میں (جس میں اب تک یہ داخل نہیں ہوا تھا) ہندو اور مسلمان نجومیوں کے مجوزہ مہورت کے موافق جب کہ شمسی حساب سے اس کو اکتالیسواں برس تھا معمولی تکلفات کے ساتھ کیا گیا۔ اور اورنگ زیب نے اپنا لقب حسب ذیل قرار دیا۔

"ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" اور بے ادبی کے خیال سے سکہ میں کلمہ طیبہ اور خلفائے اربعہ کے ناموں کی جگہ سونے اور چاندی کی مناسبت سے باختلاف نقطہ مہر بدر یہ بیت تجویز ہوئی۔

سکہ زد در جہاں بچو مہر منیر شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور اگرچہ کسی کتاب تاریخ میں نہیں دیکھا گیا مگر مشہور ہے کہ جب خطیب دستور کے موافق اس کے بزرگوں کو کسی کو جنت آشیانی اور کسی کو خلد مکانی وغیرہ وغیرہ کہکر گننے لگا اور جہانگیر کے نام پر پہنچا تو اورنگ زیب نے فراست سے معلوم کیا کہ یہ اس امر میں حیران ہے کہ جیتے جاگتے شاہجہاں کا کیا کہکر نام لے۔ فوراً اس کی طرف مخاطب ہوکر قیدی باپ کے لئے یہ حسب حال اور لطیف لقب تجویز کردیا اور کہا کہ خطیب بگو تارک تاج و دیہیم ثانی سلطان ابراہیم شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ غازی صاحبقران ثانی؛ ص م ع

روزافزوں خوش اقبالی سب مشکلوں پر غالب آگئی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جسونت سنگھ نے گھر پہنچتے ہی اُس مال و دولت سے جو کھجوہ سے لوٹ کر لایا تھا ایک مضبوط فوج بھرتی کرنی شروع کر دی اور داراشکوہ کو لکھ بھیجا کہ آپ بلا توقف آگرہ چلے آیئے میں اپنی تمام فوج کے ساتھ راستہ میں آن ملوں گا۔ اب چونکہ شہزادہ نے بھی ایک فوج کثیر جمع کر لی تھی اگرچہ بہت عمدہ نہ تھی پس اس اُمید پر کہ جب میں ایسے نامی راجہ کو ساتھ لیے ہوئے دارالسلطنت کے قریب پہنچ جاؤں گا تو میرے منتشر شدہ ہواخواہوں کو بھی میرے نشان کے نیچے آکر جمع ہو جانے کی جرأت ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے احمد آباد سے کوچ کر دیا اور بہت سُرعت کے ساتھ اجمیر میں آپہنچا جو آگرہ سے سات آٹھ منزل کے فاصلہ پر ہے لیکن جسونت سنگھ اپنے عہد پر قائم نہ رہا۔ وجہ یہ ہوئی کہ راجہ جے سنگھ نے یہ خیال کر کے کہ لڑائی کے تمام رنگ ڈھنگ سے اورنگ زیب ہی کے غلبہ کی اُمید ہوتی ہے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے جسونت سنگھ کو داراشکوہ کی طرفداری چھوڑ دینے کا مشورہ قرین مصلحت جان کر اس کو لکھا کہ

تم نے اس میں ایسا کیا فائدہ سوچا ہے کہ ڈوبتے کے ساتھی بنتے ہو اور اگر تم اسی بات پر قائم رہو گے تو اُس کا کچھ فائدہ ہونا تو معلوم ہو گا مگر ہاں تمھارا خاندان اور تم بے شک برباد ہو جاؤ گے۔ اور اورنگ زیب تم کو کبھی معاف نہ کرے گا۔ اور چونکہ میں بھی راجپوت راجہ ہوں اس لیے بمنت التماس کرتا ہوں کہ بیچارے راجپوتوں کا خون کرانے سے باز آؤ اور اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ اور راجہ بھی تمھارے شریک ہو جائیں گے کیونکہ یہ میں کبھی نہ ہونے دوں گا۔ اور چونکہ یہ ایک ایسا امر ہے جو ہر ایک ہندو کی سلامتی سے تعلق رکھتا ہے اس لیے آپ کو ایسی آگ کے بھڑکانے کی کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے جو تمام ملک میں پھیل جائے اور پھر کبھی بھی اُس کو بجھایا نہ جا سکے اور اگر تم داراشکوہ کو بحال خود چھوڑ دو گے تو اورنگ زیب تمھاری پچھلی خطائیں سب معاف کر دے گا۔ اور اُس شاہی خزانہ کا بھی مطالبہ نہ کرے گا جو تم نے کھجوہ کی لڑائی میں لوٹ لیا تھا۔ بلکہ فوراً گجرات کی صوبیداری پر

ف عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ گجرات میں داراشکوہ کے پاس بائیس ہزار سوار اور ایک اچھا توپ خانہ موجود ہو گیا تھا اور کھجوہ کی لڑائی میں جسونت سنگھ کی بغاوت سے جو افواہیں اڑی تھیں اُن کو سن کر جلدبازی سے جسونت سنگھ کی عرضیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی اجمیر کو چل پڑا تھا۔ ن۔ م۔ ح

سرفراز کئے جاؤ گے اور ایسے صوبے کی حکومت میں جو آپ کے علاقہ سے متصل ہے جو فوائد ہیں وہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور وہاں آپ بغیر کسی طرح کے خوف و خطر کے نہایت آرام سے رہیں گے اور ان وعدوں کا کامل طور سے پورا کرانا میرے ذمہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جسونت سنگھ اس امر پر مائل ہو گیا کہ گھر سے قدم باہر نہ نکالے[1] اور اورنگ زیب معہ اپنی تمام فوج و لشکر کے اجمیر میں دارا شکوہ کی فوج کے سامنے آن موجود ہوا۔

اب ایسا کون شخص ہو گا جو اس تاریخ کو پڑھے گا اور اس بات پر افسوس نہ کرے گا کہ بدنصیب دارا شکوہ کو لوگوں نے کیسی کیسی اُلٹی تدبیریں بتائیں اور آخر کار دغا کی جسونت سنگھ کی بدعہدی کا حال اگرچہ دارا شکوہ پر کھُل گیا مگر اس کے ہولناک نتیجوں کا اب کیا علاج تھا۔ وہ بے شک اپنی فوج کو احمد آباد لے جاتا مگر گرمی کی شدت اور پانی کے قحط کی وجہ سے جو اس موسم میں راجپوتانہ میں ہو جاتا ہے یہ امر سخت دشوار تھا کہ پینتیس روز تک اُن راجاؤں کے ملک میں سفر کرے جو جسونت سنگھ کے رفیق اور دوست ہوں اور اس پر طرہ یہ ہو کہ اورنگ زیب سا مستعد دشمن ایسی بڑی اور تازہ دم فوج کے ساتھ نہایت سرگرمی سے اُس کا پیچھا کرے۔ اس لئے اُس نے سپاہیانہ موت سے مر جانا ہی بہتر سمجھا اور اگرچہ جانتا تھا کہ برابر کی لڑائی نہیں ہے مگر تاہم یہی ٹھان لی کہ یا دشمن کو مار لیا یا آپ مر گئے مگر اب تک اُس کو اپنی مصیبت کی انتہا معلوم نہ تھی کیونکہ جن لوگوں پر خیانت اور دغابازی کا کچھ بھی شک و شبہ نہ تھا سب کچھ وہی کرنے کو موجود اور گھات میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ بدذات شاہنواز خاں جس پر دارا شکوہ کامل بھروسہ کئے ہوئے تھا اُس کی خط و کتابت اورنگ زیب سے برابر جاری تھی اور وہ اس کے سب منصوبوں سے اُس کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ لیکن اپنی بے ایمانی کی سزا اُس نے جلد ہی پالی یعنی اسی لڑائی میں تلوار سے قتل کیا گیا۔ چنانچہ بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ خود دارا شکوہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ مگر اغلب یہ ہے دارا شکوہ کے اُن مخفی طرف داروں نے جو اورنگ زیب کے لشکر میں تھے اس خوف سے اُسے مار ڈالا کہ اگر یہ زندہ رہا تو ہم سب کا

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کی خواہش کے موافق اپنے خط کے ساتھ اسی مضمون کا پادشاہی نشان بھی اپنے ایک خاص آدمی کے ہاتھ جسونت سنگھ کے پاس بھیجا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ وہ جودھپور سے سوار ہو آیا تھا مگر راستہ سے اُلٹا پھر گیا۔ س م ع

بھید کھول دے گا۔ اور اُن سب عرضیوں کا حال اُس سے کہدے گا جو ہم داراشکوہ کی خدمت میں بھیجتے رہے ہیں۔ لیکن اس دغاباز کی موت سے اب کیا فائدہ تھا کیونکہ داراشکوہ کو لازم تو یہ تھا کہ جس روز سے اُس نے احمد آباد کو لیا تھا اُسی روز سے اس کے بارے میں اپنے خیر خواہوں کی دانشمندانہ صلاح سنتا اور وہ جس بے اعتباری اور بے عزتی کے لائق تھا اس سے اُسی طرح پیش آتا۔ الغرض قریب پہر دن چڑھے لڑائی شروع ہوئی اور داراشکوہ کے توپ خانہ سے جو ذرا اونچی اور مناسب جگہ پر قائم تھا اگرچہ خالی آوازیں تو بڑے زور شور کی سنائی دیں مگر کہتے ہیں کہ دغابازی کا جال یہاں تک پھیلا ہوا تھا کہ توپوں کی تھیلیوں میں گولے نہیں تھے وہ صرف بارود سے بھری ہوئی تھیں۔ اس لڑائی کی۔ بشرطیکہ اس کو لڑائی کہا جائے تفصیل لکھنی بے فائدہ ہے۔ صرف اس قدر بیان کردینا کافی ہے کہ پہلے گولے کے چلتے ہی جے سنگھ ایک ایسے مقام پر آکھڑا ہوا جہاں سے داراشکوہ اُس کو دیکھ سکے اور اپنے ایک سردار کو یہ پیغام دے کر داراشکوہ کے پاس بھیجا کہ

"اگر گرفتاری سے بچنا چاہتے ہو تو فوراً میدانِ جنگ سے علیحدہ ہوجاؤ"۔

اس پیغام سے اس بیچارے شہزادہ پر ایسا ناگہانی خوف طاری ہوا اور ایسی حیرت چھائی کہ فوراً اُس کی صلاح مان لی اور ایسا سراسیمہ ہو کر بھاگا کہ اپنی خیمہ گاہ اور باربرداری کے متعلق بھی کوئی حکم نہیں دیا اور فی الواقع اس وقت وہ ایسی ہی آفت میں مبتلا تھا کہ اُس نے اتنی ہی مہلت کو غنیمت جانا کہ اپنے اہل و عیال کو اس تہلکہ سے نکال لے جائے۔ کیونکہ بلاشبہ وہ اُس وقت جے سنگھ کے قابو میں آچکا تھا۔ اور راجہ کے اس اغماض کا سبب یہ تھا کہ وہ ہمیشہ یہ سمجھکر کہ کسی شاہزادہ سے بدسلوکی کرنا کسی نہ کسی دن سخت خطرہ کا باعث ہے شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ بہت ادب اور لحاظ سے پیش آتا تھا۔[1]

---

[1] اس لڑائی کا حال عالمگیر نامہ میں یوں لکھا ہے کہ نواح اجمیر میں جو پہاڑیاں ہیں چونکہ اُن کی سب گھاٹیاں روک کر مورچہ بندی اچھے طور سے کی گئی تھی اور داراشکوہ کا توپ خانہ بھی مناسب جگہ قائم کیا گیا تھا اس لئے اورنگ زیب کے امیروں کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ حملہ کریں یہاں تک کہ تین دن یوں ہی گذر گئے اور صرف توپ بندوق سے دور دور کی لڑائی ہوتی رہی آخر اورنگ زیب مجبور ہو کر ان کو غیرتیں بھی دلائیں اور ڈرایا دھمکایا بھی اور انعام و اکرام کے وعدے بھی کئے مگر پھر بھی یہ حالت بدستور رہی۔ اتفاق سے راجہ راج روپ جموں والے کے کوہستانی سپاہی "کوکلہ" پہاڑی کے

پیچھے ایک ایسی جگہ دیکھ آئے کہ جہاں سے پیادہ سپاہی چڑھ کر مخالف کے مورچے پر حملہ کر سکتے تھے راجہ نے اورنگ زیب کو اس حال کی اطلاع کر کے کچھ اپنے سپاہی اس پہاڑی کو روانہ کئے اور خود بھی اپنی باقی ماندہ فوج لے کر اُن کی مدد اور نگہبانی کے طور پر مخالف کے مورچوں کی طرف چلا گیا۔ چونکہ اتفاقاً اس وقت اورنگ زیب کے توپ خانہ سے توپیں چلنی بند ہو گئیں تھیں۔ اس باعث سے ذرا دلیر ہو کر دارا شکوہ کی فوج میں سے کوئی ایک ہزار سوار راجہ راجروپ پر حملہ کرنے کو اپنے مورچوں سے باہر نکل آئے۔ اس پر اورنگ زیب کے مسلمان امیروں میں سے اول دلیر خاں اور پھر شیخ میر نے اپنی اپنی فوجیں ساتھ لے کر ایسے زور سے حملے کئے کہ اُن کے مورچوں تک جا پہنچے۔ اور اس طرح پر ایک اچھی لڑائی ہو پڑی جس میں شیخ میر جو ہاتھی پر سوار اپنی سپاہ کو لڑاتا تھا بندوق کی گولی سے مارا گیا۔ مگر اُس کا ایک ہم قوم سید جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا اُس نے ہوشیاری سے اُس کی لاش کو اس طرح تھامے رکھا جس سے دشمنوں کو بلکہ خود اُس کی سپاہ کو لڑائی کے خاتمہ تک اُس کے مرنے کا علم نہ ہوا اور دلیر خاں تو جرأت کر کے دارا شکوہ کے مورچوں ہی میں جا گھسا اور اُس کے ایک نامور سردار کو خاص اپنے تیر سے ہلاک کر دیا اور خود بھی زخمی ہوا ان حملوں میں اُس طرف سے شاہنواز خاں اور کئی اور نامی سردار بھی مارے گئے۔ اتنے میں راجہ روپ کے کوہستانی پیدلوں نے کوکلہ پہاڑی پر اپنا نشان جا گاڑا۔ اور راجہ جے سنگھ بھی اپنی فوج لے کر ان سب سرداروں کی مدد کو جا پہنچا۔ دارا شکوہ کی سپاہ راجروپ اور دلیر خاں کی جرأت اور دلیری سے پہلے ہی ہمت ہار چکی تھی اور خود دارا شکوہ کا تو یہ حال تھا کہ اُس نے مایوسی کے مارے اپنی بیگمات کو اول ہی ہاتھیوں پر سوار کرا کر اور ضروری مال و اسباب اور روپیہ اشرفی اونٹوں اور خچروں پر لدوا کر آنا ساگر تالاب کے کنارے میدان جنگ سے کچھ فاصلہ پر ٹھیرا دیا تھا۔ مگر جب رات ہو گئی تو ساری اُمیدیں قطع کر کے اس قدر سراسیمہ ہو کر بھاگا کہ اپنی بیگموں کو ساتھ لینا تو درکنار اُن کو اپنے بھاگنے کی خبر بھی نہ کر سکا۔ اور جن کو اُس کا ایک معتمد خواجہ سرا یہاں سے لیجا کر دوسرے دن بمشکل اس سے مل سکا۔ اور سوائے فیروز خاں میواتی کے اور کسی رفیق نے اُس کا ساتھ نہ دیا یہاں تک کہ چوراچوت اُس کے مال و دولت کے لدے ہوئے اونٹوں اور خچروں کے محافظ تھے اور جن پر اُس کو وفاداری کا بہت بڑا بھروسہ تھا وہی اُن کو ہانک کر اپنے اپنے گھروں کو لے گئے۔ اس طرح لڑائی سے تیسرے دن باوجود اورنگ زیب کے اُمرا کی کم ہمتی کے جس کو عالمگیر نامہ میں مفصل لکھا ہے اس کو اپنے خیمہ میں بیٹھے بٹھائے ۲۹ رجمادی الآخر سنہ ۱۰۶۸ھ کو ایسی فتح حاصل ہو گئی کہ جس سے وہ اب بے کھٹکے بادشاہ ہو گیا۔ اگرچہ اور امیر بھی مثل شائستہ خان و ہوش دار خان وغیرہ

داراشکوہ پناہ کی تلاش میں آفت رسیدہ اور برباد شدہ داراشکوہ جس کی جان بری کا صرف احمد آباد پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے میں منحصر تھی ایسے دور دراز ملک میں سے گذرنے پر مجبور تھا جو قریباً سب کا سب مخالف راجاؤں کے قبضہ میں تھا اور ایسی بے سروسامانی تھی کہ خیمہ تک پاس نہ تھا اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار آدمی ہمراہ تھے گرمی بہت سخت پڑتی تھی اور اس پر یہ ایک اور آفت تھی کہ کولی لوگ رات دن پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اس کے سپاہیوں کو اس قدر لوٹا اور قتل کیا تھا کہ صرف چند قدم پیچھے رہ جانا بھی نہایت خطرناک تھا۔ یہ کولی اس ملک کے کسان ہیں اور بڑے ہی لیٹرے اور ہندوستان بھر میں ایک ہی بدذات ہیں۔ پس اگرچہ ان سب مشکلوں اور آفتوں سے بچ کر داراشکوہ ایک ایسے مقام تک پہنچ گیا جہاں سے احمد آباد صرف ایک منزل تھا اور اُسے اب یہ اُمید تھی کہ کل کو احمد آباد میں جا داخل ہوں گا اور پھر ایک فوج بھرتی کرلوں گا۔ لیکن بدنصیب اور شکست خوردہ لوگوں کی اُمیدیں کبھی سرسبز نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اُس شخص نے جس کو داراشکوہ احمد آباد میں قلعہ دار اور حاکم بنا کر پیچھے چھوڑ آیا تھا یہ بے وفائی اور پاجی پن کیا کہ اورنگ زیب کے دھمکانے یا اُمیدوار کرنے کے باعث اپنے آقا سے پھر گیا اور یہ لکھ بھیجا کہ شہر کے نزدیک نہ آیئے دروازے بند اور لوگ مقابلہ کے لئے مسلح اور تیار ہیں۔

داراشکوہ کی رفاقت میں ایک ہولناک سفر اس وقت میں بھی تین دن سے داراشکوہ کی ہمراہی میں تھا۔ اور یہ ایک نہایت ہی عجیب وغریب اتفاق تھا کہ میں اُسے راستہ میں مل گیا اور کسی طبیب کے ہمراہ نہ ہونے کی وجہ سے اُس نے جبراً مجھے اپنے ساتھ لے لیا۔ احمد آباد کے حاکم کے کاغذ کے پہنچنے سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ داراشکوہ نے مجھ سے فرمایا کہ مبادا تمھیں کولی مار ڈالیں اور اس لئے باصرار مجھ کو اس کارواں سرا میں لے گیا جہاں خود ٹھہرا ہوا تھا اور اب اُس کا یہ حال تھا کہ خیمہ تک اُس کے پاس نہ تھا اور اُس کی بیگم اور اور عورتیں صرف ایک قنات کی آڑ میں تھیں جس کی رسیاں میری سواری کی بہلی کے پہیوں سے جس میں آرام کرتا تھا باندھی ہوئی تھیں۔ جو لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ ہندوستانی اُمرا اپنی مستورات کے پردہ کے معاملہ میں کس قدر مبالغہ کرتے ہیں۔۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اپنی اپنی فوجیں ساتھ لے کر لڑنے کو گئے تھے مگر عالمگیر نامہ میں اس فتح کو صرف راجہ راجروپ شیخ میر بہادر خاں اور راجہ جے سنگھ ہی کی کارگذاری سے منسوب کیا گیا ہے۔ م ح

میرے اس بیان پر اعتبار نہ کریں گے۔ مگر میں نے یہ واقعہ اُس دردناک حالت کے ثبوت میں لکھا ہے جس میں یہ شہزادہ اس وقت مبتلا تھا۔

اسی شب کو پو پھٹنے کے قریب احمد آباد کے حاکم کا جب مذکورہ بالا پیغام آیا تو مستورات کی گریہ وزاری نے ہم سب کو رُلا دیا۔ اس وقت ایک عجیب پریشانی اور مایوسی چھا رہی تھی اور ہر کوئی خوف سے خاموش ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا اور کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ دم بھر میں کیا ہو جائے گا۔ دارا شکوہ زنانہ میں سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ مُردہ کی سی حالت تھی اور کبھی اس سے اور کبھی اُس سے کچھ کہتا — اور ایک ادنیٰ سپاہی کے پاس بھی کھڑا ہو کر پوچھتا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اور جب اُس نے دیکھا کہ ہر ایک کے چہرہ سے خوف کے آثار نمایاں ہیں تو یقین ہو گیا کہ غالباً ان میں سے ایک بھی میرا ساتھ نہ دے گا اور نہایت حیران تھا کہ اب کیا ہو اور مجھے کدھر جانا چاہیئے۔ اور توقف کی حالت میں تو سراسر بربادی ہی بربادی نظر آتی تھی۔

اس تین دن کے عرصہ میں جب کہ میں اس شاہزادہ کے ہمراہ تھا رات دن بلا توقف ہم کو کوچ کرنا پڑا اور گرمی اس شدت کی تھی اور اس قدر گرد و غبار اڑتا تھا کہ دم گھُٹا جاتا تھا اور میری بہلی کے تین عمدہ اور قد آور گجراتی بیلوں میں سے ایک مر چکا تھا اور ایک قریب المرگ تھا اور ایک اس قدر تھک گیا تھا کہ چلنے سے مجبور تھا اور اگرچہ دارا شکوہ بہت چاہتا تھا کہ میں اُس کے ہمراہ رہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ اُس کی ایک بیگم کی ٹانگ میں ایک بہت بُری طرح کا زخم تھا لیکن وہ ایسی لاچاری کی حالت کو پہنچ گیا تھا کہ دھمکانے اور منت سماجت کرنے پر بھی کسی نے اُس کو میری سواری کے لئے کوئی گھوڑا یا بیل یا اونٹ نہ دیا۔ اور جب کوئی سواری میسر نہ آئی تو بناچاری میں پیچھے رہ گیا۔ اور چار پانچ سو سواروں کے ساتھ آئے جاتے دیکھ کر جو گھٹتے گھٹتے اب صرف اسی قدر رہ گئے تھے بے اختیار رو پڑا مگر اب تک بھی دو ہاتھی اُس کے ساتھ تھے اور لوگ کہتے تھے کہ اُن پر روپے اور اشرفیاں لدی ہوئی ہیں اور اس وقت میں سمجھتا تھا کہ وہ ٹھٹھہ کی طرف جائے گا اور حالات موجودہ کے لحاظ سے یہ تجویز شاید بُری بھی نہ تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُدھر بھی مصیبت تھی اور ادھر بھی

اور مجھے ہرگز یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اُس ریگستان سے جو احمدآباد اور ٹھٹھہ کے بیچ میں ہے سلامت گذر جائے گا۔ چنانچہ واقعی ایسا ہی ہوا کہ اُس کے ہمراہیوں میں سے اگرچہ عورتیں بھی بہت سی مرگئیں مگر مردوں پر تو یہ مصیبت گذری کہ بھوک پیاس۔اور بے رحم کولیوں کے ہاتھ سے کوئی زندہ بچا ہو تو بچا ہو۔ کاش اس پرُ آفت سفر میں اگر دارا شکوہ خود بھی مرجاتا تو میں اُس کو بڑا ہی خوش نصیب کہتا۔ لیکن وہ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلتا مرتا آخر کار کچھ کے علاقہ میں جا پہنچا اور کچھ کا راجہ اُس سے بڑی مہمان نوازی سے پیش آیا اور کہا کہ اگر آپ اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے سے کردیں تو میری تمام فوج آپ کی مدد کو حاضر ہے۔ لیکن جس طرح جے سنگھ کا منتر جسونت سنگھ پر اثر کر گیا تھا ویسا ہی اس پر بھی چل گیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُس کے تیور بدلے ہوئے نظر آنے لگے اور دارا شکوہ کو بعض معقول وجوہ سے جب یہ اندیشہ ہوا کہ یہ وحشی میری جان ہی لینے کی فکر میں ہے تو فوراً ٹھٹھہ کی طرف چل دیا۔

جان بچی لاکھوں پائے

اب اگر میں اپنا کل ماجرا جو میرے اور اُن بدذات کولیوں کے باہم گذرا اور جس ڈھنگ سے میں نے اُن کو اپنی نسبت مہربان بنایا اور تھوڑا سا روپیہ جو میرے پاس تھا بچایا بیان کروں تو غالباً اس کتاب کے پڑھنے والے دق ہو جائیں گے پس مختصر یہ ہے کہ میں نے اپنی طبابت کی بڑی تعریفیں کیں اور میرے دو نوکروں نے بھی جو اُسی خوف میں مبتلا تھے جس میں میں تھا اُن کو یہی جتایا کہ ہمارے آقا کی برابر کوئی حکیم دنیا میں نہیں ہے اور دارا شکوہ کے سپاہیوں نے اس کو ایسا ستایا ہے کہ جو کچھ قیمتی مال و اسباب اس کے پاس تھا وہ سب چھین لے گئے ہیں۔ قصہ مختصر ہماری بڑی ہی خوش نصیبی تھی کہ ہمارے اس کہنے سننے سے اُن کے دل کسی قدر پسیج گئے اور ہم کو سات آٹھ روز تک روکے رکھنے کے بعد آخر کار ایک بیل ہماری گاڑی میں جوت کر ہم کو وہاں تک پہنچا دیا جہاں سے احمدآباد کے بُرج نظر آتے تھے اور اس شہر میں میری ایک امیر سے ملاقات ہوگئی جو دہلی کو جاتا تھا اور میں اُس کی پناہ میں یہاں تک چلا آیا۔ اور راستہ میں آدمیوں، ہاتھیوں، گھوڑوں، اونٹوں اور بیلوں کی لاشیں ہم کو جابجا پڑی ہوئی نظر آئیں جو دارا شکوہ کی تباہ شدہ فوج کی مصیبتوں کا قصہ گویا زبانِ

حال سے سُنا رہی تھیں۔

سلیمان شکوہ کی طرف سے اندیشے

جس زمانہ میں داراشکوہ ٹھٹھہ کے پُرمصیبت سفر میں مصروف تھا بنگالہ میں لڑائی بدستور جاری تھی اور سلطان شجاع اپنے دشمنوں کی اُمید سے بہت بڑھ کر ہمت اور کوشش دکھا رہا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کو اُدھر کے معاملات کا چنداں اندیشہ نہ تھا۔ کیونکہ میر جملہ کی دانشمندی اور خوش تدبیری اُس کو بخوبی معلوم تھی اور بنگالہ اور آگرہ کے بُعد مسافت کی وجہ سے بھی یہ معاملہ سردست زیادہ اہم نہ تھا البتہ جس بات کا اُسے نہایت کھٹکا تھا وہ یہ تھی کہ سلیمان شکوہ نزدیک تھا اور یہ چرچا پھیلا ہوا تھا کہ سری نگر سے جہاں سے آگرہ آٹھ روز سے بھی کم کا راستہ ہے وہ اور راجہ فوج سمیت اُترنے والے ہیں اور اورنگ زیب ایسا غافل نہ تھا کہ ایسے دشمن کو حقیر سمجھتا۔ اُس کو اب زیادہ تر اسی بات کی فکر تھی کہ کسی طرح سے سلیمان شکوہ کو اپنے قابو میں لائے۔ پس سب سے بہتر تدبیر اُس نے یہ خیال کی کہ راجہ جے سنگھ ہی کی معرفت اس راجہ سے بھی کچھ بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ جے سنگھ نے اُس کو اس مضمون کے خط پر خط لکھے کہ اگر آپ سلیمان شکوہ کو پکڑ کر بھیج دیں تو بڑے بڑے انعام ملیں گے ورنہ آپ کے حق میں بہت ہی بُرا ہوگا۔ مگر اُس نے ان کا یہی جواب دیا کہ خواہ میرا تمام ملک چھن جائے مگر میں کبھی ایسی بے عزتی اور نامردی کی حرکت کا مرتکب نہ ہوں گا۔ پس جب اورنگ زیب نے دیکھ لیا کہ خواہ دھمکایا جائے یا لالچ دیا جائے یہ کسی طرح بھی اپنے اِس عزم سے پھرنے والا نہیں تو اپنی فوج کو دامنِ کوہ کی طرف روانہ کیا اور بے شمار پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ ہموار اور فراخ کرنے کے لئے لوگوں کو مامور کیا۔ لیکن راجہ مخالفوں کی ان بیہودہ کوششوں کو جو اس کے ملک میں داخل ہونے کے لئے کی جا رہی تھیں عبث اور بچوں کا کھیل سمجھ کر ہنستا تھا اور فی الواقع اُس کا ہنسنا بجا تھا۔ کیونکہ اگر اورنگ زیب جیسے چار بادشاہ بھی جمع ہوکر اُس کوہستان پر چڑھائی کرتے تو ان دشوارگذار پہاڑوں میں رسائی ناممکن تھی۔ آخرکار ایسا ہی ہوا کہ لاحاصل غصہ دکھانے کے بعد فوج واپس بُلالی گئی۔

اس عرصہ میں داراشکوہ ٹھٹھہ کے نزدیک جاپہنچا تھا اور صرف دو ہی تین منزلیں باقی رہ گئی تھیں اور مجھ کو اُن فرانسیسیوں اور کئی اور اہلِ فرنگ کی زبانی جو اس قلعہ

کی فوج میں تھے معلوم ہوا کہ یہاں پہنچ کر داراشکوہ کو یہ خبر ملی کہ میر بابا نے جو مدت سے قلعہ کو گھیرے ہوئے تھا محصوروں کو یہاں تک تنگ کر دیا ہے کہ آدھ سیر گوشت یا چاول ڈھائی روپیہ سے زیادہ میں فروخت ہوتے ہیں اور باقی اجناس کی بھی سخت گرانی ہے۔ لیکن بہادر قلعہ دار اب تک ہمت باندھے مقابلہ پر جما ہوا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں پر اچھے خاصے حملے کر جاتا ہے۔ اور ہر طرح سے دانائی شجاعت نمک حلالی اور ہمت کے ساتھ میر بابا کے سخت حملوں کو رد کرتا ہے اور اورنگ زیب کی دھمکیوں اور وعدوں کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے اس قابلِ تعریف کام کی ان بہت سے اہلِ فرنگ نے بھی جو اس کی فوج میں تھے تصدیق کی۔ اور مجھ سے یہ بھی کہا کہ جب اس کو داراشکوہ کے قریب پہنچ جانے کی خبر ملی تو زیادہ دادِ دہش کرنے لگا اور اس طرح پر سپاہیوں کا دل ایسا ہاتھ میں کر لیا کہ تمام اہلِ قلعہ محاصرین کو ہٹا کر داراشکوہ کے قلعہ میں لے آنے کے واسطے بخوشی اپنی جانیں لڑا دینے کو تیار تھے۔

اس کے علاوہ اس ذی ہوش سردار نے کئی طرح کی عمدہ تدبیروں سے بہت ہوشیار جاسوسوں کو میر بابا کے لشکر میں بھیج کر محاصرین کو یہ یقین دلا دیا کہ داراشکوہ ایک جرار فوج ساتھ لئے ہوئے محاصرہ اٹھا دینے کے ارادہ سے جلد پہنچنے والا ہے اور اس میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ ہم داراشکوہ اور اس کی فوج کو بچشم خود دیکھکر آئے ہیں۔ چنانچہ یہ چال ایسی کارگر ہوئی کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے اور کچھ شک نہیں کہ اگر داراشکوہ اس وقت آپہنچتا تو میر بابا کا لشکر ضرور تتر بتر ہو جاتا۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ اس سے آن ملتے۔ لیکن اس کی قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا کہ کسی مہم میں بھی سرسبز نہ ہو۔ پس یہ سمجھکر کہ ان چند آدمیوں کے ساتھ محاصرہ کا اٹھا دینا ناممکن ہے۔ پہلے تو اس کا یہ ارادہ ہوا کہ دریائے سندھ سے اُتر کر ایران کو چلا جائے۔ اگرچہ اس تجویز کا عمل میں آنا بھی بہت ہی مشکل تھا۔ کیونکہ پٹھانوں اور بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے سرداروں کے ملک میں سے جانا پڑتا جو نہ ایران ہی کے مطیع ہیں اور نہ ہندوستان ہی کے اور بیچ میں ایسا بیابان حائل تھا کہ جس میں پانی میسر آنا بھی مشکل تھا۔ لیکن ان امور سے قطع نظر اس کی بیگم نے ایک ضعیف اور واہیات سی بات کہکر اس کا یہ ارادہ ترک

کرادیا یعنی یہ کہہ دیا کہ اگر آپ ایران کا قصد کریں گے تو خوب سمجھ لیجئے کہ مجھ کو اور میری بیٹی دونوں کو شاہ ایران کی لونڈیاں بننا پڑے گا: اور یہ ایک ایسی بے عزتی ہے کہ ہمارے خاندان میں سے کسی کو بھی گوارا نہ ہوگی ۔ اور اس بات کو بیگم اور داراشکوہ دونوں بھول گئے کہ ہمایوں جب ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہوکر ایران گیا تھا اور اُس کی بیگم بھی ساتھ تھی تو کوئی نازیبا سلوک اُس سے نہ ہوا تھا ۔ بلکہ بہت ہی تعظیم و تکریم اور خاطر و مدارات ہوئی تھی ۔ القصہ داراشکوہ کو اس کشمکش و پیچ اور تذبذب کی حالت میں یہ خیال آیا کہ جیون خاں پٹھان کے پاس جانا بہتر ہے جو کسی قدر ذی شہرت اور با وقعت سردار ہے ۔ اور اُس کا علاقہ چنداں دور بھی نہ تھا ۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ اُس کی بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے شاہجہاں نے دو مرتبہ اس کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا ڈالنے کا حکم دیا تھا ۔ اور دونوں ہی دفعہ صرف داراشکوہ کی سفارش سے جان بچی تھی اور اس کے پاس جانے سے مقصود یہ تھا کہ کچھ فوج کی مدد لے کر میر بابا کو قلعہ ٹھٹھہ سے ہٹائے اور وہ خزانہ جو وہاں کے قلعہ دار کی تحویل میں تھا اُس کو لے کر قندھار چلا جائے اور وہاں سے بہ آسانی کابل پہنچ جائے اور اُس کو یقین تھا کہ میرے وہاں پہنچ جانے پر مہابت خاں صوبہ دار کابل (جو ایک بڑا معتمد امیر تھا اور کابل والے اُس سے بہت مانوس تھے) بلا تامل اور بڑی سرگرمی سے میری رفاقت اختیار کرے گا ۔ اور چونکہ کابل کی صوبہ داری اُس کو اُسی کی وساطت سے ملی تھی ۔ اس لئے یہ توقع کچھ بے وجہ بھی نہ تھی کہ وہ خلوص اور صداقت سے پیش آئے گا ۔ لیکن داراشکوہ کی مستورات اُس کے عزم سے بہت ہی مضطرب اور فکرمند ہوئیں اور انھوں نے بہ ہزار منت و زاری اس کو سمجھایا کہ ملک جیون کے ہاں جانا مصلحت نہیں ہے ۔ بلکہ بیگم اور اُس کی بیٹی اور بیٹے سپہر شکوہ نے پاؤں پر گر کر اور رو رو کر اس ارادہ سے باز آنے کے لئے التجا کی ۔ اور کہا کہ یہ پٹھان ایک مشہور سرکش اور لٹیرا ہے ایسے شخص پر بھروسہ کرنا اپنی موت آپ خریدنا ہے اور یہ بھی سمجھایا کہ ٹھٹھہ کا محاصرہ اٹھانا کچھ ایسا ضروری نہیں ہے ۔ اس مہم کی جوکھوں میں پڑے بغیر بھی آپ کابل کی راہ لے سکتے ہیں ۔ کیونکہ یقین ہے کہ میر بابا ٹھٹھہ کا محاصرہ چھوڑ کر آپ کا راستہ روکنے نہ آئے گا ۔ لیکن داراشکوہ کی اُلٹی سمجھ ہمیشہ ہی سیدھی راہ سے اُس کو بھٹکا دیتی تھی یہ معقول باتیں بالکل اُس کی سمجھ میں نہ آئیں اور بولا کہ کابل کا سفر نہایت خطرناک اور مشکل ہے (جو فی الواقع سچ تھا) اور کہا کہ جس شخص کی جان میں

نے اس طرح سے بچائی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایسی خیانت کرے؟ پس باوجود اُن کی اس قدر التجا اور منت وزاری کے اُس کے ہاں چلا ہی گیا! اور یہ بات بہت جلد ثابت ہوگئی کہ بدذات آدمی اپنی غرض کے لئے کسی بدنامی کی مطلق پروا نہ کرکے اپنے محسنوں اور خیر خواہوں کی جان لینے کے لئے کس طرح بلا دریغ تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ پٹھان جب تک یہ سمجھتا رہا کہ داراشکوہ کے ساتھ ایک بڑا لشکر آتا ہوگا اُس وقت تک تو بظاہر تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ اور شاہزادہ کے ہمراہی سپاہیوں کو لوگوں کے مکانوں میں اُترواد یا۔ اور بہت تاکید کی کہ جو کچھ اِن کو درکار ہو حاضر کریں۔ اور برادرانہ اور دوستانہ سلوک سے پیش آئیں۔ لیکن جب یہ معلوم ہوگیا کہ دو تین سو آدمی سے زیادہ ساتھ نہیں ہیں تو فوراً آنکھیں بدل لیں۔ اور یہ امر تحقیق نہیں ہوا کہ اُس نے یہ حرکت اورنگ زیب کی ترغیب سے کی یا خود ہی اس سخت خیانت کا مرتکب ہوا۔ مگر ظنِ غالب یہ ہے کہ اشرفیوں سے لدی ہوئی چند خچریں جو قزاقوں کی روزمرہ کی لوٹ مار سے اب تک بچی ہوئی تھیں اُن کو دیکھکر اُسے لالچ آگیا۔ بہرحال اُس نے یہ بدذاتی کی کہ رات کے وقت بہت سے ہتھیار بند آدمی جمع کر کے اول سب روپیہ پیسہ مستورات کے زیور اور جواہرات سمیت چھین کر قابو کر لیا۔ اور پھر داراشکوہ اور سپہر شکوہ پر حملہ کیا۔ اور جن لوگوں نے اُن کو بچانا چاہا اُنھیں قتل کر ڈالا۔ اور داراشکوہ کو باندھ کر ہاتھی پر چڑھادیا۔ اور ایک جلاد اس غرض سے پیچھے بٹھا دیا کہ اگر وہ یا اُس کا کوئی طرف دار ذرا بھی ہاتھ پاؤں ہلائے۔ تو فوراً شہزادہ کا سر اُڑا دے۔ اور ایسی بے عزتی کے ساتھ میر بابا[۲] کے لشکر میں جو ٹھٹھہ کو گھیرے ہوئے تھا لاکر اُس کے سپرد کر دیا۔ میر بابا نے حکم دیا کہ اُس کو لاہور کے راستہ دہلی لے جایا جائے۔

بدنصیب داراشکوہ دہلی میں | الغرض جب بدنصیب داراشکوہ دہلی کے قریب پہنچا تو

[۱] داراشکوہ کو جب دادر میں ملک جیون کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تو اس کا بڑا سبب ایک یہ بھی تھا کہ جب داراشکوہ اس نواح میں پہنچا تو ملک جیون کی اکثر عرضیاں اس کے پاس اظہار تابعداری و حقوق جاں بخشی کی یاددہانی کے سلسلہ میں آئی تھیں۔ س م ح

[۲] اس سے پہلے حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ شیخ میر بابا جس کو مصنف جابجا میر بابا لکھتا ہے داراشکوہ کے مقابلہ میں بمقام اجمیر اس سے پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ س م ح

اورنگ زیب نے اپنے اہل دربار سے اس امر میں مشورہ کیا کہ قلعہ گوالیار میں بھیجنے سے پہلے اُسے تشہیر کرانا چاہیئے یا نہیں؟ پس بعض کی تو رائے یہ تھی کہ ایسی حرکت مناسب نہیں۔ کیونکہ اول تو ایسا امر خاندانِ شاہی کی عزت کے برخلاف ہے۔ دوسرے اس میں شورش اور فساد کے ہو جانے کا احتمال ہے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ لوگ اُسے چھڑا لیں۔ لیکن اکثر کی یہ رائے ہوئی کہ نہیں ضرور تشہیر کرانا چاہیئے تاکہ لوگوں کو خوف اور عبرت ہو اور اُن کے دل پر بادشاہ کی شوکت اور دبدبہ کا نقش ثبت ہو جائے۔ اور بعض اُمرا اور اور لوگوں کو جو اُس کے گرفتار ہو جانے کے باب میں اب تک شبہ ہے وہ رفع ہو جائے اور اُس کے مخفی جانب داروں کی امیدیں بھی ٹوٹ جائیں۔ چنانچہ اورنگ زیب نے بھی اسی رائے کو مناسب جانا اور تشہیر کا حکم دیا پس یہ بدنصیب قیدی اور اُس کا بیٹا سپہر شکوہ دونوں ایک ہی ہاتھی پر برابر بٹھائے گئے اور جلاد کی جگہ بہادر خاں کو پیچھے بٹھایا گیا اور تشہیر کیا گیا۔[۱]

---

[۱] عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا شکوہ نے گجرات کو جاتے ہوئے ایسی کڑی منزلیں کی تھیں کہ آٹھ دن کے عرصہ میں احمد آباد کے قریب پہنچ گیا تھا۔ مگر چونکہ اُس کی شکست کی خبر سن لینے کی وجہ سے سردار خاں نامی ایک منصب دار نے اُس کے مقرر کئے ہوئے حاکم سید احمد بخاری کو گرفتار کر لیا اور مقابلہ کے لئے تیار ہو بیٹھا تو اُس کو بناچاری کا نہ جی نامی کولی سے جو بقول صاحب سیر المتاخرین رہزنوں کا سرغنہ اور احمد آباد کے نزدیک ہی کا رہنے والا تھا ملتجی ہونا پڑا۔ اور اُس نے یہ آدمیت کی کہ ساتھ ہو کر کچھ کے راجہ کے ملک میں پہنچا دیا۔ مگر وہاں کے راجہ نے جو پہلے اس قدر اطاعت سے پیش آیا تھا کہ اپنی لڑکی بھی سپہر شکوہ سے منسوب کر دی تھی ایسی رُکھائی دکھائی کہ ملاقات تک کو نہ آیا اور فیروز خان میواتی بھی کھسک کر اورنگ زیب کے پاس چل دیا تو وہ صرف دو روز وہاں ٹھیر کر بھکر کی طرف چلا گیا اور دریائے سندھ سے اُتر کر ایک سرحدی رئیس کے علاقہ میں جس کو عالمگیر نامہ کے نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں علی اختلاف النسخ "ولایت چاند خاں یا چاندیاں" لکھا ہے جا پہنچا جہاں کے لوگوں نے اس کو خوب لوٹا کھسوٹا اور پکڑ لینے کے درپے ہوئے لیکن ابھی اس کے پاس کچھ جمعیت باقی تھی اس لئے لڑتا بھڑتا ایک اور سرحدی سردار کے علاقہ میں جس کو "ولایت ملکیاں" کے نام سے لکھا ہے جہاں سے قندہار دس بارہ منزل تھا جا داخل ہوا۔ اور "میزر لائے ملکی" وہاں کا رئیس استقبال کر کے اپنے ہاں لے گیا۔ اور بہت خاطر داری کی۔ اور ساتھ ہو کر قندھار پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوا۔ مگر دارا شکوہ نے بدقسمتی سے ملک جیون رئیس داور کو جو جیکب آباد سندھ کی چھاونی سے پرے مقام سیبی کے نزدیک درہ بولان کے راستہ پر

مگر یہ وہ سراندیپ یا پیگو کا ہاتھی نہ تھا جس پر دارا شکوہ ایک نہایت عمدہ اور زرق برق عماری میں سواری کیا کرتا تھا اور اس پر زرین جھول اور سونے کا ساز پڑا ہوا ہوتا تھا۔ بلکہ ایک نہایت ہی سڑیل اور میلا کچیلا جانور تھا اور خود اُس کے گلے میں بھی اب نہ وہ بڑے بڑے موتیوں کی مالا ہی تھی جو ہندوستان کے بادشاہ اور شاہزادے پہنا کرتے ہیں اور نہ وہ مکلف اور عمدہ پگڑی اور قبائے زربفت ہی۔ بلکہ باپ بیٹا دونوں میلے اور موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اور ایک کشمیری ادنیٰ کپڑے کا بہت حقیر سا عمامہ جو ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے پہننے میں آتا ہے سر پر تھا۔ غرضکہ اس حال سے تمام شہر اور بازاروں میں پھرایا گیا۔ اور بار بار مجھ کو یہ وہم ہوتا تھا کہ غالباً اب یہاں کچھ کشت و خون ہو جائے گا۔ اور سخت متعجب تھا کہ ایسے شاہزادے کے لئے جس کو عوام الناس نہایت عزیز جانتے ہیں ایسی بے عزتی تجویز کرنے کی جُرأت اہلِ دربار کو کیوں کر ہوئی۔ اور حفاظت کے لئے کچھ مسلح فوج ساتھ نہ دیکھکر اور بھی تعجب ہوتا تھا خصوصاً اس حالت میں کہ اورنگ زیب کی ناشائستہ اور خلاف انسانیت حرکتوں سے سب لوگ کچھ عرصہ سے بالکل ناراض تھے۔ یعنی اول باپ اور بیٹے (محمد سلطان) اور پھر بھائی (مراد بخش) کو قید کر لینے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں نہایت نفرت اور بیزاری پیدا ہو گئی تھی۔

یہ نامعقول تماشہ دیکھنے کے لئے ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور لوگ جا بجا رو رہے تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ واقع ہے) جان بخشی کے احسانوں کا ممنون اور خیر خواہ سمجھ کر لکھ بھیجا تھا کہ میں چند روز تیرے ہاں ٹھہر کر آرام لوں گا اس لئے اُس نے ایوب نامی اپنے ایک معتمد کو اس کے لینے کو سرحد پر بھیج دیا۔ اور ایک کوس تک خود استقبال کر کے اپنے ہاں لے گیا۔ چنانچہ یہ اپنی بیگم کی نعش ساتھ لئے ہوئے جو سل کی بیماری سے مر گئی تھی۔ اُس کے گھر پہنچا اور چونکہ اُس نے وصیت کی تھی کہ مجھ کو میاں بدخشی کے مزار واقع لاہور میں جن کو دارا شکوہ اپنا پیر سمجھتا تھا دفن کرنا۔ ملک جیون کی وفاداری کے بھروسہ پر اپنے بہادر اور وفادار نوجوان سردار گل محمد اور معقول نامی خواجہ سرا اور اُن ستر جان نثار سواروں کو جو تمام فوج سے اب صرف وہی باقی رہ گئے تھے بیگم کی نعش کے ساتھ لاہور کو بھیج دیا۔ اور آپ صرف چند خدمت گاروں اور خواجہ سراؤں کو پاس رکھکر قندھار جانیکے ارادہ سے وہاں ٹھہر گیا۔ مگر ملک جیون نے یہ پاجی پن کیا کہ اُنتیسویں رمضان ۱۰۶۹ھ کو قندھار کی راہ میں گھیر کر گرفتار کر لیا اور باقر خاں فوجدار بھکر اور بہادر خاں اور راجہ جے سنگھ کو جو اُس کے تعاقب میں بھکر کے قریب پہنچ گئے تھے لکھ بھیجا اور بہادر خاں نے ملک سندھ کی گرمی اور باد سموم کے باوجود ایلغار کرتے ہوئے دادر پہنچکر اُسے اپنی تحویل میں لے لیا اور اپنے اور جے سنگھ کے لشکر میں جو اس وقت بھکر کے قریب پہنچ گیا تھا۔ لے آیا۔ بس آہ

اور داراشکوہ کی بدقسمتی پر ترس کھا رہے تھے چنانچہ میں بھی شہر کے سب سے بڑے بازار میں ایک اچھے موقعہ پر معہ اپنے دو رفیقوں اور دو خدمت گاروں کے عمدہ گھوڑے پر چڑھا کھڑا تھا۔ اور ہر طرف سے رونے اور چلانے کی آواز آرہی تھی۔ اور عورتیں اور مرد اور بچے اس طرح چلا چلا کر رو رہے تھے کہ گویا اُن پر کوئی بڑی ہی مصیبت پڑی ہے۔ اور جیون خاں گھوڑے پر سوار بدنصیب داراشکوہ کے برابر جاتا تھا اور چاروں طرف سے اُس پر گالیوں اور لعن طعن کی بوچھاڑیں پڑرہی تھیں بلکہ کئی ایک فقیروں اور غریب آدمیوں نے تو اس پاجی پٹھان پر پتھر بھی پھینکے۔ لیکن پیارے اور عزیز شاہزادے کے چھڑا لینے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

داراشکوہ کا قتل جب یہ نازیبا سواری شہر میں گشت کر چکی تو بیچارہ قیدی اُسی کے ایک باغ میں جس کا نام حیدر آباد[1] ہے قید کیا گیا۔ مگر اُس کی تشہیر کی ناشائستہ حرکت کا جو اثر عام خلائق کے دل پر ہوا اور لوگ جیون خاں پر جس قدر غضبناک ہوئے۔ اور اُس کو پتھر مار مار کر مار ڈالنا چاہا۔ اور شورش اور بلوائے عام ہو جانے کا اندیشہ ہوا وہ اورنگ زیب نے جلد سُن لیا۔ اور اس لئے پھر ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اور اس امر میں مشورہ ہوا کہ پہلی تجویز کے موافق گوالیار بھیج دینا چاہیئے یا فوراً قتل کر ڈالنا بہتر ہے۔ پس بعض کی رائے تو تھی کہ قتل کی کوئی ایسی ضرورت نہیں۔ اور گوالیار بھیج دینے میں بشرطیکہ حفاظت کے لئے کافی جمعیت ساتھ ہو کوئی اندیشہ نہیں۔ چنانچہ دانشمند خاں نے باوجود اُس نااتفاقی کے جو داراشکوہ کے ساتھ چلی آتی تھی بڑے اصرار اور بہت سے دلائل کے ساتھ اُس کے گوالیار بھیج دینے ہی پر زور دیا مگر آخرکار اتفاق رائے اسی پر ہوا کہ اس کو قتل کیا جائے اور سپہر شکوہ کو گوالیار

---

[1] صحیح نام خضر آباد ہے۔ یہ جگہ دہلی اور آگرہ کی درمیانی شاہراہ پر واقع تھی۔ کتاب آثار الصنادید مصنفہ سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی اور آرچیو لاجی آف دہلی مصنفہ مسٹر کار سٹیفن صاحب بہادر سے جو اُس کے بعد لکھی گئی ہے اصلیت اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ خضر خاں سید بادشاہ دہلی نے جو ۱۴۱۴ء سے ۱۴۲۱ء تک بادشاہ رہا تھا اُس جگہ سے جہاں ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ قریب ۲ میل جنوب مشرق کی طرف جمنا کے کنارے اس نام کا ایک شہر آباد کرنا چاہا تھا۔ مگر اب اس کا کوئی نشان بجز ایک ٹوٹے ہوئے مقبرہ کے جو عوام میں "خضر کی گمٹی" کے نام سے مشہور ہے باقی نہیں ہے۔ م م ح

بھیج دیا جائے۔ اس موقعہ پر روشن آرا بیگم نے بھی وہ دلی عداوت جو اُس کو اپنے اس بے بس بھائی سے تھی۔ نہایت شدت سے ظاہر کی۔ چنانچہ دانشمند خاں کی رائے کو برابر رد کرتی اور اورنگ زیب کو اس بے رحمانہ اور خلافِ انسانیت قتل کے لیے اُبھارتی رہی اور خلیل اللہ خاں اور شائستہ خاں جو دونوں داراشکوہ کے قدیمی دشمن تھے یہ بھی اُسی کی رائے کی تائید کرتے تھے اور تقرب خاں جس کا نام حکیم داؤد تھا اور کسی الزام کی وجہ سے ایران سے بھاگ کر یہاں آگیا تھا۔ اور جو ابتدا میں صرف ایک طبیب تھا اور اُمرا کے دسترخوانوں پر خوشامدی ٹکڑے کھایا کرتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں سے امارت کے درجہ کو پہنچا تھا۔ پوری طرح ان کا ہم داستان تھا۔ چنانچہ اس نے اس مجلس میں سب سے بڑھ کر سخت زبانی کی اور بڑے دعوے کے ساتھ یہ الفاظ منہ سے نکالے کہ

"داراشکوہ کو زندہ چھوڑنا ہرگز مناسب نہیں اور سلطنت کی سلامتی اور حفاظت اسی میں ہے کہ فوراً گردن ماردی جائے اور مجھے تو اُس کے قتل کی صلاح دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیونکہ وہ ملانیہ بے دین اور کافر اور مرتد ہے۔ اور اگر ایسے شخص کے قتل سے کچھ گناہ عائد ہو تو میری گردن پر"

چنانچہ انتقام الٰہی ملاحظہ کیجیے کہ جیسا اس کے منہ سے نکلا تھا فی الواقع ویسا ہی ہوا یعنی یہ خون ناحق اسی کے سر پڑا اور جلد بے عزت اور ذلیل ہو کر آخرکار بڑے عذاب سے مارا گیا۔[1]

القصہ اس ناشائستہ اور نہایت بے رحمانہ قتل کے لیے نذیر[2] نامی ایک غلام جو

---

[1] کتاب عمل صالح میں لکھا ہے کہ حکیم داؤد ابن حکیم عنایت اللہ شاہ عباس صفوی بادشاہ ایران کا طبیب خاص اور اس کا مقرب تھا۔ مگر جب شاہ کا انتقال ہو گیا تو کچھ دنوں خانہ نشین رہ کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو چلا گیا اور پھر وہاں سے لاہری بندر واقعہ ملک سندھ کی راہ سے شاہجہاں کے سترہویں سال جلوس مطابق ۱۰۵۳ھ ہجری میں یہاں چلا آیا۔ فن طبابت میں کامل ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہاں تک تقرب حاصل کیا کہ پنج ہزاری کا منصب اور تقرب خاں کا خطاب پایا۔ مگر اس کے بے عزت اور ذلیل ہو کر قتل ہونے کا حال جیسا کہ مصنف نے متن میں لکھا ہے باوصف تلاش ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا۔ س۔م ع

[2] فارسی کتابوں میں نذیر بیگ چیلہ لکھا ہے۔ اور واضح ہو کہ شہنشاہ اکبر نے اپنے عہد میں کئی ہزار

شاہجہاں کا پروردہ اور کسی بدسلوکی کے باعث داراشکوہ سے رنجیدہ تھا مقرر ہوا۔ چنانچہ زہر دینے کے اندیشہ سے وہ اور سپہر شکوہ اپنے ہاتھ سے بیٹھے دال پکا رہے تھے کہ یکایک یہ چار اور بدذاتوں کو ساتھ لئے ہوئے پہنچا جنھیں دیکھکر داراشکوہ نے سپہر شکوہ کو پکار کر کہا کہ لو بیٹیا! "ہمارے قاتل آپہنچے" اور یہ کہکر اُس نے باورچی خانے کی ایک چھوٹی سی چھری اُٹھالی کیونکہ کوئی اور ہتھیار پاس نہ تھا۔ مگر ان جلادوں میں سے ایک نے تو سپہر شکوہ کو قابو کر لیا اور باقی اس کو لپٹ گئے اور زمین پر گراکر تین نے پکڑے رکھا اور نذیر نے سر کاٹ لیا! اور فوراً اورنگ زیب کے پاس لے گیا! اور اُس نے ایک طشت میں رکھوا کر چہرہ کا خون دھلوایا! اور جب دیکھ لیا کہ حقیقت میں اُسی کا سر ہے تو آنکھوں سے آنسو نکال کر بولا "اے بدبخت" اور پھر کہا کہ اچھا اس دردانگیز صورت کو میرے سامنے سے جلد لے جاکر ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کردو۔ اب داراشکوہ کے کنبہ کا حال سنئے کہ اُس کی بیٹی تو اُسی رات کو محل میں بھیج دی گئی جو کچھ دنوں بعد شاہجہاں اور بیگم صاحب کی التجا سے اُن کے سپرد کردی گئی۔ اور اُس کی بیگم نے پہلے ہی یہ سوچ کر کہ ہم پر کیسی آفتیں پڑنے والی ہیں راستہ ہی میں بمقام لاہور اپنی زندگی کا خاتمہ زہر سے کر لیا تھا! رہا سپہر شکوہ سو اُسے گوالیار کے قلعہ میں بھیج دیا گیا[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ غلاموں کو جن کو "بندہ ہائے پادشاہی" کہا جاتا تھا آزاد کرکے چیلہ کا لقب دیدیا تھا اور اُس کا قول تھا کہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ کہنا مناسب وشایاں نہیں ہے۔ اور غالباً لفظ چیلہ اس لئے اختیار کیا گیا ہوگا کہ اس زمانہ میں ان بادشاہوں کو تحریر و تقریر میں اکثر پیر و مرشد کہا جاتا تھا۔ س م ح

[1] داراشکوہ کی بیگم کا دادر کے قریب پہنچ کر سل کی بیماری سے مرنا پہلے لکھا گیا ہے زہر کھا کر مرنا صحیح نہیں ہے اور اب داراشکوہ کی تشہیر اور قتل کا حال جس طرح عالمگیر نامہ اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے اُس کا اس جگہ تحریر کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ عالمگیر نامہ کا بیان اس واقعہ کے جزئیات اور اورنگ زیب کے دلی خیالات کی نسبت کسی قدر رُکا رُکا ہے اس لئے سیر المتاخرین کی عبارت جو واضح تر ہے اور جس کا بڑا ماخذ تاریخ خافی خان اور تاریخ مرآۃ العالم ہے جو اورنگ زیب کے ایک بڑے معتمد خواجہ سرا بختاور خاں کی تصنیف ہے یہاں بعینہ نقل کی جانی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وھو ہذا۔" ہمدریں ایام بہادر خاں کہ داراشکوہ را با سپہر شکوہ از بختیار خاں رملک جیون، گرفتہ مقید بسلاسل بآئین ناسزا حسب الامر آقا می آمد بتاریخ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: دارالخلافہ رسید نذیر بیگ چیلہ از فرطِ خوشی معین شد کہ پیش رفتہ داراشکوہ را بصورتیکہ عالمگیری خواست دیدہ بیاید۔ شانزدہم ذی الحجہ چیلۂ مذکور برگشتہ دولت زمین بوس دریافت و حقیقت حال آں بیچارہ باز نمودہ باز مرخص شد و سہ شنبہ ہفت دہم ذی الحجہ حکم فرمود کہ داراشکوہ را مسلسل با پسرش در حوضۂ سرکشادہ بر مادہ فیل نشانیدہ بیارند و نذیر بیگ چیلہ در عقب فیل نشستہ باشد و بہادر خان با فوج ہمراہ گشتہ داخل شہر سازند و از میان شہر و بازار بہ دہلی کہنہ بہ خضرآباد رسانند و در جائے محفوظے در عمارات خواص پورہ آں کہ برائے بودنش قرار یافتہ نگاہدارند و بموجبِ حکم بہ عمل آمد۔ روز دوم کہ بختیار خان داخل شہر شد بعضے از نوکران شاہجہاں آں تبہ کار را دیدہ از خود در رفتند و بازاریان شہر نیز از عمل او نفرت نمودہ بشوریدند و بے اختیار بر سر او و افاغنۂ ہمراہش ریختہ بضربِ چوب و سنگ گرفتند تا آنکہ چند کس ازاں سیاہ رویان از پائے در آمدند و برخے مجروح و خستہ و سر و گردن شکستہ گشتند و نزدیک بود کہ فتنۂ عظیمی بلند شود۔ کوتوال شہر با جمعیتِ خود رسیدہ آشوب را فرو نشاندہ بختیار را با ہمراہیانش بہ قلعہ رسانید پادشاہ حق پرست! معدلت کیش! از علمائے مذہب خویش فتویٰ طلبید۔ علمائے سُو حکم نمودند کہ خون چنیں ملحد کہ (در رسائل نوشتہ خود کفر و اسلام را برادر توام خواندہ و گفتہ است "کفر و اسلام در رہش پویاں ✧ وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں")، وکسانیکہ خوبی او برخلاف رضائے خلیفہ خواہند درست است! بادشاہ دین پرور! حق شناس! استحکام اساس سلطنت خود در قتل آں بیچارہ سراسر یاس دیدہ حکم بقتل او۔ و دستِ دارانش کہ بر سر بختیار خاں ریختہ بودند داد و داراشکوہ آخر روز چہار شنبہ بست و یکم ذی الحجہ مطابق ہژدہم شہریور (آسوج) مقتول گشت و لاش او را بعد تشہیر در مقبرہ ہمایوں دفن کردند و سپہر شکوہ را بردہ در قلعہ گوالیار محبوس داشتند و بعضے از احدیان پادشاہی کہ بادیِ فتنہ و شورش بر بختیار خاں شدہ بودند در پیش گاہِ عدالت رسیدہ حسب الامر علمائے دیندار! از قید دنیائے ناپائیدار رہائی یافتند۔ اور عالمگیر نامہ میں یہ عبارت زیادہ لکھی ہے "آخر روز چہار شنبہ بست و یکم ماہِ مذکور مطابق ہژدہم شہر یور کہ ہماں روز قضیۂ او باشان شہر رو دادہ بود فرمانِ قہرمانِ جلال صادر شد کہ آن خیم العاقبت (داراشکوہ) را در خضرآباد از قید ہستی برآرند و باہتمام سیف خاں و نذیر جنگ چیلہ و چندے دیگر از چیلہ ہائے معتمد اوایلِ شب پنجشنبہ ۱۰۶۹ھ ہجری چراغ زندگی او خاموش شدہ بہ نہاں خانۂ عدم شتافت و باشارۂ معلیٰ پیکر فتنہ سرشتِ پرشور و شرش را بمقبرۂ حضرت جنت آشیانی ہمایوں پادشاہ نقل کردہ در تہ خانہ کہ زیر گنبد مرقد آنحضرت است و شاہزادہ دانیال و شاہزادہ مراد پسران حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر آنجا مدفون اند دفن نمودند۔ و روزِ دیگر فرمان جہان مطاع بنفاذ پیوست کہ سیف خاں سپہر شکوہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ را بقلعہ گوالیار رسانیدہ بجا رسانِ آن حصنِ عالی اساس سپارد و بمستقر الخلافہ اکبرآباد معاودت نمودہ بہ صوبہ دلری آنجا از تغیر مخلص خاں کہ بہ بنگالہ تعین یافتہ بود قیام نماید بست دوم راجہ جے سنگھ کہ از بہادر خاں در عقب ماندہ بود (جو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بدنامی کے موقعہ سے دانستہ بچ جاتا تھا) جبہ ساحتہ قبہ سپہر آ ، یا گشت ، ملک جیون کہ قبل ازیں منصب ہزاری دو صد سوار و خطاب بختار خانی کامیاب عنایت شدہ بود باضافہ صد سوار و مرحمت خلعت و خنجر مرصع و اسپ عربی با زین و ساز مطلا و یک زنجیر فیل با ساز مینا کار مشمولِ مراحم گوناگوں گردید و چوں حکم جلیل القدر از پیش گاہ معدلت بہ تحقیق منشائے قضیہ شور انگیزی او باشاں شہر کہ نسبت با فغاناں اور وتے نمود صادر شدہ بود بعد از تحقیق و تفحص بہ ثبوت پیوست کہ ہیبت نام فتنہ جوئے از خیل احدیانِ پادشاہی بادے ایں جرأت و محرک سلسلہ فساد بودہ است لہذا شحنہ شہر او را گرفتہ بہ پیش گاہ عدالت حاضر ساختہ واز یں جہت کہ منشائے ایں قسم جسارتے شدہ باعث ہلاک جمعی از مسلمانان گشتہ بود مورد انظار قہر و عتاب بادشاہانہ گردیدہ حکم شد کہ او را بیاسا رسانند۔"

صاحب عالمگیر نامہ نے دارا شکوہ کی تشہیر کی وجہ تو اگرچہ صاف صاف لکھدی ہے کہ "تا ہمگی خلائق آں رمیدہ بخت را بے شائبہ شک و ریب برای العین مشاہدہ نمایند و من بعد ثراثہ خایان بیہودہ گو و واقعہ طلبان فتنہ جو را جائے سخنان لاطائل و مجال تصورات باطل نماند و در حدود و اطراف مملکت او باشاں را بہانہ فساد و دستاویز شورش بہم نرسد و بموجب حکم جلالت اثر آں سیہ روز برگشتہ اختر را با لپسرش بر یک حوضہ فیل نشانیدہ آشکارا براہ بازار داخل شہر کردند و از پائے قلعہ مبارکہ گذرانیدہ بنوعیکہ ہمہ کس دیدند واحدے را در وجود بے موداو شک و شبہ نماند بشہر کہنہ بردند۔"

مگر اس کتاب میں ہاتھی پر ڈال کر اس کی نعش کی تشہیر کا ذکر جس کو صاحب سیر المتاخرین نے بہت وضاحت سے اور بہ تکرار لکھا ہے تحریر نہیں کیا۔ اور تاریخ عمل صالح میں لکھا ہے کہ

"دارا شکوہ کو نیلا لباس پہنا کر دہلی میں داخل کیا گیا تھا۔ اور اُسی لباس سے دفن کیا گیا۔"

چونکہ اس شاہزادہ کی پیدائش ۱۰۲۴ھ کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پینتالیس برس کی عمر میں قتل کیا گیا۔

س۔م۔ح

جیون خاں کا قتل

ان دردناک واقعات کے بعد جیون خاں فوراً حضور میں بلایا گیا اور اسے انعامات دے کر دہلی سے رخصت کیا گیا۔ لیکن یہ شخص بھی اپنی بدکرداری کا نتیجہ پائے بغیر نہ رہا۔ یعنی جب کہ وہ دہلی سے واپس ہو کر ایسی جگہ پہنچ گیا تھا کہ جہاں سے اُس کا علاقہ دس بارہ ہی کوس کے فاصلہ پر تھا تو چند آدمیوں نے جو پہلے سے ایک جنگل کے اندر گھات میں لگے ہوئے تھے اُسے مار ڈالا۔

افسوس! اس جنگلی شخص نے یہ نہ سوچا کہ اگرچہ ظالم لوگ اپنی مطلب براری کے لئے بڑے سے بڑے گناہوں کی نسبت کبھی بظاہر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ لیکن دل میں اُس کے عمل میں لانے والوں سے سخت نفرت رکھتے ہیں اور جب مطلب نکل آتا ہے تو اُن کے اعمال کی سزا دینے میں کچھ بھی تامل نہیں کیا کرتے۔

داراشکوہ کے قتل سے کچھ عرصہ پہلے اُس سے اس بہادر اور وفادار خواجہ سرا کے نام جو اس کی طرف سے ٹھٹھہ میں لڑ رہا تھا جبراً اس مضمون کا ایک حکم نامہ حاصل کر لیا گیا تھا کہ فوراً قلعہ حوالہ کر دے۔ لیکن اُس نے کچھ جلدی نہ کی بلکہ اس بات پر اڑا رہا کہ قلعہ کے خالی کرنے سے پہلے حفظ عزت وغیرہ کی چند معقول شرطیں دی جائیں۔ جن کو میر بابا نے دغابازی اور بے ایمانی سے بلا قصد ایفا بہت خوشی سے قبول کر لیا اور شہر میں داخل ہو گیا مگر جب اپنے تھوڑے سے بہادر رفیقوں کے ساتھ یہ نمک حلال شخص لاہور میں آیا تو خلیل اللہ خاں نے جو اس وقت یہاں کا صوبہ دار تھا نہایت بُری طرح سے سب کو تہِ تیغ کر ڈالا۔ اس ظالمانہ فعل کا سبب یہ تھا کہ اگرچہ بظاہر یہی کہتا تھا کہ ہم یہاں سے دہلی کو جائیں گے (کیونکہ اورنگ زیب اس کی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے اُسے دیکھنا چاہتا تھا)، لیکن اصلی ارادہ یہ تھا کہ ہمراہیوں سمیت سری نگر پہنچ کر سلیمان شکوہ سے جا ملے۔ اس کے رفیقوں میں بہت سے اہل فرنگ بھی تھے جن کو معہ اپنے اور رفقا کے اُس نے بہت سے انعام واکرام دیئے تھے۔

سلیمان شکوہ کی گرفتاری

داراشکوہ کے خاندان میں اب صرف سلیمان شکوہ باقی رہ گیا تھا اور اگر راجہ کو اپنے وفائے عہد اور ایمان داری کا خیال ہوتا تو اُس کا سری نگر سے نکالنا آسان نہ تھا۔ لیکن جے سنگھ کے منصوبوں اور اورنگ زیب

کے وعدوں اور دھمکیوں اور دارا شکوہ کے قتل۔ اور قرب وجوار کے راجاؤں کی جنگی تیاریوں نے اس چھوٹے دل کے راجہ کو آخر کار ڈرا دیا چنانچہ جب سلیمان شکوہ یہ دیکھکر کہ یہاں اب کچھ بھروسہ نہیں ہے باوجود اس کے کہ راستہ ایک ایسے بے ڈھب اور بے موقعہ ملک میں تھا جہاں سوائے ویران پہاڑوں کے کچھ نہ تھا تو تبت کی طرف چلے جانے کے قصد سے نکل بھاگا لیکن راجہ کے بیٹے نے پیچھا کر کے آن لیا اور زخمی کر کے گرفتار کر لیا۔ بعد میں اسے دہلی پہنچا دیا گیا۔ اور قلعہ سلیم گڈھ میں جہاں پہلے سے مراد بخش قید تھا قید کیا گیا[۱]۔ اور اورنگ زیب نے تصدیق کی غرض سے جس طرح دربار میں دارا شکوہ کا سر منگوایا تھا اُسی طرح اور اُسی غرض سے سلیمان شکوہ کے لئے حکم دیا کہ دربار کے وقت تمام امرا کی موجودگی میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ میں بھی اس نازیبا تماشے کے دیکھنے کو گیا تھا اور جس شوق اور تعجب سے میں نے اُسے دیکھا اُس کا بیان کرنا دشوار ہے۔ یعنی دربار میں لانے سے پہلے بیڑی تو نکال دی گئی تھی لیکن ہتھکڑی جس پر سنہری ملمع کیا ہوا تھا بدستور موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس سرو قد اور نہایت حسین وجمیل جوان کو دیکھکر اکثر اہل دربار کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور وہ بیگمیں بھی جن کو دیوار کی جالیوں میں سے دیکھ لینے کی اجازت دی گئی

---

[۱] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ اگرچہ سلیمان شکوہ کا قابو میں آجانا بحسب ظاہر ایک امر بدیع" تھا۔ لیکن بادشاہ کی خوش اقبالی سے یہ مشکل یوں حل ہوگئی کہ سری نگر کا راجہ اپنے ملک کی تباہی کے اندیشہ سے کیونکہ ترتیب خاں۔ رعد انداز خاں وغیرہ کئی امیر اُس کی تسخیر کے لیے مامور تھے راجہ جے سنگہ کی معرفت سلیمان شکوہ کے سپرد کر دینے کا وعدہ کر کے معافی کا خواستگار ہوا۔ اور بادشاہ نے سلیمان شکوہ کے لانے کے لئے جے سنگہ کے بیٹے کنور رام سنگہ کو سری نگر روانہ کر دیا۔ چنانچہ اُس نے رام سنگہ کے پہنچنے کی خبر سنکر سلیمان شکوہ کو گرفتار کر لینے کے لئے جہاں وہ رہتا تھا اپنے آدمی بھیج دے۔ شاہزادہ مقابلے پیش آیا اور اُس کا کوکہ محمد شاہ (جس کا نام بعض نسخوں میں محمد شاہ اور بعض میں محمد شاکر لکھا ہے) اور کئی اور رفیق خوب بہادری سے لڑ کر مارے گئے۔ اور وہ خود گرفتار ہو گیا۔ اور پانچویں جمادی الاولیٰ ۱۰۷۱ھ کو راجہ پرتھی سنگہ نے اپنے بیٹے میدنی سنگہ کے ساتھ رام سنگہ اور تربیت خاں اور رعد انداز خاں کے پاس پہاڑ سے نیچے بھیج دیا اس خبر کے آنے پر دربار میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور راجہ جے سنگہ کا بہت اعزاز واکرام ہوا۔ اور جب مذکورہ بالا امرا اُس کو دہلی میں لے کر آئے تو شاہزادہ محمد سلطان کے پاس قلعہ سلیم گڈھ میں قید کیا گیا۔

تھی بہت ہی غمگین ہوتیں۔ بلکہ اورنگ زیب نے بھی بھتیجے کی بدبختی پر افسوس کیا۔
اور ظاہرا شفقت سے بولا کہ

"خدا پر نظر رکھو اور مطمئن رہو کہ تم کو کچھ ضرر نہ پہنچے گا اور مہربانی کی جائے گی۔
اور تمھارا باپ تو صرف اس وجہ سے قتل ہوا ہے کہ وہ کافر اور لامذہب ہو گیا تھا"

اس پر شاہزادہ نے تسلیمات کی یعنی ہندوستان کی رسم کے موافق ادائے شکر کی علامت کے طور پر تابمقدور جھک کر اپنے دونوں ہاتھ سر تک لایا۔ اور اس کے بعد بڑے استقلال سے یہ عرض کیا کہ

"اگر حضور کا یہ منشا ہو کہ مجھے پوست پلائے جایا کریں تو بہتر ہے کہ ابھی قتل کرا دیا جاؤں!"

جس کے جواب میں اورنگ زیب نے بطور مستحکم وعدہ کے پکار کر کہا کہ:-

"نہیں تم کو پوست ہرگز نہیں پلائے جائیں گے بالکل اطمینان رکھو"

جس پر اہل دربار کے کہنے سے اس نے دوبارہ تسلیمات کی۔ اور اس کے بعد جب بادشاہ کی خواہش کے موافق اس ہاتھی کے معاملہ میں چند باتیں پوچھ لی گئیں جس پر اشرفیاں لدی ہوئی تھیں اور سری نگر جانے کے وقت اس سے چھن گیا تھا تو اس کو دیوان عام سے لے گئے اور اگلے روز گوالیار کو روانہ کر دیا۔

پوست پلانے کا راز

"پوست" سے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا یہ مراد ہے کہ خشخاش کے چھلکے کو پانی میں بھگو کر اور مل کر نچوڑ لیا جاتا ہے۔ اور ایک بڑا سا پیالہ بھر کر ہر روز نہار منہ ان شہزادوں کو پلایا جاتا ہے۔ جو اس وجہ سے گوالیار کے قلعہ میں قید کئے جاتے ہیں کہ ان کا علانیہ سر کٹوا دینا بادشاہ خلاف مصلحت جانتا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ تاوقتیکہ اسے نہ پی لیں ان کو کھانا نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ یہ پوستوں کا عرق ان بیچارے قسمت کے مارے مظلوموں کو رفتہ رفتہ بالکل نچوڑ ڈالتا اور عقل و توانائی دونوں پر پانی پھیر دیتا ہے اور آخرکار گئے گذرے اور حواس باختہ ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس پوست کے پیالہ ہی سے سپہر شکوہ اور مراد بخش کے پوتے اور سلیمان شکوہ کو موت کا کڑوا گھونٹ پلایا گیا تھا[1]

[1] کتاب عمل صالح میں بھی سلیمان شکوہ کی وفات کی نسبت اسی مضمون مندرجۂ متن کی تائید پائی جاتی

مراد بخش کا قتل

مراد بخش اگرچہ قید تھا لیکن لوگوں کو اُس سے اب بھی بہت محبت تھی۔ اور اُس کی شجاعت اور سپہ سالاری کی تعریف میں شعرا اکثر اشعار اور قصیدے کہا کرتے تھے اس لئے اورنگ زیب کی مصلحت ملکی کا یہ اقتضا ہوا کہ اس کی بھی علی الاعلان گردن ماری جائے۔ تاکہ اُس کے کسی طرف دار کے دل میں یہ اُمید باقی نہ رہے کہ ابھی وہ زندہ ہے۔ اور چونکہ پوست پلا پلا کر مخفی طور پر جان لے لینے سے یہ مدعا حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ تدبیر نکالی گئی کہ کوئی الزام قائم کر کے اُس کی سزا کے طور پر علانیہ قتل کرا دیا جائے۔ اور یہ امر کچھ مشکل ہی نہ تھا کہ اس بدنصیب شاہزادہ کی نسبت کوئی الزام پیدا کر لیا یا گھڑ لیا جائے۔ چنانچہ ایک سیّد کے لڑکے (جن کے باپ کو اُس کے مال و دولت کے لالچ میں مراد نے احمد آباد میں اس وقت مروا ڈالا تھا جب کہ اس لڑائی کے لئے تیاریاں کر رہا تھا) دربار میں استغاثہ کو آن موجود ہوئے جو پکار پکار کر اور دُہائی دے دے کر انصاف مانگتے اور یہ عرض کرتے تھے کہ قصاص کے طور پر اُس کا سر کاٹا جائے۔ اور کسی امیر میں یہ جرأت کہاں تھی کہ ان فریادیوں کو ہٹا سکے۔ کیونکہ ایک تو وہ بے گناہ مقتول سید اولاد رسول تھا جن کی لوگ بہت تعظیم کرتے ہیں۔ دوسرے ہر کسی کو معلوم تھا کہ انصاف کے پردہ میں رقیب کی ہلاکت کے لئے یہ ایک بادشاہی منصوبہ ہے۔ پس مقتول سیّد کے بیٹوں کا دعویٰ مسموع اور قبول ہوا اور بغیر کسی قسم کی کارروائی اور ضابطۂ عدالت کے فوراً حکم دیا گیا کہ قصاص میں قاتل کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ہے جس کی پیچ دار عبارت بعینہٖ یوں ہے کہ "در شہر شوال ۱۰۷۲ھ در سِن سی سالگی سلطان سلیمان شکوہ نیز بسعی محافظان از مطمورۂ زندان بفراخ نائے عالم بقا انتقال نمودہ و باجل طبعی درگذشتہ متصل شاہزادہ مراد بخش مدفون شد" اور مآثر عالمگیری میں بذیل واقعات ۱۰۸۲ھ مطابق سنہ پندرہ جلوس عالمگیری سلطان مراد بخش کے بیٹے ایزد بخش کی نسبت لکھا ہے کہ گوالیار سے بلوا کر اورنگ زیب نے اپنی بیٹی مہرالنسا بیگم کے ساتھ اُس کا عقد کیا اور محمد سلطان اور سپہر شکوہ کو کہ وہ بھی وہاں سے بُلائے گئے تھے سلیم گڈھ میں رکھنے کا حکم ہوا اور اگلے برس محمد سلطان کا مراد بخش کی بیٹی دوست دار بانو بیگم اور سپہر شکوہ کا خود اورنگ زیب کی بیٹی بدرالنسا بیگم سے نکاح کیا گیا اور محمد سلطان کا بارہ ہزار اور سپہر شکوہ کا چھ ہزار اور ایزد بخش کا چار ہزار روپیہ سالانہ گذارہ مقرر ہوا پس جب کہ مراد بخش کے بیٹے ہی کی جان بخشی ہو کر خود اورنگ زیب کی بیٹی سے اُس کا عقد ہو چکا تھا تو پوتے کی نسبت کسی زیادہ بدسلوکی کا گمان جیسا کہ ڈاکٹر برنیر نے کیا ہے درست نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی کتاب میں میری نظر سے گذرا ہے کہ یہ لڑکا اپنی طبعی موت سے مرا تھا۔ س م ح

سر کاٹا جائے اور مستغیث یہ حکم لے کر گوالیار چلتے ہوئے[1]

سلطان شجاع کا فرار

اب یہ درد بھری کہانی خاتمہ کے قریب آپہنچی ہے۔ کیونکہ خاندان شاہی میں سے اب صرف سلطان شجاع ہی ایک ایسا شخص باقی رہ گیا تھا جو اورنگ زیب کو دہشت اور فکر میں ڈالے رکھتا تھا۔ اور اب تک بڑی ہمت اور جواں مردی دکھاتا رہا تھا۔ مگر اب اُس نے بھی دیکھ لیا کہ اورنگ زیب کی طاقت اور اقبال کا مقابلہ ناممکن ہے۔ کیونکہ میر جملہ کے پاس برابر کمک پہنچتی رہتی تھی اور اُس کی فوجوں نے شجاع کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ پس جان بچانے کی خاطر ڈھاکہ کو بھاگ گیا جو سمندر کے کنارے بنگالہ کا سب سے اخیر شہر ہے۔ اب یہاں اُس کے پاس نہ تو کوئی جہاز ہی تھا کہ سمندر پار چلا جائے اور نہ یہ جانتا تھا کہ پناہ کی خاطر کس طرف جائے۔ اس لیے اُس نے اپنے بڑے بیٹے سلطان باقی[2] ملک اراکان[3] کے راجے

---

[1] کتاب عمل صالح میں لکھا ہے کہ "پسران علی نقی را کہ مدعیِ خون پدر بودند ہمراہ خواجہ بہلول بہ گوالیار فرستادہ امر فرمودند کہ بعد از ثبوت شرعی مراد بخش را بقصاص رسانند۔ چوں مدعیاں در آنجا رسیدہ بحضور قاضی گوالیار گفتگو آغاز نہادند شاہزادہ مجیب گشتہ بر زبان آورد کہ اگر حضرت خلافت مرتبت پاس عہود و وفائے موعود در نظر داشتہ از خون ایں مراد می گذشتند نقصانے بدولت و سلطنت والا نداشت۔ اگر خواہ نخواہ توجہ اشرف مصروف بریں ست کہ وجود بے بود ایں ضعیف درمیاں نباشد سواجہ باین قسم مردم کم مایہ چہ لطف دارد ہر چہ می خواہند بہ کنند آنگاہ باشارہ قاضی آخر روز چہار شنبہ بست و یکم ربیع الثانی ۱۰۷۱ھ دو نفر چیلہ بہ دو زخم شمشیر آن شاہزادہ رفیع الشان را از تنگنائے ساخت زنداں نجات دادہ جسدش را بقلعہ گوالیار بخاک سپردند" واضح ہو کہ سید علی نقی دیوان گجرات کے قتل کا حال ہم ایک حاشیہ میں مفصل لکھ آتے ہیں۔

[2] سیر المتاخرین میں اس کے بیٹوں کے نام زین الدین و بلند اختر و زین العابدین لکھے ہیں۔ غالباً یہ نام اُس کے بڑے بیٹے زین الدین کا اسم ثانی یعنی عرف ہوگا۔ کیونکہ فارسی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ شاہزادہ زین الدین ہی نے اراکان کے راجہ سے پناہ لینے کا بندوبست کیا تھا۔ اور اصل کتاب انگریزی میں اس نام کو جس تہجی سے لکھا ہے اُس کو یا تو باقی پڑھ سکتے ہیں یا بانکے اور کچھ تعجب نہیں ہے کہ وہ سلطان باقی کے دعائیہ نام یا مرزا بانکے کے لاڈلے لقب سے مشہور ہو۔ س م ح

[3] چونکہ فارسی مورخوں نے اس ملک کا نام رخنگ لکھا ہے اور انگریز اراکان کہتے ہیں اس وجہ سے یہ بات تحقیق طلب تھی کہ لفظ اراکان کو بگاڑ کر انھوں نے رخنگ بنا لیا تھا یا انگریزوں نے رخنگ کو اراکان بنا دیا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : اس لئے صاحب کمشنر بہادر اراکان سے اس کے صحیح کر دینے کی استدعا کی گئی تھی۔ ہم نہایت ممنون ہیں مسٹر جی ڈی برجس صاحب کمشنر اراکان کے کہ انھوں نے محض براہِ اخلاق و علم دوستی نہایت ہی عمدہ اور محققانہ جواب بھیجا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"اس ملک کا نام اراکانیوں کے تلفظ کے موافق دراصل راکھنگ ہے اور برہما والے اس کو حرف رے کی جگہ یے کے ساتھ یاکینگ کہتے ہیں۔ اور لفظ اراکان انگریزوں کا اختراع ہے۔ اور سر آرتھر فیرے نے اپنے مسودہ تاریخ اراکان مطبوعہ ۱۸۴۴ء میں اور اپنی تاریخ برہما مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے پانچویں باب میں لفظ راکھنگ کی نسبت یہ لکھا ہے کہ یہ لفظ راکھنگ (یعنی راکچھس کا بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے جو پالی زبان کے لفظ یاکھا سے نکلا ہے جس کے معنی ایسے آدم خور دیو کے ہیں جو نصف حیوان اور نصف انسان ہو اور جس زمانہ میں بدھ مذہب کے واعظ ہندوستان سے اُس ملک میں پہنچے تو انھوں نے اس ملک کا نام یاکھ پورہ (یعنی راکچھس پورہ) رکھدیا۔ یا تو اسی وجہ سے کہ اُنھوں نے وہاں پہنچ کر یہ روایتیں سُنی ہوں گی کہ قدیم زمانہ میں ایسے دیو سیرت لوگ وہاں رہتے تھے جو ملک کو تباہ اور برباد کرتے تھے یا اس وجہ سے کہ انھوں نے میام ما قوم کے لوگوں کو بھوتوں اور دیووں کی پرستش کرتے دیکھا ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آدم خور دیووں کے وجود کی نسبت یہ روایتیں اس طرح پیدا ہوئی ہوں کہ جب میام ما قوم کے لوگ اراکان میں پہلے پہل دخیل ہوئے تو اُس وقت اس ملک کے وحشی خصال باشندوں کی عادتوں کی نسبت اُنھوں نے مبالغہ آمیز باتیں سنی ہوں" سر آرتھر فیر صاحب کے اِن اقوال کو نقل کر کے مسٹر برجس بطور اپنی رائے کے یہ لکھتے ہیں کہ "اس ملک کے نام راکھنگ کو لفظ راکھشا یا۔ یاکھش سے مشتق سمجھنا ایک قیاسی بات ہے۔ اور اراکان کے باشندوں سے جو تحقیق کیا گیا تو کوئی شخص قابل اطمینان جواب نہیں دے سکا اور حقیقت یہ ہے کہ مرور زمانہ کے باعث اس کے اشتقاق کی اصلیت محو اور فراموش ہوگئی ہے۔"

پس ظاہر ہے کہ لفظ رخنگ درست اور اصلیت کے قریب تھا اور جس طرح انگریزوں نے اُس کے ہمسایہ ملک کا نام صحیح لفظ میام ما یا مرم ما کی جگہ برہما بنا لیا ہے اسی طرح کا یہ بھی ایک تصرف ہے جو غیر ملک کے لوگ اکثر کر لیا کرتے ہیں۔ بہر کیف یہ ملک ۱۷۸۴ء تک خود سر اور آزاد تھا۔ مگر سنہ مذکور میں برہما والوں (یعنی آوا اور پیگو کے بادشاہ) نے اس کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ اور مارچ ۱۸۲۴ء میں سرکار انگریزی نے جو برہما والوں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر اُن پر پہلی دفعہ فوج کشی کی تو چوبیسویں فروری

بت پرستوں کا ملک بھی کہتے ہیں) اس درخواست سے روانہ کیا کہ اگر تم چند روز ہمیں پناہ دے سکو تو ہم تمھارے پاس آجائیں۔ اور جب ہوائے موافق کے چلنے کا موسم آجائے تو مخا تک پہنچ جانے کے لئے ایک جہاز بہم پہنچا دو تاکہ ہم اول مکہ اور پھر وہاں سے روم یا ایران کو چلے جائیں۔ راجہ نے یہ درخواست قبول کی اور بہت مہربانی سے پیش آیا۔ چنانچہ سلطان باقی بہت سی کشتیاں (جن کے ملاح اہل فرنگ یعنی گوا وغیرہ سے بھاگے ہوئے وہ پرتگیز اور اور آوارہ گرد عیسائی تھے جنھوں نے اس راجہ کی نوکری کرلی تھی اور جن کا بڑا پیشہ بنگالہ کے اُن ضلعوں کو لوٹتے رہنا تھا جو ڈھاکہ اور ارکان کی جانب سمندر کے قریب ہیں) ساتھ لے کر واپس آیا۔ اور شجاع اپنی بیگم[۱] اور تینوں بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ اُن پر سوار ہو کر اراکان کو چلا گیا۔ اور راجہ نے اگرچہ اُس کی خاطر تواضع کچھ بہت بڑھ کر تو نہ کی مگر ضرورت کی معمولی چیزیں مہیا و موجود کرا دیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ۱۸۲۶ء کے صلح نامہ کی رو سے سرکار ممدوح کے قبضہ میں آگیا۔ اور اب تو نہ صرف اراکان بلکہ اس سے آگے شاہ برہما کا بھی کل ملک جو باشندوں کی اوضاع و اطوار اور آب و ہوا کی خاصیت کے لحاظ سے تقریباً ایک ہی طور کی سرزمین ہے۔ (معہ ملک مفتوحہ سابق و مفتوحہ سال حال ۱۸۸۶ء) چین کی حد تک گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں صاحب چیف کمشنر برہما کے ماتحت ہے سلطنت مغلیہ کے مورخوں نے اراکان کو "ذلیل ترین معمورہ ہائے عالم" اور ایک "قطعہ جہنم" لکھا ہے اور وہاں کے لوگوں کو نہایت ہی وحشی اور حیوانوں سے بدتر اور ملک کو "مسکن دام و دد" بتایا ہے اور اس کے رستہ میں اُن کے نزدیک فن جہازرانی کی ناواقفیت کے باعث "لجہ ہائے خونخوار" حائل تھے مگر انگریزوں کی عقل و دانش اور حسن انتظام سے وہی وحشی انسان بنتے جاتے ہیں۔ اور وہی قطعہ جہنم ایک سرسبز و شاداب اور بہت زرخیز علاقہ ہے۔ اور اس شہر میں اکیاب وغیرہ بعض مقامات نہایت عمدہ تجارت گاہ ہیں۔ س م ح

[۱] عالمگیر نامہ اور ماثر عالمگیری وغیرہ سے شجاع کی بیگم یا بیٹیوں کا ساتھ جانا ثابت نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ٹانڈہ سے بھاگنے کے وقت جس کو راج محل کے بعد اُس نے اپنا جائے قیام بنایا تھا اُس کے محل کی عورتیں اور مستورات وہیں رہ گئی تھیں۔ جن کو میر جملہ نے بڑی احتیاط اور احترام کے ساتھ شجاع کے خزانہ اور جواہر خانہ اور مال و اسباب سمیت اخلاص خاں نامی ایک سردار کی حفاظت میں اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا تھا۔ لیکن تعجب نہیں کہ اپنی خاص بیگم اور بیٹیوں کو وہ ساتھ لے گیا اور وہ عورتیں جن کا ذکر کتب مذکورہ میں کیا گیا ہے اُس کی خواصیں وغیرہ ہوں۔ س م ح

شجاع کا حسرتناک انجام اب یہاں اگرچہ کئی مہینے گذرے اور ہوا ئے موافق کا موسم بھی آگیا مگر مخا جانے کے لئے جہاز بہم پہنچا دینے کا کسی نے ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ شجاع صرف اتنی بات کا خواستگار تھا کہ ایک جہاز کرایہ پر مل جائے کیونکہ اُس کے پاس زر و جواہر کافی موجود تھے۔ بلکہ غالباً اُس کی ہلاکت کا بڑا باعث یہ دولت ہی ہوئی۔

اصل یہ ہے کہ یہ وحشی بادشاہ اور راجہ سچی مروت اور فیاضی کو جانتے ہی نہیں اور اپنے وعدوں کی پابندی اور ایفا کا شاذ و نادر ہی خیال کرتے ہیں بلکہ اپنی غرض کو مقدم سمجھ کر اُسی کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اور اس شیطنت اور قساوت کے نتیجوں کی طرف سے جو اکثر خود انھیں کو بھگتنے پڑتے ہیں مطلقاً بے پروا نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے ہاتھ سے یا تو مفلسی بچا سکتی ہے۔ یا اس قدر زور جو اُن کی طاقت سے زیادہ ہو۔

غرض شجاع کی طرف سے مخا جانے کے لئے بڑی التجائیں ہوئیں۔ لیکن یہ جنگلی راجہ قطعاً ملتفت نہ ہوا بلکہ یہاں تک بے مروت اور گستاخ ہو گیا کہ شہزادہ کی نسبت عتاب ظاہر کیا کہ اب تک ہم سے ملنے کو کیوں نہیں آیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ شجاع نے کسرشان کے خیال سے اس بُت پرست سے ملاقات نہیں کی تھی یا اس خوف سے اُس کے مکان پر نہیں گیا تھا کہ مبادا گرفتار کرے اور سب مال و اسباب لوٹ لے۔ اسی اثنا میں راجہ کو میر جملہ نے بھی شجاع کے پکڑ کر حوالہ کر دینے کی شرط پر اورنگ زیب کی طرف سے بہت سے فائدوں اور زر کثیر کے حاصل ہونے کی طمع دلا دی تھی۔ بہر حال راجہ کی خفگی رفع کرنے کو اگرچہ سلطان شجاع خود اب بھی اُس کے مکان پر نہ گیا۔ مگر سلطان باقی کو بھیج دیا۔

کہتے ہیں کہ جب یہ شہزادہ راجہ کے محل کے قریب پہنچا تو سواری پر سے غریب غربا کی طرف بہت سے روپے اور اشرفیاں[۱] پھینکیں۔ اور جب راجہ کے پاس پہنچا تو بہت سے زر بفت

---

[۱] اب سے پچاس برس پہلے تک ہندوستان میں یہ عموماً رواج تھا کہ امرا کی سواری کے وقت روپیہ اشرفی وغیرہ لٹایا کرتے تھے اور اس رسم کا یہاں تک رواج تھا کہ وہ فرانسیسی افسر جو اب سے اسی برس پہلے مرہٹوں کی طرف سے ہمارے اس ملک میں براہ ستلج آئے تھے اظہار امارت و شان و شوکت کے لئے وہ بھی اپنے ہاتھی پر سے کچھ روپیہ اشرفی اور سونے کی تھیں لٹاتے تھے بلکہ ریاست حیدرآباد دکن جس میں ہندوستانی دربار وں کی پرانی رسمیں اب تک بھی بہت کچھ زندہ ہیں جلوسی سواریوں کے موقعہ پر وہاں اب بھی یہ رسم کچھ کچھ جاری ہے۔ س م ح

وغیرہ کے تھان اور مرصع زیور پیش کش کئے اور اپنے باپ کے بذات خود حاضر نہ ہونے کی نسبت یہ عذر کیا کہ وہ علیل ہیں۔ اور بڑی التجا سے درخواست کی کہ وہ جہاز جس کے بہم پہنچا دینے کے لئے اتنے دنوں سے وعدے ہوتے رہے ہیں بہت جلد عنایت ہو۔ مگر اس ملاقات سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور پہلی درخواستوں کی طرح یہ درخواست بھی بیکار گئی اور اس وحشی نے اپنا وعدہ مطلق وفا نہ کیا بلکہ اُس عالی منزلت پناہ گزیں کی پریشانی اور رنج بڑھانے کے لئے اس سے پانچ ہی چھ روز بعد صاف صاف یہ پیغام بھیجا کہ اپنی بیٹی کی شادی ہم سے کردو۔ اور شجاع کے اس سے انکار کرنے پر ایسا غضب ناک ہوا کہ شاہزادہ کی حالت نہایت پُرخطر ہو گئی۔ اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا گویا ہلاکت کا منتظر رہنا تھا اور موسم گذرا جاتا تھا اس لئے کوئی نہ کوئی آخری بات قرار دینی ضروری تھی پس اُس نے ایک ایسی تدبیر سوچی جس سے فضول تر کوئی حرکت نہ تھی اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی ناامیدی کس حالت کو پہنچ گئی تھی اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ اراکان کا راجہ بُت پرست ہے لیکن مسلمان بھی وہاں بہتیرے ہیں جو یا تو بخوشی آن بسے ہیں یا وہ پرتگیز جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جو سمندر کے کناروں کے ضلعوں میں لوٹ مار کیا کرتے ہیں اُن کو پکڑ کر اور غلام بنا کر یہاں لے آتے ہیں۔ پس شجاع نے اُن کو گانٹھ لیا اور اُن کو اپنے دو تین سَو آدمیوں کو جو بنگالہ سے ساتھ آئے تھے ملا کر اس تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ یکایک راجہ کے محل پر حملہ کر کے اُس کو اور اُس کے خاندان کو تہ تیغ کر ڈالے اور خود فرمان روا بن جائے۔ یہ جسارت اگرچہ احتیاط کے خلاف اور ایک متہورانہ حرکت تھی۔ لیکن میں نے بعض پرتگیزوں اور مسلمانوں اور ڈچوں سے جو خاص وہاں موجود تھے سُنا ہے کہ اِس تدبیر کی کامیابی چنداں محال اور امکان سے خالی نہ تھی مگر اس منصوبہ کے عمل میں لانے کے لئے جو دن مقرر ہوا تھا اُس سے ایک روز پہلے یہ راز افشا ہو گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے رہے سہے کام ہی نہیں بگڑے

لہ عالمگیر نامہ اور ماثر عالمگیری اور سیر المتاخرین سے تو بالاتفاق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مصیبت کے وقت میں اُس کے رفیقوں اور نوکروں میں سے سوائے سید عالم بارہ اول اور سید قلی اُزبک کے جن کے ساتھ سادات بارہ میں سے شماری دس سید اور بارہ مغل تھے اور چند اور سپاہیوں اور خدمت گاروں وغیرہ کے سرے چالیس آدمی بھی بنگالہ سے اُس کے ہمراہ نہ آئے تھے۔ س م ح۔

بلکہ سارا کنبہ ہی ہلاک ہوگیا۔ چنانچہ اس راز کے کھل جانے پر اُس نے چاہا کہ پیگو کو بھاگ جائے لیکن اس ارادہ کا عمل میں لایا جانا قریب ناممکن تھا کیونکہ راہ میں ایسے سخت پہاڑ اور دشوار گذار جنگل اور بن حائل تھے کہ اُن میں سے ہو کر کوئی ایسا رستہ بھی ہوا ہی نہیں جس سے مسافر آتے جاتے رہے ہوں غرض کہ تعاقب کیا گیا اور بھاگنے سے آٹھ پہر بعد لوگوں نے اُسے جا لیا اور جیسی کہ اس اسم بامسمٰی شجاع شاہزادہ سے توقع ہونی چاہیئے یہ ویسی ہی شجاعت سے لڑا اور بہت سے وحشی خاص اُس کی تلوار سے قتل ہوئے۔ مگر آخر کار دشمنوں کے ہجوم سے جو پیچھے سے لگاتار آتے جاتے تھے مغلوب ہو کر ایسی لڑائی سے جو کسی طرح بھی برابر کی نہ تھی دست بردار ہوگیا۔

سلطان باقی جو باپ سے ذرا پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ویسا ہی لڑا جیسے کہ بہادر لڑا کرتے ہیں لیکن دشمنوں نے چاروں طرف سے اس قدر پتھر مارے کہ تمام بدن چور چور اور لہولہان ہوگیا۔ اور آخر یہ جنگلی اُسے اور اُس کی والدہ اور دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو پکڑ کر لے گئے۔

شجاع کی موت و حیات کی نسبت مختلف روایتیں

اب اس سے آگے اُس کی بابت کوئی ایسی ٹھیک بات جو زیادہ بھروسہ کے لایق ہو معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے نکل کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا چڑھا تھا اور اُس کے ہمراہ ایک خواجہ سرا اور ایک عورت اور دو شخص اور تھے۔ اور سر میں پتھر کا ایک ایسا زخم لگا ہوا تھا کہ وہاں پہنچ کر گر پڑا مگر جب اُس زخم کو اُس خواجہ سرا نے اپنی پگڑی سے باندھ دیا تو اُٹھ کر جنگل میں جا گھسا۔

اس کے علاوہ چار روایتیں اور سُنی ہیں اور اگرچہ اُن لوگوں کی زبانی ہیں جو عین موقعہ پر موجود تھے۔ مگر باوجود اس کے ایک دوسری سے نہیں ملتی۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مجھے اس امر کا یقین دلایا کہ اُس کی لاش مُردوں میں ملی تھی۔ لیکن صورت پہچاننی مشکل تھی اور ڈچوں کے کارخانے کے ایک افسر اعلیٰ کی چٹھی میں نے بچشم خود دیکھی ہے اُس میں بھی یوں ہی لکھا تھا۔ لیکن پھر بھی جیسا کہ چاہیئے یقینی بات کوئی نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے دہلی میں کئی بار ایسی افواہیں اُڑتی رہیں کہ جن سے خواہ مخواہ لوگوں

کے کان کھڑے ہوگئے[۱]۔ چنانچہ ایک بار تو یہ غل ہوا کہ شجاع مچھلی پٹن پہنچ گیا ہے اور گولکنڈا اور بیجا پور کے بادشاہوں نے اُس سے یہ عہد اور اقرار کرلیا ہے کہ اپنی اپنی تمام فوج سے آپ کی مدد کریں گے اور پھر بڑے وثوق سے یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ دو جہازوں پر جن پر سرخ نشان چڑھے ہوئے تھے سورت کے سامنے سے ہوکر گذرا ہے اور یہ جہاز اُس کو شاہ پیگو یا شاہ سیام نے دیئے ہیں - پھر ایک یہ چرچا ہوا کہ وہ ایران پہنچ گیا ہے اور شیراز میں لوگوں نے دیکھا ہے۔ اور کچھ دنوں بعد اِن افواہ اُڑانے والوں نے اُسے قندھار پہنچا دیا اور مشہور کردیا کہ وہاں سے کابل پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کررہا ہے۔ ایک دفعہ اورنگ زیب نے کہا کہ شجاع تو آخر حاجی ہوگیا" یعنی مکہ جا پہنچا۔ مگر اس کا یہ کہنا غالباً ظرافت کے طور پر تھا۔ اور اب تک بہتیرے آدمی اس بات پر یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ استنبول میں کچھ عرصہ رہ کر اور وہاں سے بہت سا مال و دولت لے کر ایران میں آگیا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ سب افواہیں محض بے بنیاد ہیں۔ اور وہ چٹھی قابل اعتماد ہے جو ڈچوں کے کارخانہ تجارت کے افسر اعلیٰ کی طرف سے تھی اور جس میں یہ لکھا تھا کہ شجاع اراکان سے بھاگنے کی حالت میں مارا گیا۔ چنانچہ اُس کے ایک خواجہ سرا نے جس کے ساتھ میں بنگالہ سے مچھلی پٹن گیا تھا اور ایک اور شخص نے جو اُس کے توپ خانہ کا سردار تھا اور اب شاہ گولکنڈا کا ملازم ہے مجھ سے کہا کہ فی الحقیقت ہمارا آقا مر چکا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل مجھ سے بیان کرنی نہیں چاہی۔ اور بعض فرانسیسی سوداگروں سے جو سیدھے اصفہان[۲] سے آتے تھے۔ دہلی میں میری ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ ایران میں ہم نے کبھی اُس کا نام بھی نہ سُنا تھا۔ اس کے سوا اُس کے زندہ نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ شکست کے ساتھ ہی اُس کی تلوار اور خنجر

---

[۱] آثر عالمگیری میں بضمن وقایع ۱۳ سنہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۸۰ھ ہجری لکھا ہے کہ " عالمگیر کے حضور میں یہ خبر پہنچی کہ مورنگ میں یعنی آسام اور کوچ بہار کے مابین ایک مصنوعی شجاع نے شورش برپا کی ہے جس پر نہایت تاکید کے ساتھ وہاں کے حکام ابراہیم خاں اور فدائی خاں کے نام فرمان جاری ہوئے کہ اگر وہ کسی طرف سر نکالے تو سر کاٹ کر حاضر کرو۔ جس سے ثابت ہے کہ فی الواقع اُس کی تباہی سے نو برس بعد تک بھی لوگوں کو اس کی موت و حیات میں شک ہی تھا۔ س م ح

[۲] اصفہان اُس زمانہ میں ایران کا دار السلطنت تھا۔ س م ح

پڑا ہوا ملا تھا اور اگر وہ واقعی جنگل میں بھاگ گیا ہوتا جیسا کہ بعض لوگوں کا ادعا ہے تو اس صورت میں بھی جاں بر ہونے کی بہت کم اُمید ہے۔ کیونکہ وہاں یا تو چوروں اور رہزنوں وغیرہ نے قطعًا مار ڈالا ہوگا یا شیر اور ہاتھی وغیرہ جیسے درندہ جانوروں نے جو وہاں کے جنگلوں میں بکثرت ہیں چیر پھاڑ ڈالا ہوگا۔

شجاع کے اہل وعیال

بہرحال سلطان شجاع کی موت وحیات کی نسبت خواہ کچھ ہی شکوک اور احتمالات ہوں۔ لیکن اُس کے کنبہ کے لوگوں پر جو جو آفتیں اور مصیبتیں پڑیں اُن کے متعلق روایتوں کی صحت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے چنانچہ ان بیچاروں کی مصیبتوں کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب ان کو قید کر کے واپس لائے تو کیا مرد کیا عورتیں کیا بچے سب کے سب قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ اور نہایت ہی بے رحمی اور سختی کی گئی۔ مگر کچھ مدت بعد اُن کو چھوڑ دیا گیا۔ اور کسی قدر مہربانی کی گئی۔ شجاع کی بڑی بیٹی سے راجہ نے شادی کرلی اور اُس کی ماں سلطان باقی سے خود اپنا عقد کر لینے کی بڑی خواہشمند تھی کہ اتنے میں سلطان باقی کے چند نوکر انھیں مسلمان لوگوں سے مل کر جن کا ذکر ابھی ہوچکا ہے پھر اُسی قسم کے منصوبہ کی فکر میں پڑ گئے۔ لیکن اُن میں کا ایک بے احتیاط اور جلد باز شخص جو غالبًا شراب پی کر اور بھی زیادہ بے عقل ہو گیا تھا نشہ کی ترنگ میں اس راز کو مخفی نہ رکھ سکا اور عین حملہ کے روز اُس سے یہ بھید کھُل گیا۔ اور اگرچہ اس قصہ کی نسبت بھی ہزاروں روایتیں سننے میں آئی ہیں۔ لیکن جو بات اطمینان اور اعتماد کے ساتھ بیان کی جا سکتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اس حرکت سے راجہ ایسا برہم اور غضب ناک ہوا کہ شجاع کے تمام کنبہ کے قتل کا حکم دے دیا یہاں تک کہ وہ شہزادی جس سے اُس نے عقد کرلیا تھا باوجودیکہ حاملہ تھی اس کے وحشیانہ حکم سے وہ بھی قتل کی گئی اور سلطان باقی اور اُس کے بھائیوں کے سر کند کلہاڑی سے کاٹے گئے اور اس بدبخت کنبہ کی باقی ماندہ عورتیں اپنے اپنے مکانوں میں ایسی سختی سے قید کی گئیں کہ فاقوں کے مارے وہیں ہلاک ہوگئیں۔

الغرض یہ لڑائی کی آگ جو ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی خاطر چاروں بھائیوں کے باہم بھڑکی تھی پانچ یا چھ سال کے اندر یعنی تقریبًا ۱۶۵۵ء سے نے کر

---

[1] چونکہ ۱۶۵۷ء کے اخیر میں شاہجہاں سخت بیمار ہوا تھا۔ اور اُس کی بیماری کی خبر پا کر سب

۱۶۶۰ء یا اکسٹھ تک اس طرح خاتمہ کو پہنچی اور اورنگ زیب اس عظیم الشان سلطنت کا اکیلا ہی مالک بن گیا[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - بھائیوں سے پہلے مراد بخش نے گجرات میں بغاوت کی تھی اور آخر کار شجاع کے اراکان میں چلے جانے کے بعد سلیمان شکوہ سری نگر سے قید ہو کر دہلی میں چھبیسویں جمادی الاولی ۱۰۷۱ھ ہجری کو پہنچا تھا۔ اس حساب سے یہ لڑائی بھڑائی تین برس سے زیادہ نہیں رہی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس قصہ کا شروع اُس وقت سے لیا ہے جب کہ شاہجہاں نے فساد کے اندیشہ سے شہزادوں کو علیحدہ علیحدہ صوبے دے کر کابل سے روانہ کیا تھا۔ س م ح

[1] شجاع کی شکستوں اور اراکان کو جانے کا حال جس طرح پر بلا اختلاف عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مونگیر سے بھاگنے کے بعد اُس نے ٹانڈہ کو اپنا محل و مرکز قرار دیا اور برسات یہیں بسر کی اور جب میر جملہ کی آمد آمد سے ڈر کر یہاں بھی ٹھکانا نہ دیکھا تو اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں اور قریب تین سو نوکروں چاکروں کے دو کشتیوں میں بیٹھکر راج محل کو بھاگ گیا جہاں پہلے سے اُس کا بڑا بیٹا زین الدین اس غرض سے گیا ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم رشید خاں نامی نے جو نمک حرامی کرکے میر جملہ سے سازش کر لی تھی اور اس کی تحریک سے راج محل کے رئیس معصوم خاں کے بیٹے منور خاں نے کسی قدر فساد برپا کر رکھا تھا اُس کو فرو کرے۔ چنانچہ رشید خاں کو تو اُس نے جاتے ہی جب کہ وہ سلام کو حاضر ہوا عین دربار میں قتل کرا دیا تھا۔ اور بلحاظ اپنی تنگ حالت کے اراکان کے راجہ سے پیام و سلام کرکے اور تحفے تحائف بھیج کر منور خاں کی سرکوبی کے لئے اُس کی بہت سی جنگی کشتیاں منگالی تھیں اور انھوں نے اُس کے ساتھ ہو کر منور خاں کو شکست دینے میں اپنی عادت کے موافق راج محل کی رعیت کو بھی بہت تباہ کیا اور اکثر لوگوں کو جن میں بہت سے مسلمان بھی تھے قید کرکے ساتھ لے گئے اور زین الدین نے اس مدد کے صلہ میں اُن کو بہت سا نقد و جنس دے کر رخصت کیا اور راجہ سے یہ ٹھیرا لیا کہ اگر شجاع کو مجبوراً اراکان میں آنا پڑے تو اُس کی کچھ فوج راج محل میں آکر اُس کو وہاں لے جائے۔ چنانچہ راجہ نے اپنے رشتہ دار چاٹگام کے حاکم کو جو اُس وقت تک یہ مقام ملک اراکان میں داخل تھا یہ حکم بھیج دیا تھا کہ جب شجاع طلب کرے تو کچھ فوج اُس کی مدد کو بھیج دے۔ پس جب شجاع راج محل میں پہنچا تو ناچار اپنے چند معتمد شخصوں کو فوج لانے کو بھیجا تاکہ ساتھ ہو کر اُس کو اراکان لے جائے اور ایک مہینے تک اس کے انتظار میں بیٹھا رہا لیکن چونکہ میر جملہ برابر اُس کے تعاقب میں چلا آتا تھا اس لئے اپنے تینوں بیٹوں اور دو چار سرداروں اور چند سپاہیوں اور خواجہ سراؤں وغیرہ کے ساتھ

جواب کا انتظار چھوڑ کر کشتیوں میں بیٹھ وہاں چل دیا۔ راج محل چھوڑنے کے تیسرے دن وہ لوگ جو زین الدین نے اب سے تین مہینے پہلے راجہ اور چاٹگام کے حاکم کے پاس روانہ کئے تھے معہ اکادن اراکانی اور فرنگستانی کشتیوں کے جو مسلح اور ساز و سامان سے بخوبی درست تھیں اور جن کو چاٹگام کے حاکم نے راجہ کے منشا کے موافق روانہ کیا تھا۔ راجہ اور چاٹگام کے حاکم کی تحریروں کے ساتھ بین رہ روی کی حالت میں آملے۔ مگر اراکانی سرداروں نے یہ کہا کہ اگرچہ ہم آپ کی مدد کے لئے آئے ہیں اور راجہ کا خود بھی ارادہ تھا کہ کمک کے لئے چاٹگام میں آکر ٹھیرے اور پیچھے سے جنگی کشتیوں کا اور بھی زیادہ مضبوط "لواڑہ" یعنی بیڑہ روانہ کرے اور خشکی کی راہ سے بھی کچھ مدد بھیجے لیکن یہ سب کچھ اُس صورت میں تھا کہ آپ راج محل یعنی اپنے ملک میں ٹھیر کر میر جملہ کے مقابلہ کا سامان کرتے اور آپ کے اراکان میں لے جانے کا ہم کو حکم نہیں ہے۔ اب چونکہ یہاں سے قریب ہی موضع بھلوہ میں دجو غالباً وہی مقام ہے جس کو حال کے انگریزی نقشوں میں بھلوا لکھا ہے۔ اور ڈھاکہ سے نیچے تقریباً ڈھاکہ اور چاٹگام کے وسط میں دریا کے کنارے ہے۔ انتہائے سرحد پر بادشاہی قلعہ اور تھانہ تھا اس لئے شجاع کا ارادہ ہوا کہ اُس پر قبضہ کرے اور وہاں ٹھیر کر اراکانیوں کی مدد سے آئندہ کے لئے کچھ بند و بست کرے مگر جب قلعہ پر تصرف نہ ہو سکا تو شجاع نے اراکان والوں سے خشکی پر اُتر کر قلعہ پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔ لیکن اُنھوں نے کہا کہ یہ ہمارے معمول کے برخلاف ہے۔ البتہ پانی پر ٹھیر کر توپ بندوق سے آگ برسانے کو ہم حاضر ہیں۔ اور شجاع کے اصرار سے ناراض ہو کر آخر کار روکھے پھیکے بن گئے۔ اور صاف کہہ دیا کہ اگر قلعہ آپ کی کوشش سے ہاتھ آجاتا تو مضائقہ نہ تھا کہ ہم آپ کو اس میں بٹھا کر آپ کے ایک لڑکے کو اراکان لے جاتے اور راجہ آئندہ کے لئے جو حکم دیتا وہ کرتے۔ لیکن اب تو یہی بہتر ہے کہ آپ خود اراکان کو تشریف لے چلیں۔ چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گیا۔ اور چھٹی رمضان ۱۰۷۰ھ کو وہاں چلا گیا۔ اور سوائے اُن چالیس رفیقوں کے جن کا حال پیچھے ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے۔ اس آفت میں اور کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اور جس وقت سے وہ وہاں پہنچا اور جو مصیبتیں وہاں پیش آئیں اُن کی نسبت صاحب عالمگیر نامہ نے مجملاً یوں لکھا ہے کہ

"بعد از قطع مراحل ادبار و طے لجہ ہائے خونخوار بہ جزیرۂ زخنگ کہ از ازل معمورہ ہائے عالم مسکن کفرہ ضلالت شیم است رسیدہ از تیرہ بختی و بدفرجامی باد و دوام آن سرزمین محشور شد و وخامت حال و سوئے مآلش باعث عبرت ہمگناں شد و سرانجام کار آن بدعاقبت بعد از وصول بآن ولایت ضلالت بنیاد و ملاقاتِ باسر گروہِ آن قوم بدنژاد کہ بہزاراں ہزار مرحلہ از شہرستانِ آدمیت و کشورِ انسانیت دور و از حلیہ دین و دانش و شعار مروت و مردمی مہجور اند بعد ازیں در محلِ خود مشروح

ازبک کے سفیروں کی آمد لڑائی کے ختم ہوتے ہی ازبک قوم کے تاتاریوں نے بڑی عجلت کے ساتھ اپنے سفیر اورنگ زیب کے پاس بھیجے۔ جس زمانہ میں شاہجہاں نے اُس کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا کر خانِ سمرقند[1] کی مدد کو جو خانِ بلخ سے لڑ رہا تھا بھیجا تھا یہ بہت سی لڑائیوں میں اُس کی بہادری اور جنگی لیاقتیں دیکھ چکے تھے اور اس سبب سے ڈرتے تھے کہ مبادا اُس کو اُن کی وہ دغابازی یاد

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ و مذکور خواہد شد"

مگر اس مصنف نے اپنے اس وعدہ کے موافق کوئی تفصیلی حال اس بدنصیب کا آگے کہیں بیان نہیں کیا۔ اور نہ کسی اور کتاب میں میری نظر سے گذرا۔ س م ح

[1] امام قلی خاں اور نذر محمد خاں ازبک قوم کے دو بادشاہ اور سگے بھائی تھے اور ان کے باہم ملک اس طرح پر تقسیم تھا کہ سمرقند اور بخارا امام قلی خاں اور بلخ و بدخشاں نذر محمد خاں کے پاس تھا۔ لیکن جب امام قلی خاں زوال بصارت کی وجہ سے مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا تو سمرقند اور بخارا بھی نذر محمد خاں کے قبضہ میں آ گیا۔ مگر اس کی سخت گیری اور سوئے تدبیری سے اُمرا نہایت تنگ آ گئے اور اُنھوں نے اس کے بڑے بیٹے عبدالعزیز خاں کو بخارا اور سمرقند کا علیحدہ بادشاہ بنا لیا اور صرف وہی بلخ اور بدخشاں اس کے پاس رہ گیا۔ لیکن چونکہ وہاں بھی بے انتظامی اور ابتری پھیل گئی تو مجبور ہو کر اُس نے یہ حماقت کی کہ شاہجہاں سے امداد کا طالب ہوا جو بلخ و بدخشاں و سمرقند و بخارا کو اپنا ملک موروثی سمجھ کر اُس کو اپنے قبضہ میں لانے کا نہایت آرزومند تھا اور اس کی اُس حرکت کو بھی نہ بھولا تھا جو اس نے جہانگیر کا مرنا سنتے ہی کابل کو آن گھیرا تھا پس اُس نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر شہزادہ مراد بخش اور امیرالامرا علی مردان خاں کو امداد کے حیلہ سے بلخ کو روانہ کیا اور خود بھی لاہور سے کابل کو کوچ کر دیا۔ چنانچہ جب بلخ سے ایک منزل پر نذر محمد خاں نے اپنے دو بیٹوں بہرام اور سبحان قلی کو شہزادہ کے استقبال کے لئے بھیجا تو بہت سی خاطر و مدارات کے بعد اُن کو یہ پیغام دے کر واپس بھیج دیا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں ہم بے شمار لشکر کے ساتھ آپ کی مدد کے لئے آن پہنچے ہیں مگر جب اگلے روز بلخ پہنچا تو امداد کی جگہ قلعہ پر قابض ہو جانا چاہا اور یہ دیکھ کر نذر محمد خاں معہ اپنے ایک بیٹے کے مجبور ایران کو بھاگ گیا اور اُنھوں نے بارہ لاکھ روپیوں اور جڑاؤ اور طلائی چیزوں اور ڈھائی ہزار گھوڑوں اور تین سو اونٹوں پر جو قلعہ میں تھے قبضہ کر لیا اور اُس کے دو بیٹوں اور تین لڑکیوں کو شاہجہاں کے پاس کابل بھیج دیا جن میں سے بہرام کو مصلحتاً پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا اور عبدالرحمٰن کو تربیت کے لئے داراشکوہ کے سپرد

ہو کہ جب وہ دشمن کے تخت گاہ بلخ پر قبضہ کر لینے کو تھا تو انھوں نے باہم صلح کر کے اُس کی سپاہ کو اپنے ہاں سے نکال دینے کے لئے اس وجہ سے بالاتفاق کوششیں کی تھیں کہ کہیں دونوں ہی کا ملک اس طرح نہ چھن جائے جس طرح اکبر نے کشمیر چھین لیا تھا۔[۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کیا گیا اور لڑکیوں کو بادشاہ کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب نے بہت اعزاز سے اپنے پاس رکھا مگر جب مراد بخش چند عرضیاں بھیج کر بلا انتظار حکم کے واپس چلا آیا۔ اور سعداللہ خاں وزیر سے بھی وہاں کا بخوبی نظم ونسق نہ ہو سکا تو شاہجہاں نے اورنگ زیب کو بھیجا جو جمادی الاول ۱۰۵۶ھ ہجری کی پہلی تاریخ کو وہاں پہنچ گیا اور نذر محمد خاں کے بیٹے عبدالعزیز خاں والی بخارا وسمرقند اور ازبک سرداروں سے جو نہایت ہجوم کئے ہوئے تھے خوب لڑائیاں ہوئیں اور اورنگ زیب نے وہ چستی وچالاکی اور جواں مردی دکھائی کہ دشمن بھی دنگ ہو گئے چنانچہ ایک روز جب کہ ازبکوں نے اپنی زبردست کمانوں سے تیروں کا مینہ برسا رکھا تھا فوج کا دل بڑھانے کو اپنی زرہ اُتار ڈالی اور ڈھال کھول کر پھینک دی اور کہا آج اسی طرح لڑیں گے۔ اور ایک اور لڑائی میں جب کہ مخالفوں نے نہایت ہی انبوہ کر رکھا تھا سواری سے اُتر کر ایسی بے فکری اور اطمینان کے ساتھ نماز ظہر باجماعت ادا کی کہ جس کی کیفیت سننے سے عبدالعزیز خاں کو اُس کے آگے سر جھکانا اور شاہجہاں کے حضور میں حاضر ہونا ہی پڑا اور نذر محمد خاں نے بھی اورنگ زیب کی خدمت میں اپنا خط متضمن اطاعت واخلاص بھیج کر اس کے ذریعہ سے امن اور صلح کی درخواست کی جس کو شاہجہاں نے نہایت عقلمندی کر کے اس وجہ سے قبول کر لیا کہ چار کروڑ روپیہ اب تک خرچ ہو چکا تھا اور فائدہ کچھ بھی نہ تھا۔ اور اورنگ زیب اُسی طرح ملک کو خالی کر کے واپس چلا آیا۔

[۱] ۷۱۵ھ میں ایک شخص ساہو نامی جو اپنے کو گرشاسپ کی نسل سے (یعنی ایرانی نژاد گنتا تھا) راجہ سہدیو فرماں روائے کشمیر کا (جس کو بعض کتابوں میں شاید رسم الخط کی غلطی سے مہدیو اور اولاد راجہ ارجن پانڈو سے لکھا ہے) ملازم ہو کر عمدہ خدمتوں کے باعث رفتہ رفتہ نہایت صاحب اقتدار ہو گیا تھا چنانچہ ۷۴۷ھ میں جب سہدیو کا بیٹا جو برائے نام راجہ تھا مر گیا تو اُس کا مقتدر اور مسلط وزیر شاہ میر جو اس ساہو کا بیٹا تھا سلطان شمس الدین لقب مقرر کر کے خود ہی راجہ بن بیٹھا۔

اس طرح پر ہندو راجاؤں کی حکومت کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا اور دو سو تیرہ برس تک شمس الدین کی اولاد کے لوگ متواتر حکمرانی کرتے رہے۔ مگر جب اس سلسلہ کے اخیر بادشاہ حبیب شاہ ابن نازک شاہ کو رجو سہدیو کے بیٹے کی طرح صرف برائے نام بادشاہ تھا، ۹۶۲ھ میں اُس کے کشمیری وزیر غازی خاں

چک نے بے دخل کر دیا تو سلطنت چکوں کے خاندان میں منتقل ہو گئی۔ اور غازی خاں کی وفات کے بعد جو اُس کے بھائی حسین شاہ اور علی شاہ نوبت بنوبت بادشاہ ہوئے تو حسین شاہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی خدمت میں تحفہ تحائف بھیج کر اظہارِ اطاعت کرتا رہا اور علی شاہ نے تو یہاں تک تابعداری اختیار کی کہ اکبر کا خطبہ اور سکہ بھی جاری کر لیا اور شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے لئے اپنی بیٹی کا ڈولہ بھی روانہ کیا۔

جس واقعہ کا ڈاکٹر برنیر اشارہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جب سید مبارک خاں نامی ایک کشمیری سردار نے علی شاہ کے بیٹے یوسف شاہ کو کشمیر سے خارج کر دیا اور وہ مرزا سید یوسف خاں مشہدی صوبہ دار پنجاب کے ذریعہ سے استمداد کے لئے بمقام فتحپور سیکری اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے مرزا مذکور اور راجہ مان سنگھ والیِ جودھپور کو اس کی مدد کے لئے مامور فرمایا اور ۹۸۶ھ میں خفیف مقابلہ کے بعد کشمیر پھر اُس کے قبضہ میں آ گیا۔ ۹۸۹ھ میں اکبر نے کابل سے آتے ہوئے جلال آباد سے ایک ایلچی معہ فرمان کے روانہ کیا اُس نے فرمان کا استقبال کیا اور حیدر خاں عرف یعقوب اپنے بیٹے کو بہت سے تحفہ تحائف کے ساتھ اکبر کی خدمت میں بھیج دیا یہ شہزادہ ایک برس تک حاضر دربار رہا۔ مگر کمبختی جو آئی کسی باعث سے گھبرا کر بلا اجازت کشمیر کو چلا گیا۔ اب اکبر کو ملک پر قبضہ کر لینے کے لئے خاصہ بہانہ مل گیا اور یوسف شاہ کے نام ایک سخت فرمان جاری ہوا کہ خود حاضر ہو یا اپنے بیٹے کو حاضر کرے۔ مگر جب تعمیل میں رجیبی کہ پہلے ہی سے توقع تھی حیلے بہانے ہوئے تو کشمیر کو فوج بھیج دی گئی۔ اور جب یوسف شاہ معہ اپنے بیٹے کے جو اس مصیبت کا باعث ہوا تھا مرزا شاہ رخ اور راجہ بھگونت داس امرائے شاہی مامورہ مہم کے لشکر میں حاضر ہو گیا تو کشمیریوں نے جو اپنی آزادی کو قائم رکھنا چاہتے تھے اُس سے ناراض ہو کر حسین چک کو اپنا حاکم بنا کر مقابلہ کی تیاری کر دی۔ مگر یعقوب باپ کو چھوڑ کر پھر کشمیر کو بھاگ گیا اور کشمیریوں نے اُسے شاہ اسمٰعیل کا لقب دے کر بادشاہ بنا لیا۔ لیکن ایک سخت لڑائی کے بعد کشمیری سردار مغلوب ہو کر حاضر ہو گئے اور ۹۹۳ھ میں اکبر کا سکہ خطبہ پھر جاری ہو گیا۔ اور زعفران اور ریشم اور شکاری پرندے بطور خراج مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد اگرچہ یوسف شاہ بادشاہ کی خدمت میں بذات خود حاضر تھا مگر یعقوب اب بھی جیسی چاہیے اطاعت نہیں کرتا تھا اس نے پھر فوج کشی ہوئی وہ اور شمس چک کچھ عرصہ تک مقابلہ کرتے رہے مگر آخرکار شمس چک وغیرہ کشمیری سردار سب حاضر ہو گئے اور ملک کشمیر ضمیمہ سلطنت مغلیہ ہو کر مرزا یوسف خاں مشہدی جو لیاقت اور دانشمندی میں مشہور شخص تھا صوبہ دار مقرر ہو گیا۔ اور اب کشمیری ایسے مغلوب ہو گئے اور اُن کا یہ کوتاہ اندیش بادشاہ یعقوب اس حالت کو پہنچ گیا کہ ۹۹۷ھ میں جب شہنشاہ کشمیر کی سیر کو گیا تو دربار

چونکہ یہ اُن تمام واقعات سے جو ہندوستان میں گذرے تھے اور اورنگ زیب کی فتوحات اور سلطنت کے دوسرے دعوے داروں کی کامل بربادی اور موت سے خوب واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگرچہ شاہجہاں زندہ ہے مگر فی الواقع اُس کے بیٹے کے بادشاہ ہونے کو سب نے مان لیا ہے اس لئے انتقام کے خوف یا جبلی طمع اور طبعی لالچ کی تحریک سے اس اُمید پر کہ شہنشاہ ہندوستان کے ہاں سے عمدہ عمدہ تحفے ہاتھ آئیں گے مبارکباد کہنے اور خدمت کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کرنے کو اُنھوں نے اپنے ایلچی روانہ کئے مگر فتح کے بعد یہ پیغام جس قدر کے قابل تھے اورنگ زیب اُس سے بخوبی واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ صرف سزا کے خوف یا مال کی طمع سے ان کو بھیجا ہے ۔ لیکن تاہم مناسب طور پر اُن کا استقبال اور خاطر تواضع عمل میں آئی اور چونکہ اُس روز دربار میں میں بذاتِ خود موجود تھا اس لئے ہر ایک بات کو صحیح طور پر بیان کرسکتا ہوں ۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ انھوں نے دربار ہندوستان کی رسم ادب کے موافق کسی قدر فاصلہ سے بادشاہ کو سلام کیا ۔ یعنی سر جھکا کر اور تین دفعہ اپنے ہاتھ زمین تک لے جاکر اور پھر پیشانی تک لاکر تین بار سلام کیا اور اس کے بعد اگرچہ وہ اس قدر نزدیک پہنچ گئے کہ اورنگ زیب خود اُن کے ہاتھ سے خریطے لے سکتا تھا ۔ لیکن یہ رسم ایک امیر کی معرفت ادا ہوئی ۔ یعنی اُس نے ان سے لے کر کھولے اور پھر بادشاہ کو دیئے ۔ اور اُس نے بڑی متانت اور وقار سے پڑھکر حکم دیا کہ ہر ایک سفیر کو "سراپا" (جس کے معنی ہیں سر سے پاؤں تک کا لباس) عنایت ہو ۔ چنانچہ زربفت کی ایک ایک قبا اور ایک ایک پگڑی اور ایک ایک زری کا ریشمی پٹکہ عطا ہوا اور اس کے بعد جو تحائف وہ اپنے اپنے "خان" کی طرف سے لاتے تھے پیش ہوئے ۔ لیکن نہایت عمدہ لاجورد[1] کے بنے ہوئے کئی صندوقچے اور لمبے لمبے بالوں والے کئی اونٹ اور چند نہایت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ عیدالفطر کے روز مرزا یوسف خان کی سفارش سے جو اُس کی تقصیر معاف ہوئی تو اکبر نے بجائے تاج بخشی کے اُس کو اپنی پاپوش عطا کی ! جس کو وہ اپنی پگڑی پر باندھ کر دربار میں حاضر ہوا (ماخوذ از سیر المتاخرین و گلزار کشمیر وغیرہ) س م ح

[1] کتاب مخزن الادویہ میں لکھا ہے کہ کاشغر واقع ترکستان کا سنگ لاجورد سب سے بہتر ہوتا ہے ۔ س م ح

خوبصورت ترکی گھوڑے (اگرچہ وہاں کے گھوڑوں کی زیادہ تعریف اصالت ہی کی ہے) اور کئی اونٹوں کے بوجھ کی مقدار میں تازہ میوے مثل سیب۔ ناشپاتی۔ انگور اور سردہ وغیرہ جو دہلی میں اکثر اُسی ملک سے آتے اور جاڑے بھر بکا کرتے ہیں اور اسی قدر خشک میوے مثل آلو بخارا۔ خوبانی اور کشمش اور دو قسم کے سفید اور سیاہ انگور جو بہت بڑے بڑے اور نہایت لذیذ تھے جن کو ملاحظہ فرما کر اورنگ زیب نے سفیروں سے فرمایا کہ خان صاحبوں کے ان تحائف سے ہم بہت خوش ہوئے۔ اور میووں کی خوبی اور اونٹوں اور گھوڑوں کی عمدگی کی بڑے مبالغے سے تعریف کی۔ پھر اُن کے ملک کی زرخیزی کا کچھ ذکر کر کے سمرقند کے مدرسۂ اعظم کی بابت چند باتیں پوچھ کر کہا کہ اچھا اب آرام کیجئے۔ اور گاہ گاہ دربار میں آتے رہیئے۔ ہم آپ کی ملاقات سے خوش ہوں گے۔ چنانچہ جس طرح اِن ایلچیوں کا استقبال وغیرہ ہوا اُس سے یہ بہت خوش اور رضامند دربار سے رخصت ہوئے اور ہندوستان کے طرز سلام سے جو فی الواقع ایک ذلت ہے کچھ رنجیدہ نہ تھے۔ اور نہ اس سے کچھ ناراض تھے کہ خود بادشاہ نے ہمارے ہاتھ سے خریطے کیوں نہ لئے اور مجھے یقین تھا کہ اگر اُن سے آداب زمیں بوس[1] بجالانے یا اس سے بھی زیادہ کسی اور رسم انکسار کے ادا کرنے کی خواہش کی جاتی تو یہ اُس کو بھی بلا عذر قبول کر لیتے لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر یہ اپنے ملک کے دستور کے موافق سلام کرنے یا بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے خریطے دینے کی استدعا کرتے تو یہ منظور بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ رعایتیں صرف ایران ہی کے سفیروں کے ساتھ ملحوظ رہتی

---

[1] شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ سے جس نے لباس اور رسوم دربار وغیرہ میں تالیف قلوب کے لئے بہت کچھ ہندو راجاؤں کا طرز اختیار کر لیا تھا لوگ جس طرح راجاؤں کو ڈنڈوت کرتے تھے دربار کے وقت بجائے سلام کے بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا تھا مگر شاہجہاں نے تخت پر بیٹھتے ہی اس کی ممانعت کی اور مہابت خاں سپہ سالار کی رائے سے اُس کی عوض "آداب زمیں بوس" مقرر ہوا۔ یعنی جب کوئی سلام کو حاضر ہو تو چاہیئے کہ بادشاہ کے سامنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اُن کی پُشت کو چوم لیا کرے اور سادات اور علما اور مشائخ اور درویشوں کو حکم ہوا کہ صرف سلام کر لیا کریں اور رخصت کے وقت فاتحہ پڑھ دیا کریں مگر چونکہ اس میں بھی سجدہ کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت تھی چند سال بعد اس کو بھی موقوف کر دیا اور اس کے عوض چوتھی تسلیمات مقرر کر دی جو ایک مقام خاص سے جس کو آداب گاہ کہا جاتا تھا لوگ بجالاتے تھے۔

ہیں - بلکہ اُن کو بھی ہزار دقت سے یہ اجازت ملتی ہے -

یہ لوگ چار مہینے سے زیادہ دہلی میں رہے - اور اگرچہ کئی بار چاہا مگر رخصت نہ ملی اور اتنے دنوں تک یہاں رہنا ان کی تندرستی کے لئے ایسا مضر ہوا کہ یہ اور ان کے اکثر ہمراہی علیل ہو گئے - بلکہ کئی شخص تو مر بھی گئے - مگر مجھے شبہ ہے کہ ان کو گرمی کے باعث جس کے یہ عادی نہ تھے یہ تکلیف ہوئی یا کہ جسم اور لباس کی کثافت اور خوراک کی قلت کے سبب سے کیونکہ اُزبک غالباً تمام دنیا کے لوگوں سے بڑھکر خسیس اور بخیل اور کثیف رہنے والے ہیں - چنانچہ جو لوگ اس سفارت میں آئے تھے سب کے سب جو روپیہ خرچ کے طور پر اورنگ زیب کی طرف سے اُن کو ملتا تھا برابر جمع کئے جاتے تھے اور ایسی خست سے گزران کرتے تھے جو کسی طرح بھی اُن کے مناسب حال نہ تھی - مگر باایں ہمہ ان کی رخصت کے وقت بڑی دھوم دھام اور رسم رسوم کا عمل درآمد ہوا یعنی ایک ایسے دربار میں کہ جس میں تمام امرا حاضر تھے دونوں ایلچیوں کو بڑے بیش قیمت سراپا عطا ہوئے اور حکم ہوا کہ دونوں کے ڈیرے پر آٹھ آٹھ ہزار روپیہ نقد بھی بھیجا جائے اور ان کے آقاؤں کے لئے بھی بہت گراں بہا سراپا یعنی بہت سے عمدہ تھان زربفت کے اور کتنے ہی تھان تن زیب اور ململ کے اور چند الائچی جو ایک ایسا کپڑا ہوتا ہے جو سنہری روپہلی زری اور ریشم ملا کر بنا جاتا ہے اور چند قالین اور جڑاؤ قبضہ کے دو خنجر اُنھیں حوالہ کئے گئے[1]

---

[1] عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں سفیر ایک ہی وقت میں نہیں آئے تھے - بلکہ سبحان قلی خان خلف نذر محمد خاں والیِ بلخ کا سفیر چھبیسویں جمادی الثانی ۱۰۷۰ھ کو حاضر ہوا اور شاہی میر تزک شہر سے باہر استقبال کر کے اُس کو دربار میں لایا اور خلعت کے علاوہ مرصع پٹی اور پندرہ ہزار روپیہ نقد عطا ہوا تھا اور چونکہ دیر سے بیمار اور ناتوانی اور ضعف کی حالت میں یہاں پہنچا تھا اس لئے چوتھی رجب سنہ مذکور کو ایک مرصع چھڑی جو بڑے بڑے امیروں کو اعزازاً اس غرض سے عطا ہوتی تھی کہ اُس کے سہارے سے دربار میں کھڑے رہا کریں عطا ہوئی اور دو سو تولہ کی ایک اشرفی اور اسی وزن کا ایک روپیہ عنایت ہوا مگر وہ چند روز بعد یہیں مر گیا - اور اُس کے ہمراہیوں کو آٹھ ہزار روپیہ نقد دے کر رخصت کیا گیا تھا اور عبدالعزیز خاں کا سفیر ۱۰۷۱ھ میں آیا تھا اور اُس کا کابل میں پہنچ جانا سُن کر بادشاہ نے ایک سردار کو اُس کی خاطر تواضع اور مہمانداری کے لئے روانہ کیا تھا اور جب وہ چوتھی ربیع الثانی سنہ مذکور کو شاہجہان آباد کے قریب

سفیروں سے میری ملاقات

ان کے قیام دہلی کے زمانہ میں میری تین ملاقاتیں ان سے ہوئیں اور مجھے میرے ایک دوست نے جس کا باپ ملک اُزبک سے دربار مغلیہ میں آکر بہت دولت مند ہو گیا تھا یہ کہکر کہ یہ ایک طبیب ہیں ان سے ملا دیا تھا۔ ان ملاقاتوں سے میرا یہ مدعا تھا کہ حتی الامکان اُن کے ملک کے کچھ حالات دریافت کروں مگر وہ اس قدر بے علم اور جاہل نکلے کہ جس کا مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا یہاں تک کہ اپنے ملک کی حدود سے بھی واقف نہ تھے اور جن تاتاریوں نے چند ہی سال گذرے ملک چین پر غلبہ حاصل کیا تھا اُن کا کچھ بھی حال نہ بتا سکے۔ خلاصہ یہ کہ اُن سے ایک بھی نئی بات معلوم نہ ہو سکی ایک دفعہ مجھے یہ شوق ہوا کہ ان کے ساتھ کھانا کھاؤں اور چونکہ یہ رسوم تکلف سے چنداں آشنا نہ تھے اس لئے اُن کے شریک طعام ہو جانے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ مگر اُن کا کھانا بہت ہی عجیب وغریب نظر آیا یعنی بجز گھوڑے کے گوشت کے کوئی بھی چیز نہ تھی۔ مگر بہرحال میں نے اپنے کھانے کا کچھ ڈھنگ نکال لیا۔ کیونکہ دسترخوان پر ایک قاب میں کچھ گوشت ایسی ترکیب[1] سے پکا ہوا بھی تھا کہ جس کو میں نے کھانے کے قابل سمجھا اور آداب مجلس کے لحاظ سے اُس کی تعریف بھی کرتا رہا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک وہ نہایت ہی خوش ذائقہ غذا تھی۔

کھانا کھانے میں ایک حرف بھی کسی کے منہ سے نہیں نکلتا تھا ادھر میرے یہ لطیف مزاج! میزبان جس قدر منہ میں سما سکتا تھا!! ہاتھ سے گھوڑے کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ پہنچا تھا تو دو بڑے امیر استقبال کرکے دربار میں لائے تھے اور یہ ترکی گھوڑوں اور اونٹوں اور اور چیزوں کے علاوہ چالیس ہزار روپیہ کی قیمت کا ایک لعل بھی تحفہ میں لایا تھا اور چونکہ یہ بھی بیمار ہی آیا تھا اس لئے خلعت اور مرصع خنجر اور آٹھ ہزار روپیہ نقد کے علاوہ ایک مرصع چھڑی اس کو بھی عنایت ہوئی تھی اور رخصت کے روز پھر خلعت معہ خنجر مرصع اور تیس ہزار روپیہ نقد کے مرحمت ہوا تھا اور آنے کے دن سے رخصت کے روز تک کل ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ اس کو دیا گیا تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر برنیر نے غالباً اپنی یاد کی غلطی سے ان دونوں سفیروں کے آنے کو ملا کر لکھدیا ہے۔ س م ح

[1] اصل کتاب میں لفظ راگو لکھا ہے جو فرنگستان میں ایسے سالن کو کہتے ہیں جو کئی قسم کے گوشت کی بوٹیاں اور مصالحے ملا کر بہ تکلف تیار کیا جاتا ہے۔ راگ و س م ح

گوشت ٹھو نسے چلے جاتے تھے ۔ کیونکہ چمچہ سے کھانا بالکل جانتے ہی نہ تھے[1] لیکن اس لطیف غذا سے جب خوب پیٹ بھر گیا تب تو اُن کی زبان کھلی اور خوش اختلاطی طور پر مجھ سے بدلائل کہنے لگے کہ ازبک سب لوگوں سے زیادہ قوی ہیکل ہیں۔ اور تیراندازی میں دنیا کی کوئی قوم اُن کی برابری نہیں کر سکتی ۔ اور یہ کہکر اپنے تیر اور کمانیں منگائیں، جو فی الواقع ہندوستان کی کمانوں اور تیروں کی بہ نسبت بہت لمبی تھیں اور کہا کہ ہم شرط لگاتے ہیں کہ اپنا تیر گھوڑے یا بیل کے جسم سے پار کر سکتے ہیں ۔ اور پھر اپنی دیہاتی عورتوں کی طاقتوری اور بہادری کی اس قدر تعریف کرنی شروع

[1] افغانستان اور ترکستان کے لوگ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھانے کو ایک زنانہ پن سمجھتے ہیں اور چینیوں کے سوا جن کے کھانا کھانے کا طرز اہل یورپ سے بہت کچھ مشابہ ہے چھری کانٹے اور چمچہ سے کھانا کھانے کا رواج ممالک ایشیا میں کبھی بھی نہ تھا اور اب تک بھی اس نے کچھ زیادہ رواج نہیں پایا۔ اور کھانے کے وقت کم بولنا آداب طعام میں سمجھا جاتا ہے اور ترکستان میں گھوڑے کے گوشت کا عام رواج ہے۔ چنانچہ ہمارے محترم دوست مولوی محمد حسین صاحب آزاد جنھوں نے ترکستان کی خوب سیر کی ہے اپنے ایک خط میں یوں ارقام فرماتے ہیں "گھوڑے کا گوشت اس ملک میں عام ہے ۔ بازارہائے قصابی میں جو بڑا عریض اور طویل بازار ہوتا ہے میں نے دیکھا ہے کہ گوشت کی رانیں اور پچھے دوکانوں پر اور دوکانوں کے آگے جو لکڑ گڑے ہوئے ہوتے ہیں ان پر لٹکتے ہوتے ہیں۔ جس لکڑ پر گھوڑے کی دُم لٹکتی ہے وہ گویا بورڈ لگا ہوا ہے کہ یہ گھوڑے کا گوشت ہے! اور جس پر گائے کی دُم لٹکتی ہے سمجھ جاؤ کہ یہ گائے کا گوشت ہے، جس پر اونٹ کی دم لٹکتی ہے یہ اونٹ کا گوشت ہے۔ جب ہم کابل سے بلخ کو روانہ ہوئے تو کتل دندان شکن سے اترتے ہوئے ہمارے قافلہ سالار کا گھوڑا اگر وہ اترائی بھی میل بھر سے کم نہ تھی ایسے مقاموں میں گر کر گھوڑے یا اونٹ کا سنبھلنا تو ممکن ہی نہیں گھوڑا چور چور ہو گیا ۔ سامنے ہی ایک گاؤں تھا لوگ وہاں کے سنتے ہی چھرے لے کر دوڑے اور تکہ بوٹی کر کے لے گئے اور اپنی ہانڈیاں جا گرم کیں" کیا تعجب کی بات ہے کہ جس قوم کا ایک مصنف گھوڑے کے گوشت کھانے پر ازبکوں کی ہنسی اُڑاتا ہے اُسی کی قوم کے لوگ جب ۱۸۷۰ء کی لڑائی میں سپاہ جرمنی نے اُن کے تختگاہ پیرس کو گھیر لیا اور اہل شہر گھوڑے وغیرہ جانوروں کے گوشت کھانے پر مجبور ہوئے تو صلح ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بڑے شوق اور تکلف سے گھوڑوں کی رانوں کے کباب اپنی میزوں پر لگاتے اور اور اقوام یورپ کی ہنسی اور مذاق کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے ۔ س م ح

کی کہ گویا امیزنوں[1] کو بھی اُن کے مقابلہ میں بہت نازک اندام اور ڈرپوک سمجھنا چاہیئے۔ اور اُن کی بہادری وغیرہ کے بہت سے قصّے سُنائے۔ چنانچہ خاص طور پر ایک قصہ نے تو مجھکو بھی تعجب میں ڈال دیا۔ مگر افسوس ہے کہ میں اُس کو اس آب وتاب کے ساتھ بیان نہیں کرسکتا کہ جس کے ساتھ اُنھوں نے بیان کیا تھا۔ یعنی جس زمانہ میں اورنگ زیب اُزبکوں کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھا اتفاقاً پچیس تیس سواروں کا ایک گروہ جو ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا گھسا اور گھروں کو لوٹنے اور غلام بنانے کے لیے لوگوں کو پکڑنے باندھنے لگا تو ایک بڑھیا نے اُن سے کہا کہ بیٹیا میری صلاح مانو اور ان حرکتوں سے باز آؤ اور اپنی خیریت چاہتے ہو تو جلد یہاں سے نکل جاؤ وہ میری بیٹی جو باہر گئی ہوئی ہے اور جلد آیا چاہتی ہے۔ تم پر آن پڑے گی تو تمھارا کیا اور نہ کیا سب برابر ہو جائے گا۔ لیکن اُنھوں نے اُس بیچاری نیک دل بڑھیا کی بات یوں ہی ٹھٹے میں اُڑا دی اور بدستور گھروں کو لوٹتے اور لوگوں کو پکڑتے باندھتے رہے مگر جب لوٹ کے مال سے اپنے گھوڑے اور ٹٹو لادلئے اور گاؤں کے بہت سے باشندوں اور خود اُس بیچاری بڑھیا کو بھی قید کرکے لے چلے تو کوس ڈیڑھ کوس بھی نہ گئے ہوں گے کہ یہ بڑھیا جو بار بار پیچھے کو مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ خوشی سے چلّا کر بولی۔ "میری بیٹی، میری بیٹی" اور اگرچہ وہ ابھی نظر سے اوجھل تھی مگر معمول سے زیادہ

---

[1] امیزن اس کا اشتقاق یونانی لفظ میزاس سے ہے جس کے معنی پستان کے ہیں اور جس طرح قدیم فارسی اور سنسکرت میں اسم کے پہلے الف لگاتے جانے سے اُس کے معنی نفی کے ہوجاتے ہیں اسی طرح حرف اے کے ملنے سے جو بمنزلہ الف کے ہے اُس کے معنی بن چھاتی والی عورت کے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں یورپ کے شرق میں عورتوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا تھا جو اپنی داہنی چھاتی اس غرض سے کاٹ ڈالتی تھیں کہ تیراندازی اور نیزہ بازی کرنے میں کچھ الجھاؤ نہ رہے اور مردوں کو اپنی صحبت میں دخل نہ دیتی تھیں۔ اور ایسی قوی اور جنگ جو تھیں کہ بحر اسود کے ساحل معروف یوکزن پر ایشیائے کوچک میں تھرموڈون ندی کے کنارے ایک سلطنت قائم کرلی تھی اور ہمت مردانہ اور قوت دلیرانہ سے قرب وجوار کی قوموں کو مسخر اور مغلوب کر رکھا تھا۔ مگر بعض مورخ ان روایتوں کو صرف افسانہ خیال کرتے ہیں۔ بہرحال اس روایت کی وجہ سے فرنگستان میں بہادر اور مردانہ وش عورتوں کے لئے یہ لفظ ایک اصطلاح بن گیا ہے۔ م م ح

گرد اڑتی دیکھکر اور گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سُن کر اُسے یقین ہو گیا تھا کہ میری بہادر بیٹی مجھے اور میرے رفیقوں کو بے رحم دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑا لینے کے لئے آپہنچی ہے اور وہ یہ الفاظ کہہ نہ چکی تھی کہ وہ لڑکی ایک برق وش گھوڑے پر سوار گلے میں کمان ڈالے اور کمر سے ترکش باندھے ہوئے دکھائی دی اور دور ہی سے للکاری! کہ اگر تم سب مال رکھ دو اور قیدیوں کو چھوڑ کر چپکے اپنے مکان کو چلے جاؤ تو میں اب بھی تمھاری جان بخشی کرتی ہوں! مگر اُنھوں نے جس طرح بیچاری بُڑھیا کی منت وسماجت پر کچھ خیال نہ کیا تھا اُسی طرح اس کی بات پر بھی کچھ توجہ نہ کی۔ لیکن جب اُس نے آن کی آن میں تین چار تیر مار کر اُتنے ہی سپاہیوں کو زمین پر گرا دیا تب تو وہ سخت حیران ہوئے! اور فوراً اپنی کمانیں سنبھال لیں۔ لیکن لڑکی اُن کی زد سے بہت دور تھی اور ہنستی تھی کہ کیا خوب! یہ نامرد اب اپنے رفیقوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ الغرض وہ اس زور سے تیر مارتی اور ایسا ٹھیک نشانہ لگاتی تھی کہ جسے دیکھکر یہ خوف زدہ ہندوستانی سوار ہکا بکا رہ گئے اور اُس نے آدھے تو تیروں سے مار لئے اور باقی ماندہ پر تلوار پکڑ کر آن پڑی اور سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

اورنگ زیب کی علالت

ابھی یہ تاتاری سفیر دہلی ہی میں تھے کہ اورنگ زیب ایک سخت بیماری میں مبتلا ہوا۔ چنانچہ اُسے شدتِ بخار سے ہذیان ہوتا تھا۔ اور زبان ایسی اینٹھ گئی تھی کہ بات مشکل سے منہ سے نکلتی تھی طبیب نااُمید ہو گئے تھے اور عموماً یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ بادشاہ مر گیا ہے۔ مگر روشن آرا بیگم کسی غرض سے اس بات کو چھُپائے ہوئے تھی۔ اور یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ راجہ جسونت سنگھ صوبہ دار گجرات شاہجہاں کو قید سے چھڑانے کے لئے چلا آتا ہے اور اسی ارادہ سے مہابت خاں صوبہ دار کابل بھی (جس نے آخر کار اورنگ زیب کی اطاعت قبول کر لی تھی) تین چار ہزار سواروں کے ساتھ آگرہ کی طرف بڑھا آتا ہے۔ بلکہ لاہور سے بھی آگے نکل آیا ہے۔ اور یہ بھی شہرت تھی کہ اعتبار خاں خواجہ سرا۔ شاہجہاں جس کی حراست میں تھا نہایت بے قراری سے چاہتا ہے کہ اُس بڈھے بادشاہ کو رہائی دینے کی ناموری مجھے حاصل ہو۔

ادھر سلطان محمد معظم کا یہ حال تھا کہ امیروں کو وعدے وعید اور رشوتیں دے کر

اپنا طرف دار بنانے کے لئے کوشش کر رہا تھا یہاں تک کہ ایک روز رات کو بھیس بدل کر راجہ جے سنگھ کے مکان پر بھی گیا اور نہایت منت و سماجت کے ساتھ اُس سے کہا کہ آپ علانیہ طور پر میری جانب دار بن جائے اُدھر روشن آرا بیگم نے کئی ایک امیروں کے اتفاق سے جن میں (توپ خانہ کا افسر اعلیٰ) فدائی خان میر آتش بھی تھا یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے سلطان اکبر کو جس کی عمر ابھی سات آٹھ ہی برس کی تھی تخت نشین کرے۔ ہر دو فریق نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ہمارا اصل مدعا شاہجہاں کا قید سے چھڑا دینا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف عوام الناس کی تالیف قلوب کے لئے ایک بہانہ تھا اور یہ بھی غرض تھی کہ اگر بالفرض اعتبار خاں یا اور امیروں کی مخفی سازش سے وہ چھوٹ جائے تو لوگوں کی نظر میں ہماری بات بنی رہے حالانکہ جتنے ذی رتبہ اور مقتدر لوگ تھے۔ شاہجہاں کا دوبارہ تخت نشین ہونا دل سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بجز جسونت سنگھ اور مہابت خاں اور بعض اور امیروں کے جو علانیہ شاہجہاں کی مخالفت کے مرتکب نہیں ہوئے تھے ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو اس بے چارے حق دار بادشاہ کو چھوڑ کر نمک حرامی سے کھلم کھلا اورنگ زیب کا ساتھی نہ بن گیا ہو اس لئے یہ لوگ بخوبی جانتے تھے کہ اُس کا قید سے نکل جانا گویا ایک بچھرے ہوئے شیر کا چھوٹ جانا ہے۔ اور اُس کی رہائی کے اندیشہ سے تمام اہل دربار ہراساں ہو رہے تھے اور سب سے زیادہ اعتبار خاں ڈر رہا تھا جو اس بیچارے بدنصیب قیدی بادشاہ سے بے وجہ بڑی سختیوں اور گستاخیوں سے پیش آتا رہا تھا۔ لیکن اورنگ زیب باوجود شدت مرض کے باپ کی نگہبانی اور سلطنت کے کام کی طرف سے غافل نہ تھا۔ اور اگرچہ سلطان معظم کو اُس کی تاکیدی ہدایت اور نصیحت یہی تھی کہ اگر میں مر جاؤں تو شاہجہاں کو قید سے چھوڑ دینا مگر اعتبار خاں کو جو فرمان بر فرمان لکھواتا رہا اُن میں برابر یہ تاکید تھی کہ خبردار اپنے کام میں سستی اور غفلت نہ کرنا اور بیمار ہونے سے پانچویں روز جب کہ مرض نہایت شدت پر تھا اُس نے کہا کہ ہم کو دربار میں لے چلو جس سے یہ غرض تھی کہ بعض لوگوں کو جو اُس کے مر جانے کا گمان ہو گیا تھا وہ جاتا رہے اور کوئی عام شورش یا ایسا واقعہ جس سے شاہجہاں قید سے نکل جاتے ہونے نہ پاتے۔ چنانچہ انھیں خیالات سے ساتویں اور نویں اور دسویں دن بھی دربار میں آتا رہا اور نہایت تعجب کی بات تو یہ ہے کہ تیرھویں روز اگرچہ

اتنی دیر تک غش میں رہا کہ عموماً اُس کا مرجانا مشہور ہو گیا مگر تاہم جوں ہی ذرا افاقہ ہوا تو باہر آیا اور راجہ جے سنگھ اور دو تین اور بڑے بڑے امیروں کو بلا بھیجا تاکہ لوگوں پر ثابت ہو جائے کہ وہ زندہ اور سلامت ہے اور خدمت گاروں سے فرمایا کہ ہم کو پلنگ پر ذرا بٹھا دو اور اعتبار خاں کے نام کچھ لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم دان منگایا اور سلطنت کی بڑی مُہر جو ایک چھوٹی سی تھیلی میں جس پر بادشاہ کی دستی مُہر لگی ہوئی روشن آرا بیگم کے سپرد رہتی تھی ایک خاص آدمی کے ہاتھ منگوا بھیجی جس سے یہ امتحان منظور تھا کہ بیگم نے اپنی کسی ناجائز غرض کے لیے اُسے استعمال تو نہیں کیا۔ چنانچہ جس وقت میرے آغا نے یہ سب خبریں سنیں تو میں نے دیکھا کہ اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"واہ واہ کیا استقلالِ طبع اور کیا حوصلہ ہے اورنگ زیب خدا تجھے سلامت رکھے تجھے ابھی بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ اور یقیناً ابھی تیری زندگی باقی ہے"۔

اور فی الحقیقت اس حالت کے بعد اُس کی صحت میں رفتہ رفتہ ترقی ہونے لگی۔

داراشکوہ کی بیٹی سے سلطان اکبر کے رشتہ کی تجویز

اب چونکہ اورنگ زیب کی طبیعت روز بروز اعتدال پر آتی جاتی تھی اُس کی یہ مرضی ہوئی کہ داراشکوہ کی بیٹی کو شاہجہاں اور بیگم صاحب کے پاس سے بلوا کر سلطان اکبر سے جس کی نسبت ولی عہد بنائے جانے کا احتمال ہے اُس کی شادی کر دے جس سے اُس کی ولی عہدی کو تقویت ہونے کی اُمید تھی۔ کیونکہ یہ شاہزادہ اگرچہ ابھی بچہ ہے لیکن بہت سے مقتدر امرا اُس کے قرابتی ہیں اور نواز خاں (شاہنواز خاں صفوی) کے نواسہ ہونے کی وجہ سے ایسے خاندان سے علاقہ رکھتا ہے جو کسی زمانہ میں مسقط کے بادشاہ تھے۔ اور محمد سلطان اور محمد معظم کی مائیں[1] صرف راجاؤں کی بیٹیاں ہیں۔

اگرچہ بادشاہانِ ہند مسلمان ہیں مگر ہندوؤں کے ہاں شادی کر لینے میں اُن کو کچھ تامل نہیں ہوتا خصوصاً جب کہ کوئی ایسا رشتہ امور سلطنت کے لئے مفید معلوم ہو اور خوبصورت بیوی بھی ہاتھ آئے۔ لیکن اورنگ زیب کا یہ منصوبہ چل نہ سکا کیونکہ شاہجہاں اور بیگم صاحب نے بڑی نفرت کے ساتھ اس سے انکار کیا بلکہ خود اس نو عمر شہزادی نے بھی

[1] پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ ان دونوں کی مائیں علیحدہ علیحدہ نہ تھیں بلکہ ایک ہی رانی یعنی نواب بائی کے پیٹ سے تھے اور محمد اکبر کی ننھیال کا شاہانِ مسقط کی نسل سے ہونا بھی جیسا کہ ہم پہلے ایک حاشیہ میں لکھ آئے ہیں صحیح نہیں ہے۔ س م ح

نہایت بیزاری ظاہر کی اور بچاری مدت تک اس خیال سے کہ کہیں اُسے زبردستی نہ لے جائیں نہایت تردد اور بے قراری کی حالت میں رہی اور علانیہ کہتی رہی کہ

"جان دیدوں گی! مگر اُس شخص کے بیٹے سے شادی نہ کروں گی جس نے میرے باپ کو مارا ہے"

اورنگ زیب کی شاہجہاں سے بعض جواہرات کی طلبی، اور اُس کا سختی سے انکار

اسی طرح اورنگ زیب شاہجہاں سے بعض خاص جواہرات کے حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہ ہوا جن کو وہ اُس مشہور و معروف (تخت طاؤس) میں لگانا چاہتا تھا جس کو دیکھکر ایک عالم کو حیرت ہوتی ہے۔ قیدی بادشاہ نے نہایت غصہ سے یہ کہلا بھیجا کہ اورنگ زیب دانائی اور انصاف سے سلطنت کا کام کرتا رہے مگر تخت کے معاملہ میں دخل نہ دے۔ اور جواہرات کی بابت اگر مجھے پھر ستائیں گے تو خبردار ان پتھروں کو کوٹ کر چورا کردوں گا۔

ڈچوں کے سفیر کی باریابی

آخرکار ڈچوں نے بھی اورنگ زیب کو تخت نشینی کی مبارکبا دینے میں پیچھے رہنا نہ چاہا اور سفیر بھیجنے کا ارادہ کیا اور اس کام کے لئے اڈیرکین کو تجویز کیا۔ جو اُن کی سورت کی کوٹھی کا کارپرداز اعلیٰ اور بہت متدین اور ذی لیاقت اور سلیم الرائے شخص تھا۔ اور چونکہ اُس کی یہ عادت تھی کہ تجربہ کار لوگوں کی رائے اور مشورت پر چلنے میں اُس کو کبھی انکار نہ ہوتا تھا اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اُس نے اس کام کو اپنے ہم وطنوں کے قابل انجام دیا۔ اورنگ زیب اگرچہ دربار کے ضابطوں اور دستوروں میں ہمیشہ بڑی کر و فر اور شان و شوکت دکھاتا ہے۔ اور اپنی دین داری کا اظہار بھی بہت کرتا ہے اور اس لئے عیسائیوں کو ذرا حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تاہم اس سفیر کے ساتھ وہ بڑی مہربانی اور اخلاق سے پیش آیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ہماری یہ خوشی ہے کہ مسٹر اڈیرکین اول ہندوستان کے دستور کے موافق آداب بجالائے یعنی آداب گاہ پر تسلیمات ادا کرے۔ اور پھر نزدیک آکر خاص اپنے ملک کی رسم کے موافق سلام کرے اور اگرچہ یہ سچ ہے کہ جو خریطہ مسٹر اڈیرکین لے کر حاضر ہوا تھا اورنگ زیب نے وہ ایک امیر کی وساطت سے لیا تھا مگر اس کو کچھ توہین کی علامت سمجھنا نہیں چاہیے۔

کیونکہ ازبکوں کے سفیروں کے ساتھ بھی ایسا ہی عمل ہوا تھا۔ ان ابتدائی رسوم کے طے ہونے کے بعد مسٹر ایڈریکین کو اپنے تحائف پیش کرنے کا حکم ہوا اور اُس کو اور اُس کے چندیورپین ہمراہیوں کو زربفت کے "سراپا" پہنائے گئے۔ چنانچہ منجملہ اُن تحائف کے کچھ تو سُرخ اور سبز رنگ کی عمدہ بانات کے تھان تھے اور کچھ بڑے بڑے آئینے اور کچھ چین اور جاپان کی بنی ہوئی عمدہ چیزیں جن میں ایک پالکی اور تخت رواں نہایت ہی خوبصورت تھا جو بہت ہی پسند کیا گیا۔

شاہانِ مغلیہ کی یہ عادت ہے کہ غیر ملکوں کے سفیروں کو جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس غرض سے ٹھیرائے رکھتے ہیں کہ اُن کا دربار میں حاضر رہنا اور آداب و تعظیم بجالانا سلطنت کی شان و شوکت کا باعث[1] ہے۔ پس ایڈریکین بھی جس جلدی کے ساتھ رخصت ہونا چاہتا تھا نہ ہوسکا۔ اگرچہ تاتاری سفیروں کی نسبت اُس کو بہت جلد رخصت حاصل ہوگئی یعنی جب اُس کا سکرٹری دہلی ہی میں چل بسا اور کئی اور شخص بھی بیمار ہوگئے تو اورنگ زیب نے اُس کو رخصت کردیا اور زربفت کا ایک "سراپا" اُس کو اور اُس سے بھی زیادہ قیمت کا "سراپا" اور جڑاؤ خنجر اور مہربانی آمیز ایک شقہ بٹویا[2] کے گورنر کے لئے عنایت ہوا۔

سفیر کے بھیجنے سے ڈچوں کی اصل غرض یہ تھی کہ دربار میں رسائی پیدا کرکے بادشاہ کا التفات حاصل کریں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے حال سے اُس کو کسی قدر مطلع کریں تاکہ

---

[1] ظاہرا یہ صرف مصنف کا قیاس معلوم ہوتا ہے ورنہ ممالک ایشیا کی رسم کے موافق مہمان کا زیادہ دیر تک ٹھیرانا خوش خلقی کی نظر سے ہوتا ہے۔ س م ح

[2] بٹویا ملک ہالینڈ کا قدیم نام ہے اور لفظ بٹی سے مشتق ہے جو ایک چھوٹی سی قوم تھی جو جرمنی کے اُن ضلعوں میں رہتی تھی جو زمانہ حال میں ہس کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ قوم سنہ عیسوی سے ایک سو برس پہلے وہاں سے اٹھکر ہالینڈ میں آبسی تھی اور اس کی وجہ سے پُرانے زمانہ میں ہالینڈ کا نام بٹویا مشہور ہوگیا تھا۔ مگر جس بٹویا کا ذکر مصنف نے کیا ہے وہ جزیرہ جاوہ میں کوئی پچاس ہزار آدمی کی آبادی کا ایک شہر اور ڈچوں کے مقبوضات کا دارالحکومت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے ملک کی مناسبت سے اس کا یہ نام رکھدیا ہے۔ ماخوذ از جام جم۔ س م ح

بندرگاہوں اور دوسرے مقامات کے حاکموں اور عالموں کے دل پر جہاں اُن کی تجارتی کوٹھیاں تھیں اُن کے بارے میں اچھا اثر پیدا ہو اور اُن کو امید تھی کہ یہ لوگ یہ معلوم کر کے کہ ڈچ بھی ایک زبردست سلطنت کی رعایا ہیں اور بادشاہ تک رسائی رکھتے اور خود اُس کی خدمت میں اپنا عرض حال کر کے انصاف حاصل کر سکتے ہیں ہماری حقارت نہ کیا کریں گے اور نہ تجارت میں خلل انداز ہوں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اہل دربار کو اس بات کے یقین دلانے میں کہ ہماری تجارت سے ہندوستان کو بہت بڑا فائدہ ہے بہت کوشش کی اور بہت سی جنسیں جو وہ یہاں سے خریدتے تھے اُن کی ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست اس غرض سے دکھلاتے تھے کہ اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ اُن جنسوں کے خریدنے کے لیے وہ بہت سا سونا چاندی اپنے ملک سے یہاں لاتے ہیں۔ مگر اس بات کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے کہ سال بہ سال تانبا۔ سیسا۔ دارچینی۔ لونگ۔ جائپھل۔ کالی مرچیں۔ عود اور ہاتی وغیرہ بیچ کر کس قدر دولت کھینچ لے جاتے ہیں۔

اصولِ جہانبانی پر اورنگ زیب کی تقریر

انھیں دنوں ایک بڑے امیر نے اورنگ زیب سے عرض کیا کہ حضور جو کام میں اس قدر محنت فرماتے ہیں اس سے اندیشہ ہے کہ صحت جسمانی بلکہ قوائے دماغی کو ضعف پہنچے۔ جس کو سن کر بادشاہ نے اس عقلمند! ناصح کی طرف سے تو منہ پھیر لیا گویا سُنا ہی نہیں اور ذرا ٹھیر کر ایک اور بہت بڑے امیر کی طرف جو نہایت، دانا اور ذی علم تھا متوجہ ہو کر فرمایا (اُس کی یہ تقریر خاص اس امیر کے بیٹے نے جو ایک نوجوان طبیب اور میرا دلی دوست تھا مجھ سے نقل کی تھی) کہ آپ تمام اہل علم اس باب میں متفق الرائے ہیں کہ مشکل اور خوف کے زمانے میں بادشاہ کو جان جوکھوں میں پڑ جانا اور ضرورت کے وقت رعایا کی بہتری کے لیے جو خدا نے اُس کے سپرد کی ہے تلوار پکڑ کر میدان جنگ میں جان دے دینا فرض و واجب ہے۔ مگر اس کے برعکس یہ نیک اور باتمیز شخص یہ چاہتا ہے کہ رعایا کے آرام و آسایش کے لئے مجھے ذرا بھی تکلیف نہ اٹھانی چاہیے اور بغیر اس کے کہ اُن کی رفاہ و فلاح کی تدبیروں کے سوچنے میں مجھے ایک رات بھی بے آرام رہنا پڑے یا ایک دن بھی بے عیش و عشرت اور لہو و لعب کے بسر ہو یہ مدعایوں ہی حاصل ہو جائے اور اس کی یہ رائے ہے کہ میں صرف اپنی تندرستی کو

مقدم جانوں اور زیادہ تر عیش و عشرت اور آرام و آسائش میں مصروف رہوں اور اس کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ میں اس وسیع سلطنت کے کام کو کسی وزیر کے بھروسہ پر چھوڑ بیٹھوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ جس حالت میں مجھے خدا نے شاہی خاندان میں پیدا کر کے تخت پر بٹھایا ہے تو دنیا میں اپنے ذاتی فائدہ کے لئے نہیں بھیجا بلکہ اوروں کے آرام کے لئے محنت **کرنا مجھ** پر فرض کیا گیا ہے پس میرا کام یہ نہیں ہے کہ اپنی ہی آسائش کی فکر کروں البتہ انھیں کے رفاہ کی غرض سے جس قدر آرام لینا ضروری ہے اس کا مضائقہ نہیں اور بجز اس حالت کے کہ انصاف و عدالت اس کی متقضی ہو یا اقتدار سلطنت کے قائم رکھنے یا ملک کی حفاظت کے لئے ضروری ہو اور کسی صورت میں رعایا کے آرام و آسائش کا نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے اور رعیت کی آسائش و بہبود ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی فکر مجھے ہونی چاہیئے۔ مگر یہ شخص اس بات کی تہ کو نہیں پہنچا کہ اس آرام سے جو یہ میرے لئے تجویز کرتا ہے کیا کیا قباحتیں پیدا ہوں گی اور یہ بھی اس کو معلوم نہیں کہ دوسروں کے ہاتھ میں حکومت کا دیدینا کیسی بری بات ہے۔ اور سعدی نے جو یہ کہا ہے کہ

"پادشاہوں کو چاہیئے کہ بذات خود کاروبار سلطنت کا بوجھ اپنے اوپر لیں ورنہ بہتر ہے کہ پادشاہ کہلانا چھوڑ دیں"

تو کیا اس بزرگ کا یہ قول لغو ہے؟ پس اپنے اس دوست سے کہہ دیجئے کہ اگر ہم سے تحسین و آفرین حاصل کرنا چاہتا ہے تو جو کام اس کے سپرد ہے اس کو اچھے طور سے کرتا رہے۔ اور خبردار! ایسی صلاح جو بادشاہوں کے سننے کے لائق نہیں ہے پھر کبھی نہ دے اور افسوس ہے کہ تن پروری اور آرام طلبی اور ایسے خیالات سے جو دوسروں کے فلاح و بہبود کے فکر و تردد میں آدمی کو گھلا ڈالتے ہیں۔ بچنے کی خواہش انسان کی طبعی اور جبلی کمزوری ہے پس ایسے فضول صلاح کاروں کی ہم کو حاجت نہیں عیش و آرام کے مشورے تو ہماری بیگمیں بھی دے سکتی ہیں۔

ایک خواجہ سرا کے عشق کا واقعہ انھیں دنوں میں ایک ایسا افسوسناک واقعہ دہلی میں ہوا کہ جس کا تمام شہر اور بالخصوص شاہی محل سرا میں بہت چرچا تھا اور جس سے میری اور لوگوں کی اس رائے کی کہ جو شخص

رجولیت سے محروم کر دیا جائے اُس کو تعشق نہیں ہو سکتا۔ غلطی ثابت ہو گئی[1]۔ یعنی دیدار خاں نامی ایک ذی رتبہ خواجہ سرا نے ایک مکان بنایا تھا جہاں تفریح خاطر کے لئے کبھی کبھی جاتا اور بعض اوقات رات کو وہیں سو بھی رہتا تھا اور اُس کے ہمسایہ میں ایک ہندو کا گھر تھا جو عرائض نویسی وغیرہ کا کام کیا کرتا تھا۔ یہ خواجہ سرا اس کی بہن پر جو بہت خوبصورت تھی عاشق ہو گیا اور اگرچہ کچھ عرصہ تک ان کا باہم ناجائز تعلق رہا مگر کسی کو کچھ شبہ نہ ہوا کیونکہ یہ خوجہ تھا اور زنانہ میں آنے جانے سے خوجوں کو کوئی بھی نہیں روکتا ـــــ مگر آخر کار ان کا تعشق یہاں تک بڑھ گیا کہ اُس ہندو کو بھی اِس قسم کی خبریں پہنچ گئیں کہ لوگ اُس کی بہن کی پاک دامنی کی نسبت شبہ کرتے ہیں اور اُس نے غصہ میں آکر اپنے دل میں یہ ٹھان لی کہ اگر یہ سچ ہے تو دونوں کو مار ڈالوں گا چنانچہ کچھ زیادہ عرصہ نہ لگا کہ ایک رات کو یہ دونوں اکٹھے سوتے دیکھ لئے گئے۔ پس اس نے دیدار خاں کو تو چھاتی میں خنجر مار کر مار ڈالا اور بہن کو بھی ایسا زخمی کیا کہ اُس کی دانست میں مر ہی چکی تھی اور اس واردات سے محل سرائے شاہی میں نہایت غُلغلہ اور شور و شر پیدا ہوا۔ اور خواجہ سراؤں اور محل کی عورتوں نے باہم ایکا کر لیا کہ جس طرح بنے اس شخص کو قتل کرنا چاہیے۔ چنانچہ اورنگ زیب جو اس ہندو کے مسلمان ہو جانے کو اُس کے اس گناہ کا کافی کفارہ خیال کرتا تھا اگر خواجہ سراؤں کے جوش و خروش پر ناراض نہ ہو جاتا تو اُس کا بچنا مشکل تھا مگر اس پر بھی لوگوں کی رائے عموماً یہ ہے کہ خواجہ سراؤں کی عداوت اور اُن کے زور و اثر کی وجہ سے یہ بے باک شخص سلامت نہ رہ سکے گا۔

ہندوستانیوں کا یہ خیال ہے کہ اگرچہ خصی کر دینے سے جانور غریب اور سیدھا ہو جاتا ہے مگر آدمی پر اس عمل کا اثر برعکس ہوتا ہے اور اُن کا قول ہے کہ کیا کوئی خواجہ سرا ایسا بھی ہے جو شریر اور مغرور اور بے رحم نہ ہو؟ حالانکہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بہت سے وفادار اور فیاض اور شجاع بھی ہوتے ہیں۔

انھیں دنوں اورنگ زیب کو روشن آرا بیگم پر دو نامحرم شخصوں کو محل میں بُلا لینے

---

[1] مصنف نے باوصف اس قدر قابلیت کے خدا جانے یہ کیا لکھدیا ہے۔ حالانکہ سیدھی بات ہے کہ اُس کے خوجہ بنانے میں کوئی کسر رہ گئی ہوگی۔ س م ح

کا شبہ ہوا اور وہ بہت ناراض ہوا مگر چونکہ شبہ ہی تھا اس لئے بھائی بہن میں جلد صفائی ہوگئی اور اورنگ زیب ان دونوں آدمیوں کے ساتھ اُس بے رحمی سے کبھی پیش نہیں آیا جو شاہجہاں نے اُس بدبخت گرفتار عشق سے برتی تھی جو حمام کی دیگ میں جا چھپا تھا میں اس قصہ کو ٹھیک اُسی طرح پر کہ جس طرح ایک دو غلی پرتگیزن بُڑھیا نے جو بہت عرصے سے لونڈیوں کے طور پر محل میں خدمت کرتی اور باہر آنے جانے کی بھی مجاز تھی مجھے سُنایا تھا بیان کرتا ہوں۔

روشن آرا بیگم نے ان میں سے اول تو ایک جوان کو کئی دن تک اپنے پاس چھپائے رکھکر حظِ صحبت حاصل کیا۔ اور بعد ازاں بعض اپنی خدمت گار عورتوں کو جنھوں نے وعدہ کرلیا تھا کہ ہم رات کی تاریکی میں اُس کو محل سے باہر کردیں گے سپرد کردیا۔ مگر یا تو ان عورتوں کو ایسا کرتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا یا وہ خود ہی افشائے راز کے اندیشے سے ڈر گئیں یا کچھ اور سبب ہوا۔ لیکن خلاصہ یہ ہے کہ وہ تو اُس کو چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ اور یہ خوف زدہ نوجوان محل کے باغوں میں اکیلا اور حیران پھرتا ہوا پکڑا گیا اور محل کے پاسبان وغیرہ اس کو کشاں کشاں اورنگ زیب کے حضور میں لے گئے چونکہ باوجود بہت ہی پرسش اور تفتیش کے اُس نے کسی جرم کے ارتکاب کا اقرار نہ کیا اور صرف اتنا ہی کہا کہ میں دیوار پرسے کود کر اندر آگیا تھا اس لئے اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جس طرح سے یہ شخص یہاں تک آیا ہے اس کو چاہیے کہ اُسی طور سے باہر نکل جائے۔ لیکن خواجہ سراؤں نے بادشاہ کے حکم سے غالبًا تجاوز کرکے اُس کو دیوار سے نیچے گرا دیا اور دوسرا شخص بھی اسی طرح باغ میں ادھر اُدھر پھرتا ہوا پکڑا گیا تھا اور اُس نے ظاہر کیا کہ میں دروازے کے راستہ سے آیا ہوں جس پر بادشاہ نے اُس کو تو اُسی راستہ سے باہر نکلوا دیا مگر خواجہ سراؤں کو عبرتًا سخت سزا دینے کا مصمم ارادہ کیا کیونکہ نہ صرف حفیظ ناموس کی خاطر بلکہ بادشاہ کی ذات خاص کی حفاظت کے لئے بھی محل سرا کی ڈیوڑھی کا زیادہ سخت انتظام کیا جانا ضروری تھا۔

مکہ یمن، بصرہ اور حبش کے ایلچیوں کی آمد اس واقعہ سے چند مہینے بعد قریبًا ایک ہی وقت میں پانچ ایلچی دہلی میں آئے۔ چنانچہ ان میں سے جو سب سے پہلے آیا وہ شریفِ مکہ کی طرف سے تھا۔ اور جو تحائف وہ لایا تھا اُن میں

چند عربی گھوڑے اور ایک جھاڑو تھی جو اُس معبد کے جھاڑنے بہارنے کے کام میں آ چکی تھی جو اُس مشہور و معروف مسجد کے وسط میں بنا ہوا ہے جو مکہ میں ہے اور جس کی مسلمان لوگ بڑی تعظیم کرتے اور اُس کو "بیت اللہ" یعنی خدا کا گھر کہتے ہیں اور اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ سب سے پہلا مکان ہے جو خدائے برحق کی عبادت کے واسطے مخصوص کیا گیا تھا اور اس کو حضرت ابراہیمؑ نے بنایا تھا۔

دوسرا ایلچی بادشاہ یمن نے بھیجا تھا۔ اور تیسرا البصرہ کے "پرنس"[1] نے اور یہ دونوں بطور تحفہ عربی گھوڑے لائے تھے اور باقی دو سفیر شاہ اتھوپیا (حبش) کے تھے۔ ان میں سے پہلے تین سفیروں کی خاطر تواضع اس قدر کم ہوئی جو بمنزلہ نہ ہونے کے تھی۔ کیونکہ اُن کا ساز و سامان ایسا حقیر تھا کہ ہر ایک شخص یہ خیال کرتا تھا کہ اُن کا آنا صرف اس غرض سے ہے کہ جو تحفے وہ لائے تھے اُن کی اور نیز اُن بہت سے گھوڑوں اور تجارتی جنسوں کی عوض جو اپنا ذاتی اسباب بنا کر بلا ادائے محصول ساتھ لے آئے تھے بہت سا روپیہ کما کر لے جائیں۔ چنانچہ فی الواقع جو روپیہ اُن کے تحائف کی عوض میں اور سوداگری مال و اسباب کے فروخت سے حاصل ہوا تھا اُس سے انھوں نے یہاں کی تجارتی جنسیں خریدیں اور بلا ادائے محصول اُن کو اپنے ساتھ لے جانے کا استحقاق ظاہر کیا۔

مگر شاہ حبش کی طرف سے جو ایلچی آئے تھے اُن کا حال کسی قدر توجہ طلب ہے۔ اِن سفیروں کے آنے کا یہ سبب تھا کہ جو انقلاب سلطنت یہاں وقوع میں آیا تھا شاہ حبش کو اُس کی تفصیلی خبر پہنچ چکی تھی اس لئے اُس کو یہ خواہش ہوئی کہ اپنے اقتدار اور شان و عظمت کے موافق سفارت بھیج کر اس وسیع سلطنت میں اپنی ناموری کی دھاک بٹھائے۔ لیکن بدگمان لوگوں کا یہ قول تھا اور فی الواقع سچ بھی تھا کہ سفیروں کے بھیجنے سے صرف وہ قیمتی تحائف اس حبشی کے مدنظر تھے۔ جن کے

---

[1] عالمگیر نامہ میں اس کا نام حسین پاشا لکھا ہے جو اول ٹرکی کی طرف سے بصرہ کا حاکم تھا اور پھر سلطان کی ناراضگی کی وجہ سے اورنگ زیب کا آن کر نوکر ہو گیا تھا۔ س ۔ م ۔ ع ۱۲

اورنگ زیب کے فیاض ہاتھوں سے حاصل ہونے کی قطعی اُمید تھی۔ اور جو ایلچی اُس نے بھیجے تھے فی الواقع اُس کے دربار میں بہت معزز و ممتاز اور اُن بڑے بڑے مقاصد کے حاصل کرنے کے قابل تھے جو اُس کے مد نظر تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ایلچی تو ایک مسلمان[1] سوداگر تھا جو چند سال ہوئے جب کہ میں بحر احمر کے راستہ سے بندر مخا میں آیا تھا وہاں مجھکو ملا تھا اور اُس کے "عظیم الشان آقا" نے بہت سے غلام دے کر اس غرض سے بھیجا تھا کہ اُن کو بیچ کر اس روپیہ سے جو ہاتھ آئے ہندوستانی مال و اسباب خرید لائے۔ واہ عیسائی ہوکر یہ نامور افریقی بادشاہ کیا عمدہ تجارت کرتا ہے۔ اور دوسرا ایک عیسائی ارمنی سوداگر تھا جو حلب میں پیدا ہوا اور وہیں اُس نے شادی بھی کرلی تھی اور اتھوپیا میں اس کا نام مراد مشہور تھا۔ اور مخا میں اس سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی اور اُس نے نہ صرف اپنا نصف مکان میرے لیے خالی کر دیا تھا بلکہ وہ صلاح بھی اسی نے دی تھی جس کی بناء پر میں نے حبش کو جانا ملتوی کر دیا تھا جس کا ذکر میں نے اپنی اس کتاب کے شروع میں کیا ہے۔ اور یہ بھی اُسی مذکورہ بالا غرض سے وہاں بھیجا ہوا آیا تھا۔ یہ شخص ہر سال مخا میں شاہ اتھوپیا کی طرف سے انگریزوں اور ڈچوں کی کمپنیوں کے لئے جو ہندوستان میں تجارت کرتی ہیں تحفتہً چیزیں لاتا اور اُن کی دی ہوئی اشیاء اپنے بادشاہ کے لئے گونڈار لے جاتا ہے۔ چونکہ یہ بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے سفیر ایسی شان و شوکت کے ساتھ جائیں جو اس موقعہ کے لائق ہو۔ پس اُس نے اُن کے اخراجات کے لئے بڑی ہی فیاضی ظاہر کی۔ یعنی دونوں کو بتیس بتیس جوان لونڈیاں اور غلام عنایت کئے کہ اُن کو مخا میں بیچ کر جو روپیہ اس مبارک تدبیر سے ہاتھ آئے اُس کو معاملات سفارت میں خرچ کریں۔ واہ واہ کتنی بڑی فیاضی ہے کیونکہ مخا میں جوان لونڈی غلام بحساب اوسط پچیس یا تیس کراؤن[2] قیمت پاتا ہے۔ ان کے علاوہ نہایت ہی چھانٹ کر پچیس غلام خاص اورنگ زیب کے لئے بھیجے تھے جن میں

---

[1] اس کا نام عالمگیر نامہ میں سیدی کامل لکھا ہے اور دوسرے شخص کا اس کتاب میں کچھ ذکر نہیں ہے۔ س م ح

[2] چونکہ ایک کراؤن پانچ شلنگ کا ہوتا ہے جو انگلستان کا ایک چاندی کا سکہ اور ہندوستان کی اس وقت کی اٹھنی کے برابر ہے۔ پس اس حساب سے ان غلاموں کو قریب ڈھائی ہزار روپیہ کی قیمت کا سمجھنا چاہئے۔ س م ح

تو یا دس بہت کم سن اور خوجہ بنانے کے قابل تھے۔ واہ کیا کہنا ہے ایک عیسائی بادشاہ نے ایک مسلمان بادشاہ کے لئے کیا ہی مناسب تحفہ بھیجا تھا! جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتھوپیا میں مذہب عیسوی کی کیا حالت ہے۔ ان کے علاوہ شہنشاہ مغل کے لئے پندرہ حبشی گھوڑے جو عربی گھوڑوں کے برابر سمجھے جاتے ہیں اور چھوٹی قسم کا ایک[1] خچر جس کی کھال میں نے بھی دیکھی تھی جو ایسی خوبصورت تھی کہ کسی شیر کے بھی ایسے خط وخال نہیں ہوتے اور نہ ہندوستان کے کسی الاچہ میں جو ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا ہے ایسی خوش نما اور طرح طرح کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اور ہاتھی کے دو دانت جو معمول سے زیادہ ایسے بڑے اور بھاری تھے کہ ایک مضبوط شخص اُن میں سے ایک کو زمین سے بمشکل اٹھا سکتا تھا اور بیل کا ایک بہت بڑا سینگ جس میں سیویٹ[2] بھری ہوئی تھی اور جس کا قطر منہ کی طرف سے نصف فٹ فرانسیسی سے زیادہ میرے ناپنے میں آیا تھا ان سفیروں کو سپرد ہوئے تھے۔

یہ دونوں ایلچی جب ایسے شاہانہ اور فیاضانہ طور پر سازو سامان سے دُرست کئے جاکر گونڈار سے جو ملک حبش کا پایۂ تخت اور صوبہ ڈیمبیا میں ہے روانہ کیے گئے تو اُن کو ایک ویران ملک میں سے گذرنا پڑا۔ اور بہلول تک پہنچنے میں جو باب المندب کے قریب مخا کے مقابل ایک غیر آباد بندر گاہ ہے دو مہینے لگے۔ ان لوگوں کے کارواں کے مقررہ راستہ سے جو چالیس روز میں بآسانی طے ہو جاتا ہے آرکیکو کو جانے کی جرأت نہ کرنے کا یہ باعث تھا کہ آرکیکو سے جزیرہ مصوع کو جانا پڑتا ہے۔ جہاں سلطنت ٹرکی کی کچھ فوج رہتی ہے۔ جب کہ یہ لوگ بحر احمر سے عبور کرنے کی خاطر مخا کو جانے والے جہاز کے انتظار میں بہلول میں ٹھیرے ہوئے تھے اشیائے مایحتاج کے موجود نہ ہونے سے بہت تکلیف میں رہے اور کئی غلام مرگئے اور اس کے سوا مخا میں پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ اب کی دفعہ بردے بہت کثرت سے آئے ہیں اور اس لئے جو لونڈیاں

---

[1] غالباً زیبرا مراد ہے جو چھوٹے ٹٹو جیسا ہوتا ہے اور جس کی کھال نہایت خوبصورت دھاری دار ہوتی ہے عموماً افریقہ سے برآمد کیا جاتا ہے۔

[2] سیویٹ مشک وغیرہ خوشبودار حیوانی مادوں کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر خصوصیت کے ساتھ اُس خوشبودار اور بہت گاڑھی چیز کو کہتے ہیں جو مشک بلائی کی دم کے نیچے ایک تھیلی میں چربی کے طور کی ہوتی ہے (ماخوذ از امپیریل ڈکشنری) س م ح

غلام باقی رہ گئے تھے وہ بھی کم قیمت پر بیچنے پڑے۔ بہرحال جب لونڈی غلام بک چکے تو اُنھوں نے اپنا سفر پھر شروع کیا اور ایک ہندوستانی جہاز پر سوار ہوکر جو سورت کو آتا تھا۔ پچیس دن کے عرصے میں جو اس سفر کے لئے چنداں زیادہ نہ تھا منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ مگر بہت سے گھوڑے اور کئی ایک غلام غالبًا کافی خوراک نہ ملنے سے مرگئے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس باشان وشوکت سفارت کے پاس اتنا روپیہ کہاں تھا جو خرچ کے لئے کفتی ہوتا۔ اور جہاز ہی میں وہ بے چارہ خچر بھی مرگیا۔ لیکن یہ اُس کی کھال حفاظت سے لیتے آئے۔ جس کو میں نے بھی دہلی میں دیکھا تھا۔

ان کو سورت میں پہنچے ہوئے چند ہی گھنٹے گذرے تھے کہ بیجا پور کے ایک مشہور باغی نے جس کا نام سیواجی ہے شہر کو آکر لوٹ لیا اور آگ لگادی اور اس عام آتش زدگی میں اگرچہ وہ مکان بھی جہاں یہ ٹھیرے ہوئے تھے جل گیا مگر آگ اور دشمن دونوں کے ہاتھ سے جس طرح بن پڑا اُن کی سفارت کی سندیں اور وہ چند غلام جو کسی وجہ سے یا تو سیواجی کے ہتھے نہ چڑھے یا جن کو بیمار دیکھکر اُس نے خود ہی چھوڑ دیا اور ان سفیروں کے حبشی لباس جو اُس کو پسند نہ آئے اور وہ خچر کا چمڑہ جس کی اُس نے کچھ پروا نہ کی اور وہ بیل کا سینگ جس کو سیویٹ سے پہلے ہی خالی کرچکے تھے۔ بچ رہے۔

ان عالی شان سفیروں نے اپنے لُٹ جانے کی نسبت بڑے بڑے مبالغے کئے مگر بدگمان ہندوستانی جنھوں نے ان کو جہاز سے اُترتے وقت اس حالت میں دیکھا تھا کہ نہ تو اچھا لباس ولپوشاک ہی تھی اور نہ روپیہ یا کسی مہاجن کے نام کی ہنڈی ہی پاس تھی بلکہ فاقوں کے مارے نیم مردہ ہورہے تھے یہ کہتے تھے کہ فی الواقع یہ تو ان کی خوش نصیبی تھی۔ کہ سورت کے لُٹنے اور جلائے جانے کے باعث یہ اُس ذلت سے بچ گئے جو ان کو اپنے ذلیل اور ناچیز تحائف کے دہلی تک لانے میں اُٹھانی پڑتی۔ اور سیواجی کی بدولت ان کو سورت کے صوبہ دار کے سامنے فقیرانہ حالت میں جانے اور دارالسلطنت تک پہنچنے کے لئے خرچ سواری مانگنے کا ایک عمدہ بہانہ ہاتھ آگیا اور غلام اور سیویٹ بیچ کر کھا جانے کے الزام سے بھی بری رہے[1]

---

[1] حبش کی سفارت ممکن ہے ایسی شان دار نہ ہو جیسی دوسری سفارتیں لیکن برنیئر کا اس حقارت کے ساتھ مذاق اُڑانے کا اصل سبب وہی مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب ہے۔ جو رومن کیتھولک گرجا کا خصوصی وصف

میرے لائق دوست ڈچوں کے کارخانہ کے مختار مسٹر ایڈریکین نے مراد کو میرے نام کی ایک سفارشی چٹھی دی تھی جو اُس نے دہلی میں آکر مجھے دی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانچ چھ برس بعد اُس سے اس طرح پھر ملاقات ہوئی۔ وہ اِس بات کو بالکل بھول گیا تھا کہ میں مخا میں اُسی کے ہاں ٹھیرا تھا۔ میں اپنے پُرانے دوست سے بغل گیر ہوا اور وعدہ کیا کہ حتی الوسع میں تمھاری مدد کروں گا۔ اگرچہ اہل دربار میں میری بہت کچھ رسائی اور ملاقات تھی مگر ان تہی دست ایلچیوں کی امداد ایک مشکل کام تھا۔ کیونکہ بجز خچر کے اُس چھڑے اور بیل کے اُس سینگ کے جس میں اُنھوں نے اپنے پینے کے لئے قندی شراب جو اُن کو بہت مرغوب ہے بھر رکھی تھی اور کچھ باقی نہ تھا اور بیش قیمت تحائف کے موجود نہ ہونے سے لوگوں کی نظروں میں جو اُن کی حقارت تھی اُس کو اُن کی ظاہری ذلیل حالت نے اور بھی بڑھا دیا تھا اور وہ بدووں کا سا لباس پہنے ہوئے پالکی کے بغیر پاپیادہ شہر میں پھرا کرتے تھے اور سات آٹھ غلام سروپا برہنہ پیچھے پیچھے ہوتے تھے جن کے پاس سوائے ایک مکروہ چھوٹے سے تہ بند اور ایک پھٹی پُرانی چادر کے جسے بائیں کاندھے پر ڈال کر داہنے بازو کے نیچے سے نکالے ہوتے تھے کوئی پوشاک اور لباس نہ تھا اور بجز ایک ٹوٹی پھوٹی کرایہ کی بہلی اور ایک گھوڑے کے جو ہمارے پادری صاحب کا تھا اور کوئی گھوڑا بھی ان کے پاس نہ تھا۔ یا کبھی کبھی میرا گھوڑا مانگ لیتے تھے جس کو انھوں نے سواری لے لے کر قریب المرگ کر دیا تھا۔ پس ہر چند میں نے ان ذلیل اور حقیر سفیروں کے لئے بہت کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا کیونکہ لوگ اُن کو فقیر سمجھکر کچھ ملتفت نہ ہوتے تھے۔ لیکن بہرحال ایک روز جبکہ میں اپنے آغا دانشمند خاں کے پاس (جو ممالک غیر کے معاملات کا وزیر ہے) خلوت میں بیٹھا تھا میں نے شاہ اتھوپیا کی شان و عظمت کا ذکر ایسی آب وتاب سے کیا کہ اورنگ زیب ان کو اپنے حضور میں بُلانے اور خریطہ کے قبول کرنے پر مائل ہو گیا۔ اور جب یہ حاضر ہوتے تو دونوں کو زربفت کا ایک ایک "سراپا" اور ریشمی زری کار پٹکا اور مندیل عنایت کی اور مراسم مہمان داری کے لئے بھی حکم ہو گیا۔ اور چند ہی روز بعد جب رخصت کئے گئے تو پھر ایک ایک "سراپا" معہ چھ ہزار روپیہ نقد کے مرحمت ہوا مگر یہ روپیہ مساوی طور پر نہ دیا گیا تھا بلکہ مسلمان کو چار ہزار اور مراد کو عیسائی ہونے کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ بڑھتے اور جیسا کہ وہ خود آغاز کتاب میں ذکر کر آیا ہے حبشہ سے اس عیسائی فرقہ کو نکال دیا گیا تھا۔

وجہ سے صرف دو ہزار ملا۔

اور اُن کے آقا کے لئے بطور تحفہ ایک نہایت بھاری "سراپا" اور چاندی کے ملمع کی دو شہنا ئیاں اور دو چاندی کے نقارے اور یاقوت کے جڑاو قبضہ کا ایک خنجر اور بیس ہزار روپیہ نقد عنایت ہوا۔ اور چونکہ ملک حبش میں سکہ کا چلن نہیں ہے اس لئے اورنگ زیب نے براہ مہربانی یہ فرمایا کہ امید ہے یہ نقد تحفہ خصوصیت کے ساتھ قبولیت کے لایق ہوگا۔ اور ایک اعجوبہ چیز خیال کیا جائے گا۔ مگر شہنشاہ مغل خوب جانتا تھا کہ ان میں سے ایک روپیہ بھی ہندوستان سے باہر نہ جائے گا اور یہ لوگ اُس سے کارآمد جنسیں خرید لیں گے۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا اور انھوں نے اس روپیہ سے کچھ تو گرم مصالحے لے لئے اور کچھ مہین سوتی کپڑے کے تھان بادشاہ اور ملکہ اور ولی عہد کے پیراہنوں کے لئے اور الاچے جو ایک ریشمی دھاری دار کپڑا ہے اور سنہری یا روپہلی زری ملا کر بنایا جاتا ہے قبا اور پاجامے بنانے کی خاطر خرید لئے۔ اور بادشاہ کی دو عباؤں کے لئے جو عربوں کا ایک لباس ہے سرخ اور سبز رنگ کی انگریزی بانات اور ان کے سوا بہت سا کپڑا مگر دونا کم قیمت محل سرا کی معزز عورتوں اور اُن کے بال بچوں کے لئے خریدا۔ اور سفارت کی وجہ سے اس تمام اسباب کا محصول تو معاف ہی تھا۔

اگرچہ مراد میرا بہت دوست تھا مگر تین باتوں کی وجہ سے مجھے اُس کے حق میں کوشش کرنے سے پشیمانی ہوئی۔ ایک یہ کہ اُس نے باوجود وعدہ کرنے کے کہ "میں اپنے بیٹے کو تمھارے ہاتھ پچاس روپیہ میں بیچ ڈالوں گا۔ کہلا بھیجا کہ تین سو روپے سے کم کو نہیں دوں گا۔ اور میں اس پر بھی راضی تھا کہ تین سو ہی دے کر خرید لوں تاکہ یہ کہنے کی گنجائش رہے کہ ایک شخص نے خاص اپنا بیٹا میرے پاس بیچ ڈالا تھا۔ یہ لڑکا خوب تازہ توانا اور سڈول بدن کا تھا اور رنگ بھی خوب صاف سیاہ تھا۔ اور حبشیوں کی طرح ناک بھی چپٹی نہ تھی اور نہ ہونٹ ہی موٹے تھے۔ مگر چونکہ اُس کے باپ نے وعدہ خلافی کرکے مجھے نہ دیا تو اس سے میں بہت ہی ناخوش ہوا۔

دوسری یہ کہ اس نے اور اس کے مسلمان رفیق نے اورنگ زیب سے پختہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنے بادشاہ سے اُس مسجد کی مرمت کی بالضرور اجازت لے دیں گے جو پرتگیزوں کے وقت سے ویران اور کھنڈر پڑی تھی۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اُس کی مرمت کے لئے بھی

دو ہزار روپیہ ان کو حوالہ کیا۔ یہ مسجد ایک شیخ یا درویش کے مقبرے کے طور پر بنائی گئی تھی جو مکہ سے ملک حبش میں صرف اس غرض سے چلا گیا تھا کہ وہاں دین اسلام پھیلائے اور یہ اُن پرتگیزوں نے مسمار کر دی تھی جو گوا سے فوج لے کر اُس ذی حق بادشاہ کی مدد کو آگئے تھے جو عیسائی ہو گیا تھا اور جس کو خارج کر کے ایک مسلمان شاہزادہ تخت پر ہو بیٹھا تھا۔

تیسری یہ کہ اُس نے شاہ حبش کی طرف سے اورنگ زیب سے یہ درخواست کی کہ ایک قرآن اور آٹھ اور کتابیں (جن کے نام سے بھی میں واقف ہوں اور جو اُن کتابوں میں اول درجے کی مشہور ہیں جو مذہب اسلام کی تائید میں تصنیف ہوئی ہیں) عنایت ہوں اور میری رائے میں ایک عیسائی بادشاہ کے ایک عیسائی سفیر کا ایسا کرنا ایک نہایت ہی ذلیل اور معیوب امر تھا۔ اور مخا میں جو کچھ میں نے سُنا تھا کہ حبش میں دین عیسوی کی کیسی متبذل حالت ہے اس سے اُس کی بخوبی تصدیق ہو گئی۔

بے شبہ اس بادشاہ کی حکمرانی کے تمام طور و طریق اور رعیت کے اوضاع و اطوار سے اسلام کی بو آتی ہے اور بے شک جب سے وہ بادشاہ مر گیا ہے جس کو پرتگیزوں نے اپنی فوج کی مدد سے تخت پر بٹھایا تھا جو لوگ کہ صرف نام کے عیسائی ہیں اُن کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ بابت یہ ہے کہ اس بادشاہ کے مرتے ہی اُس کی ماں کی فتنہ پردازیوں سے پرتگیز کچھ تو مارے گئے اور کچھ نکال دیے گئے اور فرقہ جیسوئٹ کے پیٹری آرک یعنی بڑے پادری کو جسے اُس کے ہم وطن پرتگیز گوا سے لائے تھے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

دریائے نیل کا دہانہ

جس زمانہ میں یہ سفیر دہلی میں تھے میرے آغا دانشمند خاں جو نئی معلومات کا ہمیشہ سے شائق ہے ان کو اکثر اپنے ہاں بُلا کر اُن کے ملک اور طریق حکمرانی کی بہت سی باتیں پوچھتا رہتا تھا لیکن اُس کا اصل مدعا یہ تھا کہ دریائے نیل کا مخرج معلوم کرے۔ یہ لوگ دریائے نیل کو اباآبیل کہتے ہیں اور اُن کا قول ہے کہ اُس کا مخرج بخوبی معلوم ہے چنانچہ مراد اور ایک مغل نے جو اُس کا ہم سفر تھا بالاتفاق بیان کیا کہ ہم نے اُس مقام کو دیکھا ہے اور انھوں نے جو کچھ کہا وہ بعینہ وہی تھا جو میں نے مخا میں سُنا تھا۔ یعنی یہ کہ اُس کا مخرج ملک اگوس میں ہے اور وہ قریب قریب دو جوش مارنے والے چشمے ہیں جو باہم مل کر تیس یا چالیس قدم کے طول کی ایک چھوٹی سی جھیل بن

جاتے ہیں۔ اور جو پانی اس جھیل سے نکلتا ہے اگرچہ وہ خود بھی ایک اچھے خاصے دریا کے موافق ہے۔ مگر آئندہ چھوٹے چھوٹے بہت سے ندی نالوں سے جو قدم قدم پر اُس سے آکر ملتے جاتے ہیں بڑھتا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ دریا اس طرح پر چکر کھا کر بہا ہے کہ بیچ میں ایک بڑا جزیرہ بن گیا ہے۔ اور کئی ایک سیدھی چٹانوں پر جنبرے ہیں اور گھڑیال بھی کثرت سے ہیں۔ اور بشرطیکہ سچ ہو ایک اور جانور اُس میں بتایا جو بہت ہی اعجوبہ ہے یعنی ایک دریائی بچھڑا جس کے منہ کے سوا فضلہ کے خارج ہونے کے لئے اور مخرج ہی نہیں ہے۔ اور یہ جھیل ڈیمبیا کے ملک میں گونڈار سے تین مختصر منزلوں اور نیل کے مخرج سے چار یا پانچ دن کے سفر کے فاصلہ پر بتائی اور کہا کہ جب یہ دریا اس جھیل سے نکل کر آگے کو بڑھتا ہے تو بہت سے دریاؤں اور برساتی نالوں کی وجہ سے جو اس جھیل میں آکر گرتے ہیں اس کا پاٹ بہت بڑھ جاتا ہے خصوصًا برسات میں جو ہندوستان کی طرح یہاں بھی ایک معین موسم ہے اور تقریبًا جولائی کے اخیر سے شروع ہوتا ہے۔

میرے نزدیک یہ آخری بات ایک طرح سے اہم اور قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ اس سے اس دریا کی طغیانی کی وجہ معلوم ہوتی ہے اور اُنھوں نے کہا کہ دریا اس جھیل سے نکل کر جس کا ابھی ذکر ہوا شہر سے نار کی طرف جاتا ہے جو فن جی، کا پائے تخت ہے جو شاہ الحقوپیا کا ایک باج گزار ملک ہے اور اسی طرح آگے کو بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آخرکار مصر کے میدانوں میں جا پہنچتا ہے۔ ان سفیروں نے اپنے بادشاہ کی شان و شوکت اور فوجی قوت کا حال اس قدر بڑھا کر بیان کیا کہ مجھے اور دانشمند خاں دونوں کو ناپسند ہوا۔ مگر ان کا وہی رفیق سفر مغل اس مدح سرائی میں شریک نہ تھا۔ اور ان کی غیبت میں اُس نے ہم سے کہدیا کہ میں نے دو دفعہ وہاں کی فوج کو عین میدان اور ایسے وقت میں دیکھا ہے جب کہ خود بادشاہ اُس سے کام لے رہا تھا اور میرے خیال میں کسی فوج کی اُس سے زیادہ شکستہ حالی اور بے انتظامی ممکن نہیں اور ایسے ہی اور بہت سے حالات اُس ملک کے ہم کو سُناتے جو سب میرے روزنامچے میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور اُمید ہے کہ کسی دن لوگوں کی اطلاع کے لئے میں اُن کو چھپوا سکوں گا۔ اور بالفعل میں صرف تین چار ہی باتوں کے لکھنے پر جو مراد

نے ہم سے بیان کی تھیں قناعت کرتا ہوں۔ اور چونکہ وہ ایسی سرزمین سے علاقہ رکھتی ہیں جو عیسائیوں کا ملک سمجھا جاتا ہے اس لیے نہایت تعجب کے لایق ہیں۔ چنانچہ اُس نے بتایا کہ حبش میں چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جن کی کئی کئی بیویاں نہ ہوں۔ اور بغیر کسی طرح کے شرم و لحاظ کے خود اپنی بابت بھی کہدیا کہ منکوحہ بیوی کے سوا جو حلب میں ہے دو بیویاں اور بھی ہیں اور بیان کیا کہ جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی بھی عورتیں پردہ میں رہتی ہیں حبش میں نہیں رہتیں اور غریب گھرانوں کی عورتیں خواہ بیاہی ہوں یا کنواری اور لونڈی ہوں یا آزاد رات دن ایک ہی مکان میں باہم رہتی ہیں اور رشک و حسد کے خیالات جو اور قوموں کی عورتوں میں عموماً ہوتے ہیں — یہ جانتی بھی نہیں۔ اور بڑے بڑے امیروں کے گھروں کی عورتیں اور اُن کی بیویاں اگر کسی خوبصورت سوار سپاہی پر طبیعت آجاتے تو اُس کے چھپانے کی چنداں پروا نہیں کرتیں بلکہ جب چاہتی ہیں بے خوف و خطر اُس کے گھر چلی جاتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر تم وہاں جاتے تو خواہی نخواہی شادی کرنی ہی پڑتی۔ چنانچہ چند سال ہوئے کہ ایک یورپین درویش کو جس نے اپنے تئیں ایک طبیب باشندہ یونان ظاہر کر رکھا تھا زبردستی شادی کرادی گئی اور لطف یہ کہ جس عورت کو اُس نے اپنے بیٹے کی شادی کے لئے تجویز کیا تھا اُسی سے اس کا نکاح پڑھوادیا گیا اور ایک قصہ یہ سُنایا کہ ایک اسّی برس کے بڈھے نے اپنے چوبیس بیٹے جوان اور ہتھیار باندھنے کے قابل تھے بادشاہ کے روبرو پیش کئے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا تیرے صرف اتنے ہی لڑکے ہیں؟ جب اُس نے عرض کیا کہ ہاں لڑکے تو اتنے ہی ہیں مگر چند لڑکیاں بھی ہیں۔ تو بادشاہ نے جھنجھلا کر کہا کہ "او بڈھے بیل میرے سامنے سے دور ہو! مجھکو تعجب آتا ہے کہ شرمندہ ہونے کی جگہ تو شیخی بگھارتا ہے۔ کیا ہمارے مُلک میں عورتوں کا کال پڑ گیا ہے کہ تیری سی عمر کا آدمی صرف دو درجن لڑکوں کے باپ ہونے پر اتراتا ہے"

اور اُس نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کے کم سے کم اسّی لڑکے بالے ہیں جو محل میں جدھر دیکھو وہی دوڑتے پھرتے نظر آتے ہیں اور اُن کی یہ پہچان ہے کہ ہر ایک کے پاس بادشاہ کی دی ہوئی ایک گول رنگین چھڑی ہوتی ہے جس کو بہ نسبت اور لڑکوں کے مولانے لئے سیب[1]

---

[1] یورپ میں دستور ہے کہ دربار وغیرہ جلوس کے موقعوں پر بادشاہ ایک عصا ہاتھ میں لئے رہتے ہیں جس کو

کی طرح باعث امتیاز سمجھ کر خوشی خوشی ہاتھ میں لئے پھرا کرتے ہیں۔

میرے آغا کی طرح اورنگ زیب نے بھی دو دفعہ ان سفیروں کو اس اُمید سے اپنے حضور میں بلایا کہ اُن سے اُن کے ملک کے کچھ حالات معلوم ہوں۔ مگر اُس کی زیادہ تر غرض یہ معلوم کرنا تھا کہ دین اسلام کی وہاں کیا حالت ہے۔ اور وہ خچر کی کھال بھی منگوا کر دیکھی جو نہ معلوم کس طرح قلعہ ہی میں بادشاہی عہدہ داروں کے پاس رہ گئی اور مجھے اُس کے حاصل ہونے کا ارمان ہی رہ گیا۔ کیونکہ اُنھوں نے میری کارگزاری کے صلہ میں اُس کے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور میں یہ خیال کرکے کہ کسی دن اپنے ملک میں پہنچ کر عجیب چیزوں کے کسی شوقین شخص کی نذر کرسکوں گا۔ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔ اور میں نے ان سفیروں کو بہت تاکید سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کھال کے ساتھ بادشاہ کو وہ سینگ بھی ضرور دکھانا مگر انھوں نے اس خوف سے اُس کو پیش نہ کیا کہ مبادا ہم سے یہ پوچھا جائے کہ سورت کی لوٹ میں جب یہ بچ رہا تو اس کے اندر کی خوشبودار چیز کہاں گئی اور پھر ہم اس کا کیا جواب دیں گے۔

شاہزادوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ شاہِ حبش کے سفیر ابھی دہلی ہی میں تھے کہ اورنگ زیب نے اپنے دربار کے خاص خاص اُمرا اور علما کو اس مشورے کے لئے جمع کیا کہ اپنے تیسرے لڑکے سلطان اکبر کی تعلیم و تربیت کے لئے جس کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا ایک اتالیق تجویز کرے۔ اور اُن سے فرمایا کہ میری بڑی آرزو ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت ایسی کی جائے کہ جس سے کامل توقع اس امر کی ہوسکے کہ ہر طرح کی لیاقتوں کے لحاظ سے یہ لڑکا مشہور آفاق ہو۔ چنانچہ میری رائے میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس امر سے واقف نہیں کہ شاہزادوں میں ہر ایک طرح کے ہنر اور مفید علوم کا موجود ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ اِن کے آئندہ فرماں روا اور حاکم بننے کی توقع رہتی ہے۔ اُس کا قول ہے کہ جس طرح سے باعتبار اپنے مرتبے اور اختیار کے ان کو اور لوگوں پر فضیلت ہے۔ اسی طرح لازم ہے کہ دانائی اور صفات حمیدہ میں بھی اُن سے افضل ہوں۔ اور وہ خوب جانتا ہے کہ ممالک ایشیا میں جو آفتیں اور مصیبتیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: رائل سیپ ٹرینی عصائے شاہی کہا جاتا اور تخت و تاج وغیرہ کی طرح ایک بادشاہی علامت سمجھا جاتا ہے۔ س م ع رای۔ س۔ ے پ ٹ ر۔

سلطنتوں پر پڑا کرتی ہیں اور وہ بدعملی اور بدانتظامی جس سے آخرکار وہ برباد اور تباہ ہوجاتی ہیں اس کا باعث اگر ڈھونڈا جائے تو ہمیشہ یہی نکلے گا کہ شاہزادوں کی تعلیم و تربیت ناکافی اور بُرے طور پر ہوتی ہے کیونکہ وہ بچپن ہی سے عورتوں اور خواجہ سراؤں یا اُن غلاموں کے سپرد رہتے ہیں جو ملک روس اور سرکیشیا اور منغولستان اور گرجستان اور حبش سے آتے ہیں اور کمبخت غلامی کا یہ خاصہ ہی ہے کہ اس سے عقل و تمیز خراب اور یہ عادت ہوجاتی ہے کہ اپنے سے زبردستوں کے سامنے بہت ہی عجز اور فروتنی سے پیش آتے اور کمزوروں اور ماتحتوں پر خواہ مخواہ زور و زیادتی جتاتے ہیں۔ پس یہ شاہزادے جب محلوں میں سے نکل کر تخت نشین ہوتے ہیں تو وہی ظالمانہ اور خراب عادتیں جو سیکھی ہوئی ہوتی ہیں ساتھ لے آتے ہیں اور اُن فرائض سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں جو اُن کی اس نئی حالت کے لئے لازمی ہیں اور اپنی زندگانی کے اس تماشا گاہ میں اس طرح خلائق کے سامنے آتے ہیں کہ گویا کسی اور ہی دنیا سے آتے ہیں اور ہر ایک چیز کو ایسے بھولے پن اور حیرانی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گویا کسی اندھیری کوٹھری یا تہ خانے میں سے آج ہی پہلے پہل نکلے ہیں۔ اور یا تو بچوں کی طرح ہر بات پر یقین کر لیتے یا ہر چیز سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں یا ایسے ہٹیلے اور بے پروا اور احمق ہوتے ہیں کہ معقول صلاح اور مشورہ کی بات کو سنتے ہی نہیں اور کیسا ہی خراب کام کیوں نہ ہو اُس کے کر بیٹھنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے اور تخت پر بیٹھکر یا تو اپنی جبلی طبیعت اور مزاج کے سبب سے یا اُن خیالات کی وجہ سے جو پہلے سے اُن کے دل میں جانشین ہوجاتے ہیں ایک مصنوعی وقار اور تمکنت دکھاتے ہیں مگر ہر کسی کو باسانی معلوم ہوجاتا ہے کہ اصل سنجیدگی اور وقار اُن میں نام کو بھی نہیں اور یہ ظاہرداری صرف کسی بُری سکھاوٹ کا اثر ہے جس کو بجائے متانت اور سنجیدگی کے ایک حیوانیت اور بیہودہ نمائش کہنا چاہیے۔ اور یا بہ تکلف ایک ایسی خوش خلقی اختیار کرتے ہیں جو بادشاہوں کی شان کے ہرگز لائق نہیں ہوتی اور بناوٹی ہونے کی وجہ سے مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ پس ایسا کون شخص ہے جو ممالک ایشیا کی تاریخ سے واقف ہو اور میرے اس بیان کی صحت سے جو ایشیائی شاہزادوں کی حالت کی ایک ٹھیک تصویر ہے انکار کر سکے اور میں پوچھتا ہوں کہ کیا ممالک ایشیا کے بادشاہ آنکھیں بند کر کے حیوانوں کی سی بے رحمیاں نہیں کرتے رہے۔

اور اُن کی بے رحمی کیا کبھی کسی معین طریقہ پر ہوتی تھی؟ اور کیا وہ مطلقاً نامنصفانہ نہ تھی۔ اور کیا وہ بے شراب خواری کی ذلیل اور کمینہ عادت میں مبتلا اور بغیر کسی طرح کی شرم کے عیاشی و شہوت پرستی میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں اور حرموں کی صحبت میں اپنی تندرستی اور عقل بالکل غارت اور برباد نہیں کرتے۔ اور کیا انھوں نے سلطنت کے کاروبار کے عوض اپنا تمام وقت سیر و شکار ہی میں نہیں کھویا؟ اور اگرچہ ان بے درد بادشاہوں کو اپنے شکاری کتوں سے بہت محبت ہوتی ہے اور اُن کی غور و پرداخت کا بہت خیال کرتے ہیں مگر اُن بے چارے غریب لوگوں کی مصیبتوں کی جو شکار میں ساتھ جانے کے لئے بیگار میں پکڑے جاتے اور گرمی اور سردی کی شدت اٹھاتے اور بھوک اور تکان سے مرجاتے ہیں ان کو مطلقاً پروا بھی نہیں ہوتی۔

الغرض ایشیائی بادشاہ نہایت ہی ہولناک بدعادتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور جیساکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اُن کی یہ خراب عادتیں انواع و اقسام کی ہوتی ہیں۔ اور اس اختلاف کا سبب یا تو اُن کا طبعی میلان ہوتا ہے یا وہ خیالات ان کا باعث ہوتے ہیں۔ جو ابتدائے عمر سے اُن کی طبیعت میں بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی بادشاہ ایسا ہوتا ہے جو اپنی سلطنت کے اندرونی اور پولیٹیکل امور سے بدرجہ غایت ناواقف نہ ہو۔ وہ اپنی سلطنت کی باگ اکثر کسی وزیر کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں جس کا منصوبہ یہ ہوتا ہے کہ خود مختارانہ اور بلا روک ٹوک اور بغیر کسی طرح کے خوف و خطر کے حکومت کرنے کی غرض سے حقیر اشغال میں اپنے آقا کے مبتلا رہنے کی اور بھی تائید کر کے اُس کی طبیعت کو امور سلطنت کی واقفیت سے باز رکھتا ہے۔ اور اگر وزیر اعظم امور سلطنت کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا تو بادشاہ کی ماں جو اصل میں کوئی لونڈی باندی ہوتی ہے۔ اور کچھ خواجہ سرا ملک پر حکومت کرتے ہیں۔ جن کی تدبیریں وسیع اور آزادانہ خیالات پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ ہمیشہ بے رحمانہ جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے ہم جنسوں میں سے کسی کو پھانسی دیں اور کسی کو قید یا جلاوطن کریں۔ اور ہم جنسوں پر ہی کیا منحصر ہے۔ یہی سلوک وہ اکثر اوقات بڑے بڑے امرا بلکہ خود وزیروں کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ اور فی الواقع اُن کے تسلط کے زمانہ میں جو سلطنت کے لئے شرم کا موجب ہوتا ہے کسی شخص کی زندگی۔ جو کچھ بھی مال و دولت رکھتا ہو ایک دن کے لئے بھی محفوظ نہیں ہوتی۔

شاہِ ایران کے سفیر کی آمد اورنگ زیب کے حضور میں مذکورہ بالا ملکوں کے سفیر جب حاضر ہو چکے تو آخر کار دربار شاہی میں یہ خبر پہنچی کہ ایران کا سفیر بھی سرحد پر پہنچ گیا ہے اور یہاں کے ایرانی امرا اور اہلِ ایران نے یہ مشہور کر دیا کہ نہایت ہی اہم معاملات اس کے آنے کے باعث ہوتے ہیں۔ لیکن سمجھ دار لوگوں نے اس پر بالکل یقین نہیں کیا کیونکہ اہم معاملات کا وقت گذر چکا تھا۔ اور یہ بات ظاہر تھی کہ ان لوگوں کے ایسا مشہور کرنے کا سبب بجز اُس بیہودہ خواہش کے کہ اپنے ملک کی عظمت واقتدار کا اظہار کریں اور کچھ نہ تھا۔ اُن کا یہ بھی ادعا تھا کہ جو امیر اس کے استقبال اور تواضع وتکریم کے واسطے مامور ہوا ہے اُس کو بتاکید یہ فہمائش ہوئی ہے کہ جس طرح ممکن ہو دہلی پہنچنے سے پہلے سفیر کے آنے کا اصل مدعا دریافت کرے۔ اور اُس کو یہ بھی ہدایت ہوئی ہے کہ اس مدمغ سفیر کو رفتہ رفتہ اس امر پر مائل کردے کہ وہ دربار میں ہندوستان کے قاعدہ کے موافق رسم تسلیمات بجا لائے اور اُس کو یہ بھی سمجھا دے کہ قدیم سے یہ دستور ہے کہ شاہ ایران کا نامہ بلاواسطہ کسی امیر کے خود بادشاہ کو نہیں دینا چاہیے۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اُس سے ظاہر ہو گیا کہ یہ سب لغو کہانیاں تھیں۔ اور جو مرتبہ خدا نے اورنگ زیب کو بخشا ہے وہ ایسی باتوں کا محتاج نہیں ہے۔

جب یہ سفیر دارالسلطنت دہلی میں پہنچا تو اُس کی تعظیم وتکریم کا اظہار مناسب طور پر کیا گیا یعنی جن بازاروں میں سے وہ ہو کر گذرا اُن پر سفیدی وغیرہ ازسرِنو کرائی گئی اور تین میل کے قریب دوروَیہ سواروں کی فوج صف بستہ کھڑی کی گئی اور بہت سے امرا معہ اپنے اپنے باجے گاجوں کے اُس کی سواری کے ساتھ تھے۔ اور قلعہ شاہی کے دروازہ میں پہنچتے ہی توپ خانہ سے سلامی ہوئی۔ اور اورنگ زیب اُس سے نہایت اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا اور اہل ایران کے طور پر اُس کے سلام کرنے سے ناخوش نہیں ہوا اور اُس کے ہاتھ سے شاہ کا خریطہ بھی بلاتردد لے لیا بلکہ بطور تعظیم اُس کو اپنے تاج کے قریب تک لے گیا۔ اور پھر ایک خواجہ سرا سے اُس کی مہر کھلوا کر نہایت متانت کے ساتھ ملاحظہ کیا اور حکم دیا کہ سفیر کو سراپا پہنایا جائے۔ چنانچہ قبائے زربفت اور مندیل اور ریشمیں زردی کارپٹکا عنایت ہوا۔ اور اس رسم کے بعد سفیر کو تحائف پیش کرنے کا اشارہ ہوا۔ چنانچہ پچیس[۲۵] ایسے خوبصورت گھوڑے جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے معہ زردوزی اور زربفت کی گردنیوں

کے ۔ اور بیس نہایت اعلیٰ نسل کے ایسے قوی اور قدآور اونٹ جن کو ہاتھی کے پاٹھے کہنا زیبا ہے اور بہت سے صندوق عمدہ گلاب اور ایک اور عرق کے جس کو بید مشک کہتے ہیں اور جو نہایت مفرح سمجھا جاتا ہے اور کمیاب چیز ہے ۔ اور پانچ چھ بڑے بڑے اور خوبصورت قالین اور کئی بہت ہی بڑھیا تھان زربفت کے جن پر نہایت باریک گلکاری کی ہوئی تھی اور ایسے سبک اور پاکیزہ وضع کے تھے کہ مجھے شک ہے کہ کبھی کوئی ایسی نفیس چیز یوریپ میں دکھائی دی ہو ۔ اور جڑاؤ قبضہ کے چار دمشقی خنجر اور چار مرصع پیش قبض اور پانچ یا چھ گھوڑوں کے بہت ہی خوبصورت ساز جن کو سب لوگوں نے خصوصیت سے پسند کیا ۔ اور واقع میں بہت ہی خوش نما اور قیمتی تھے ۔ اور جن پر چھوٹے چھوٹے موتیوں اور پُرانی کان کے فیروزوں سے نہایت ہی اعلیٰ قسم کی مرصع کاری کی ہوئی تھی پیش ہوئے اورنگ زیب نے سب چیزوں کو بڑے غور سے ملاحظہ کیا اور حاضرین دربار کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان عمدہ تحائف سے بہت ہی زیادہ بلکہ معمول سے بڑھکر خوش ہوا ہے۔ اُس نے ان چیزوں کی خوبی اور نفاست اور کمیابی اور شاہ کی اس مہربانی اور کشادہ دلی کی کہ کیسے کیسے بیش بہا تحفے بھیجے ہیں بار بار تعریف کی ۔ اور سفیر کو بڑے ذی رتبہ امرا میں جگہ دی اور اُس کے دور دراز سفر کا ذکر کرکے اس معزز اور عالی مرتبہ مہمان سے فرمایا کہ اس وقت آپ آرام کریں اور ہم آپ کو ملاقات کے لئے ہر روز بُلایا کریں گے ۔

یہ سفیر چار پانچ مہینے دہلی میں رہا اور اُس کے سب اخراجات بہت تکلف کے ساتھ خزانہ شاہی سے ادا ہوتے رہے ۔ اور امرائے دربار نے نوبت بہ نوبت بڑی بڑی ضیافتیں کیں ۔ اور بوقت رخصت بادشاہ نے ایک اور بھاری سراپا معہ کئی بیش بہا چیزوں کے عنایت کیا ۔ اور شاہ ایران کے لئے تحائف بھیجے جانے کی نسبت یہ تجویز ٹھیری کہ پیچھے سے اپنے سفیر کی معرفت بھیجے جائیں گے ۔ چنانچہ اس سفارت کے لئے ایک امیر[ل] مقرر بھی کیا گیا ۔

اگرچہ بہ نسبت اور سفیروں کے جو پہلے آچکے تھے اورنگ زیب نے اس سفیر کا بہت ہی اعزاز کیا اور دل سے خاطر و مدارات کی ۔ مگر اس پر بھی اُن ایرانیوں نے جو دہلی میں تھے یہ بات مشہور کردی کہ شاہ نے اپنے نامہ میں اورنگ زیب کو داراشکوہ کے

[ل] تربیت خاں کو بھیجا گیا تھا ۔ س م ع

قتل اور شاہجہاں کی قید کی بابت بہت ہی ملامت کی ہے اور لکھا ہے کہ جو سلوک تم نے اُن سے کیا ہے کوئی بھائی بھائی کے ساتھ اور کوئی بیٹا باپ کے ساتھ نہیں کر سکتا اور کسی ایمان دار مسلمان سے ہرگز ایسی حرکت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ اپنا لقب عالمگیر کیوں مقرر کیا ہے اور اُس کو سکہ پر کیوں منقش کرایا ہے۔ اور اس بات کو انھوں نے یہاں تک بڑھایا کہ خط میں صاف لکھا ہوا ہے کہ اگر آپ عالمگیر ہیں تو یہ گھوڑے اور یہ تلوار حاضر ہے۔ بسم اللہ آیئے ادھر سے ہم بھی آتے ہیں۔ میرے نزدیک اگر یہ بات سچ ہوتی تو شاہ ایران کی طرف سے گویا پیغام جنگ تھا۔ لیکن میں نے جیسا سُنا ویسا لکھ دیا ہے۔ اور اس کو میں غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس دربار کا راز ہر کسی کو معلوم ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ زبان سے واقفیت اور چند شخصوں سے ملاقات رکھتا ہو اور میری طرح عجائب باتوں کے دریافت کرنے میں دل کھول کر روپیہ خرچ کرنے کی بھی کچھ پروا نہ کرتا ہو لیکن میں تو آسانی سے ایسی بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ شاہ ایران نے ایسے الفاظ اپنے خط میں لکھے ہوں کیونکہ گو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایرانیوں کی یہ عادت ہے کہ جب کسی کو اپنا زور و طاقت جتانا چاہتے ہیں تو ایسی ہی تعلّی کیا کرتے ہیں۔ مگر ایسے لفظوں سے تو محض تعلّی اور شیخی ہی نہیں دھمکی کی بو بھی آتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ اکثر باخبر لوگوں کی یہ رائے ہے اور خود میرا بھی خیال یہی ہے کہ ایران میں یہ طاقت ہی کہاں ہے کہ ہندوستان جیسی سلطنت پر حملہ کرے اور اُس کو تو یہی غنیمت ہے کہ قندھار جو ایران کی عمل داری میں ہندوستان کی طرف سرحد پر ہے اُس کے قبضہ میں رہے یا یہ کہ اپنے ملک کو حدود سلطنت روم کی جانب سالم اور محفوظ رکھ سکے ایران کی سپاہ و دولت کا حال مدبّران سلطنت ہند کو خوب معلوم ہے۔ اور وہ واقف ہیں کہ وہاں کے تخت پر ہمیشہ شاہ عباس ہی نہیں ہے جو ایک نامور اور مدبر بادشاہ اور اس قابل تھا کہ جو معاملہ پیش آئے اُس کو اپنے ہی مدعا کے موافق بنالے اور بڑے بڑے منصوبے تھوڑے سے سامان سے انجام دے لے۔ اور اگر ایران کا ارادہ اس سلطنت پر کوئی مہم کرنے کا ہے اور حالیہ وارداتوں کی وجہ سے اُس کو اورنگ زیب کی نسبت اس قدر تنفر پیدا ہوا ہے تو وہ کیوں ان جان کاہ واقعات کو خاموشی اور بے غرضی کی نگاہ سے دیکھتا رہا جو اُن لڑائیوں میں پیش آئے

؎ شاہ عباس ماضی سے مراد ہے جو اکبر کا معاصر تھا اور شاہجہاں کے زمانہ تک فرماں روائے ایران رہا۔ م م ع

جو ہندوستان میں ہو رہی تھیں اور باوجودیکہ داراشکوہ اور شاہجہاں اور سلطان شجاع اور شاید صوبہ دار کابل بھی اُس سے امداد کے لئے ملتجی ہوئے۔ مگر اُس کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا حالانکہ وہ تھوڑی سی فوج سے ہندوستان کے ایک نہایت عمدہ حصہ پر یعنی کابل سے لے کر دریائے سندھ کے کنارے بلکہ اُس سے آگے تک قبضہ کر سکتا تھا اور اس طرح یہاں کے ہر ایک جھگڑے میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو ثالث بنا سکتا تھا۔

یا تو شاہ ایران کے خط ہی میں کوئی نا ملائم فقرہ تھا یا اورنگ زیب خود اس سفیر ہی کی کسی حرکت یا کسی گفتگو سے ناراض ہو گیا تھا جو اُس کے دہلی سے رخصت ہونے کے دو یا تین ہی روز بعد اُس نے اس امر کی شکایت کی کہ جو گھوڑے شاہ ایران کی طرف سے آئے ہیں سفیر نے اُن کے پچھلے پاؤں کی نسیں[1] کٹوا دی تھیں اور حکم دیا کہ اُس کو سرحد پر روک لیا جائے۔ اور تمام ہندوستانی لونڈی غلام جو وہ یہاں سے لے گیا ہے چھین لئے جائیں جن کی تعداد بلا شبہ بہت ہی زیادہ تھی اور قحط کی وجہ سے بہت ہی سستے اُس کے ہاتھ آ گئے تھے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس کے نوکر چاکر بہت سے بچوں کو چُرا کر بھی لے گئے تھے[2]۔

---

[1] اصلی انگریزی میں لفظ ہیم سٹرنگ ہے۔ جس کے معنی بموجب فن تشریح واصطلاح طبی رباط کے ہیں۔ س م ح

[2] اس سفیر سے اورنگ زیب کے ناراض ہو جانے کا ذکر کسی جگہ نظر سے نہیں گذرا مگر اُن حالات مندرجہ متن کی تشریح اُس وقت کی فارسی کتابوں سے یوں پائی جاتی ہے۔ جب سے شاہجہاں کے عہد سلطنت میں شاہ عباس ثانی نے قندھار ۱۰۵۹ھ ہجری میں عمال دولت ہندوستان سے دوبارہ چھین لیا تھا دونوں سلطنتوں کے باہم دوستانہ راہ و رسم بند تھی۔ مگر جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو شاہ موصوف نے ایلچی بھیجنے میں سبقت کر کے اس راہ و رسم کو پھر تازہ کیا۔ چنانچہ صاحب عالمگیر نامہ نے اس حال کو ۱۰۷۱ھ ہجری کے واقعات میں (جو اورنگ زیب کے تیسرے اور چوتھے سال جلوس کے مطابق تھا)۔ بہت تفصیل سے لکھا ہے اور چونکہ اُس سے سفیر کی مدارات کا طور و طریق معہ اور بہت سی درباری رسموں اور دلچسپ باتوں کے زیادہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے اس لئے اُس کا پورا ترجمہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔ وھوھذا

ان ایام میں وقائع صوبہ ملتان سے دریافت ہوا کہ والی ایران نے بھی بمقتضائے مصلحت و دانائی رسم اتحاد کے تازہ کرنے کے لئے بوداق بیگ تفنگچی آقاسی (یعنی بندوقچیوں کی فوج کے سردار) کو جو اُس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ امرائے دربار میں سے تھا "معہ تحائف و نامہ دوستانہ متضمن مبارکباد تخت نشینی" روانہ کیا ہے اور وہ قندھار سے گذر کر ملتان کے راستے دلی کو آتا ہے۔ اس لئے اورنگ زیب نے ابدال بیگ نامی اپنے ایک مقرب ملازم کو مامور کیا کہ استقبال اور مہمان داری کے لئے ملتان تک جائے چنانچہ اس شخص کو حسب معمول خلعت رخصت دے کر رجب کی پہلی تاریخ روانہ کیا گیا اور اسی کے ہاتھ بوداق بیگ کے لئے بھی ایک خلعت بھیجا گیا اور تربیت خاں حاکم ملتان اور خلیل اللہ خاں صوبہ دار "دارالسلطنت" لاہور اور اثنائے راہ کے سب حاکموں کو احکام بھیجے گئے کہ لوازم ضیافت و مہمان داری بجا لا کر اپنے اپنے مقدور کے موافق نقد و جنس سے بھی تواضع کریں۔ تیسری شعبان کو بوداق بیگ کے بھیجے ہوئے "خربزہ ہائے کاریز" اور کچھ اور میوے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے اور لانے والوں کو خلعت کے علاوہ ڈھائی ہزار روپیہ انعام مرحمت ہوا۔

بعد ازیں خبر آئی کہ بوداق بیگ آخر تاریخ شعبان کو ملتان پہنچ گیا اور تربیت خان نے ضیافت کے بعد پانچ ہزار روپیہ نقد اور ہندوستان کی ساخت کے نو پارچے بطور تحفہ اُس کو دیئے اور جب لاہور پہنچا تو خلیل اللہ خاں نے نہایت عمدہ ضیافت کی جس میں بڑے تکلف سے چارسو قابیں انواع و اقسام کے کھانوں کی اور سات سو خوان قسم قسم کے نُقلوں اور عطریات کے چنے گئے اور بیس ہزار روپیہ نقد اور ایک خنجر اور ایک تلوار جن کے ساز میناکار تھے اور سات کشتیاں ہندوستان کے بنے ہوئے نفیس کپڑوں کی تواضع کیں۔

اٹھارھویں رمضان کو بوداق بیگ کا ایک عریضہ لاہور سے اپنی روانگی کی اطلاع کے لئے پہنچا اور چونکہ اُس نے عریضہ کے ساتھ باز۔ جرہ۔ چرغ اور شاہین وغیرہ کچھ شکاری جانور بھی بھیجے تھے اس لئے لانے والوں کو خلعت عطا ہوئے۔

اٹھائیسویں رمضان کو جب بوداق بیگ باغ اعز آباد کے نزدیک بمقام سرائے باولی پہنچ کر ٹھیر گیا تو بادشاہ نے بغرض اظہار عنایت اُس کے لئے "الوش خاص" بھیجا۔ اور دربار میں حاضر ہونے کے لئے شوال کی تیسری کو ایک "ساعتِ نیک" مقرر ہوئی چنانچہ اس مہورت کے موافق جب یہ سفیر شہر کے قریب پہنچا تو اسد خاں۔ سیف خاں اور ملتفت خاں "میر تزک" تین بڑے امیر شہر کے باہر تک استقبال کر کے دیوان خاص و عام میں جہاں بادشاہ سالانہ جشن کے دربار میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا لائے اور اُس نے (بقول صاحب عالمگیر نامہ جس کے بیان کو اس امر خاص میں ڈاکٹر برنیر کی بے غرضانہ اور چشم دید شہادت کے مقابلہ میں صحیح نہیں سمجھا جا سکتا) "اسی طرز و قانون سے جو اس سلطنت کا معمول تھا۔ آداب کورنش و تسلیم بجا لا کر شاہ ایران کا نامہ پیش کیا اور بادشاہ نے" بعطائے خلعت فاخرہ و جیغہ و خنجر مرصع دار گجہ جس یا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

پیالہ وخوانچہ طلا و پان یا پاندان وخوان طلا" میں مجلس جشن میں ممتاز فرمایا۔ اور دربار برخاست ہونے کے بعد رستم خاں کی حویلی میں جو جمنا کے کنارے ایک عمدہ مکان تھا اور سفیر کی خاطر سرکاری فرش وفروش سے آراستہ کیا گیا تھا اُتارا گیا اور میر عزیز بدخشی جو ایک سنجیدہ اور معقول شخص تھا مہماندار مقرر ہوا بادشاہ نے دوسرے دن سفیر کو پھر حضور میں طلب کیا اور ایک "شمشیر با ساز مرصع" عنایت کی اور اُس کے ہمراہیوں میں سے نذر قلی نامی سوغات کے گھوڑوں کے میر آخور (داروغہ اصطبل) اور محمد حسین تحویل دار تحائف اور احمد بیگ ایلچی کے داماد اور اُس کے ملا میر زین العابدین کو خلعت عنایت کئے اور چونکہ رات کو دریائے جمنا میں بادشاہزادوں کے کارپردازوں اور بڑے بڑے امیروں کے اہتمام سے جشنوں کے معمولی دستور کے موافق کشتیوں پر نہایت تکلف سے چراغوں کی روشنی کی گئی تھی اس لئے بادشاہ نے غسل خانہ کے دربار خاص میں سفیر کو بھی معہ اُس کے ہمراہیوں کے طلب کر کے اس تماشے کے ملاحظہ میں شریک کیا۔ اور ساتویں شوال کو سفیر نے حسب الطلب حاضر ہو کر بادشاہ ایران کے تحائف جن میں چھیاسٹھ عراقی گھوڑے نہایت ہی قابل تعریف تھے اور ایک بہت بڑا نایاب موتی جو وزن میں سینتیس قیراط (یعنی ایک سو گیارہ رتی یا ایک تی کم چودہ ماشے) تھا اور جس کی قیمت بادشاہی جوہریوں نے ساٹھ ہزار روپیہ آنکی تھی معہ اور تحفوں کے جن کی قیمت معہ گھوڑوں اور اس موتی کے چار لاکھ بائیس ہزار روپیہ سمجھی گئی تھی پیش کئے اور سفیر نے اپنی طرف سے بھی کچھ عراقی گھوڑے اور "شتر بختی" (یعنی دو کوہان والے اونٹ) اور ایران کی اور نفیس چیزیں پیش کش کیں۔ جن کو اورنگ زیب نے قبول فرما کر ساٹھ ہزار روپیہ نقد اور چاندی کے ہودے اور زربفت کی جھول کے ساتھ ایک ہتھنی عطا کی اور محمد حسین تحویدار تحائف کو پانچ ہزار روپیہ اور نذر قلی میرآخور اور ملا میر زین العابدین کو تین تین ہزار روپیہ اور ایلچی کے داماد احمد بیگ کو دو ہزار روپیہ عنایت کئے۔ اور "بروز جشن سال گرہ چہل و پنجم بحساب قمری" سفیر کو پھر "پچاس ہزار روپے نقد اور مرصع پیٹی اور خلعت باراتی اور پاندان با خوانچہ طلا اور ایک سپر با ساز مرصع اور ایک بندوق خاص"

اور محمد حسین کو تین ہزار اور نذر قلی اور حکیم یوسف سفیر کے طبیب کو دو دو ہزار اور اُس کے کئی "قورچیوں" (سلحدار) اور ہمراہیوں کو تیرہ ہزار روپے مرحمت فرمائے۔ اور تیسری ذی الحجہ کو تین اشرفیاں جو وزن میں کل سات سو تولہ کی تھیں اور پانچ پانچ سو تولہ کے تین روپے عطا ہوئے۔

اور "بروز عید ذی الحجہ بوداق بیگ کو رخصت کر کے ایک لاکھ روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ معہ خنجر مینا کار با علاقہ مروارید اور ایک گھوڑا با زین و لگام طلا اور" ہاتھی با زین طلائی وساز نقرہ وجل زربفت اور ایک فیل دریائی جس کی شکل وصورت "(بقول صاحب عالمگیر نامہ)" خالی از طرفگی وغرابت نہ تھی اور ایک

پالکی معہ ساز سامان" عطا کی اور نامہ کے جواب کی نسبت یہ ارشاد ہوا کہ ایک فہمیدہ اور سنجیدہ بڑے امیر کے ہاتھ ہندوستان کے عمدہ عمدہ تحفوں کے ساتھ پیچھے سے بھیجا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایلچی کو اول سے آخر تک پانچ لاکھ روپیہ اور اُس کے ہمراہیوں کو پینتیس ہزار روپیہ عطا ہوا اور خواجہ صادق بدخشی کو ملتان تک مشایعت کے لئے مامور کیا گیا۔ انتہیٰ۔

واضح ہو کہ عالمگیر نامہ میں جو فیل دریائی کا ذکر ہے مآثر عالمگیری میں بھی فیل دریائی ہی لکھا ہے یہ کوئی خیالی جانور نہیں ہے۔ اس کو انگریزی میں ہیوپوٹاماس کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہے اسپ دریائی۔ مگر اس کو گھوڑے سے کچھ مشابہت نہیں البتہ گینڈے سے بہت مشابہ ہے اور اگر سونڈ اور چوڑے کان بھی ہوتے تو پورا ہاتھی ہی ہوتا۔ کھن دار جانوروں کی نوع میں سے ہے اور مختلف اقسام کا ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا دُم کی طرف سے لے کر سر تک سترہ فٹ کا لمبا ہوتا ہے۔ اکثر سواحل افریقہ پر اور بعض جگہ دریائے نیل میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اکثر پانی میں خوش رہتا ہے مگر دریا کے کنارے نباتات چر کر زندگی بسر کرتا ہے۔

اور شاہ عباس کا وہ نامہ جو یہ ایلچی لایا تھا اور جس کے مضمون کی نسبت ڈاکٹر برنیر نے بعض فقرے نقل کر کے اپنے قیاس سے اُن کی تردید کی ہے انشائے ملا طاہر وحید میں جو شاہ عباس کا نہایت مقرب اور "مجلس نویس خاص" تھا ایک رقم "یعنی فرمان موسومہ ایلچی مذکور (جس کو اُس کے صحیح نام اور خطاب بوداق سلطان کی جگہ صاحب عالمگیر نامہ وغیرہ شاہی مورخوں نے اپنے ہاں کے شاہزادوں کا لقب سلطان ہونے کے لحاظ سے خواہ مخواہ بوداق بیگ بنا دیا ہے) بجنسہٖ موجود ہے۔ اُس کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الواقع اس نامہ میں کوئی بھی ایسا فقرہ نہ تھا جو اورنگ زیب جیسے عالی منزلت بادشاہ کی شان کے برخلاف ہو بلکہ برعکس اس کے تمام الفاظ اور طرز تحریر نہایت حسب حال اور معقول اور مؤدب ہے اور اگرچہ اس میں اورنگ زیب کو اصل نام سے مخاطب کیا ہے بلقب عالمگیر نہیں لکھا مگر یہ بات کچھ اُس کی توہین کے ارادہ سے نہیں معلوم ہوتی کیونکہ نامہ کی طرز عبارت کے علاوہ بوداق بیگ کے نام کے فرمان سے بے شبہ اور صاف طور پر شاہ عباس کا یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے ساتھ دوستی اور اتحاد پیدا کرنے کا بہ دل خواہشمند تھا۔ چنانچہ نامہ اور فرمان کے بعض فقرات زاید کو جو اس حاشیہ کے مدعا سے علاقہ نہیں رکھتے حذف کر کے بعینہٖ اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "نامہ کہ بہ بادشاہ والا جاہ اورنگ زیب نوشتہ شد

بعد از حمد جناب کبریا و بسط بساط نعت سید انبیا و منقبت زبدہ اصفیا بر مرآت ضمیر قدسی تخمیر اعلیٰ حضرت رفیع المنزلت گردوں بسطت مشتری سعادت خورشید طلعت عطارد فطنت کیوان وقار سپہر اقتدار زینت بخش وسادہ جاہ و جلال متکی آرائے فرخندگی و اقبال مصقل مرآت سنائے دولت خداداد شیرازہ بند اوراق پریشان بلاد و عباد فارس مضمار خصم افگنی و دشمن شکاری منظور انظار حضرت باری۔ پیش رو سالکان صراط مستقیم وصول۔ نظر یافتہ مقربان پیش گاہ قبول فروردین ریاض ہمیشہ بہار سلطنت گورگانی۔ حدیقہ طراز گلستان خلد نشان جہانبانی سیراب منہل عذب انتباہ و آگاہی۔ دقیقہ شناس خبایائے اسرار کماہی۔ شہاب ثاقب سپہر جرات و جلادت۔ نہنگ لجہ بحر شہامت و بسالت المؤید بعنایات الملک الحسیب نظاماً للسلطنۃ والنصفۃ والمعدلۃ والشہامۃ والبسالۃ والجلالۃ والرفعۃ والعزۃ والاٰء متبنان سلطان اورنگ زیب منطبع می گرداند کہ دریں وقت ارجمند و زمان سعادت پیوند کہ بہ نیرنگی خالق انس وجان جاعل کمین و مکان اسباب کامیابی و خوش دلی من جمیع الوجوہ آمادہ و ابواب فیوضات از شش جہت بر چہرہ اقبال کشادہ است بہیانگی مخبران صدق آئین مژدہ جلوس آن گوہر فروزان بحر بسالت و شجاعت و جوہر تیغ دشمن شکار جرات و جسارت بر سریر والائے سلطنت موروثی گورگانی و وسادہ لازم السعادت جہانبانی کہ بفحوائے صدق انتمائے تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔ وبمقتضائے آیہ وافی الہدایہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وبہ نیروے اصابت تدبیر و موافقت کارگذاران تقدیر پیرایہ حسن وقوع پوشیدہ سامعہ افروز گشتہ مسرت بر مسرت و خوش دلی افزودہ ہموارہ بر سریر گردوں نظیر دولت متمکن باشند از انجا کہ مبانی صداقت والفیام فی ما بین برگزیدگان ایں دو سلسلہ والا مقام سپہر احتشام استحکام تمام داشتہ در عالم دوستی قدیم مترقب می بود کہ آں زبیدہ اورنگ اقبال و چراغ افروز دودمان مجد و اجلال را ہر گونہ مہمیکہ درباب استقرار امر جہانبانی درکار باشد بمقام اعلام درآید کہ کارگزاران دولت ابد مقرون بانجام آں مامور گردند چوں تلافی مافات بعون عنایت الٰہی مقدور و مراعات شیوہ ستودہ دوستی پیوستہ منظور است بدستور ہر گونہ مطلبے کہ در خاطر والا مرکوز باشد زبان زد خامہ اظہار خواہند نمود" فقط انتہٰی۔

رقعے کہ بہ بوداق سلطان تفنگچی آقاسی درایام ایلچی گری ہند نوشتہ"

امارت پناہ بوداق سلطان بعنایت بے غایت شاہانہ و مرحمت بے نہایت بادشاہانہ مفتخر و سرفراز و ممتاز بودہ بداند کہ عریضہ کہ دریں وقت مصحوب رفعت و معالی پناہ علی قلی بیگ بدرگاہ جہاں پناہ آستان

خلایق امیدگاہ مشتمل بر خوشنودی از الطاف پادشاہِ والاجاہ گردوں بارگاہ ستارہ سپاہ فرستادہ بود در ہنگامیکہ گلہاے کامجوئی و کامرانی در بوستانِ بے خزاں صاحب قرانی بر نیرش سحاب عنایت سبحانی شگفتہ وگرد و غبار عوایق و موانعِ عیش و عشرت بنسایم الطاف الٰہی رفتہ و دلاتِ اطراف و در بار جلال عرش آستان و سلاطین باتمکین در محفلِ بہشت مشاکل مانند ساغر بخدمت در دوران بودند بہ نظر کیمیا اثر رسید" برگ پان" کہ بدفعات ارسال یافتہ بود بہ تخصیص" بار جامۂ لاہوری" یعنی لاہور کی بنی ہوئی وہ بوری یا گون جس میں پان بھیجے تھے) بہوئے تو بہار دار الخلد بزم ارم نشان سرسبز دریان دار وگردید بنا بر عنایت شاہانہ دربارۂ آں غلام زادہ خلاع فاخرہ پوشیدہ مصحوب رفعت و معالی پناہ سہراب بیگ غلام خاصہ شریفہ فرستادہ شد معروض داشتہ بود کہ اعلیٰ حضرت بادشاہِ والاجاہ کامیاب مالکِ رقاب بنا بر مرامات یک جہتی و یگانگی مقرر فرمودہ اند کہ بہ تعاقب ارسالِ برگ سبز پان بوستان یادآوری شگفتہ و خنداں باشد این معنی موجب اہتزاز از اہیر بوستان سراے خاطر ہمایوں شد۔ چوں از طرفین لبساط یکتا ولی ممہد و ابواب منافرت و بیگانگی بالکلیہ مسدود است انچہ از اثمار حلاوت آثار مختصہ این دیار مرغوب خاطر والاے آں پادشاہ جم اقتدار عدالت شعار پسندیدہ اطوار بودہ باشد معروض خواہد داشت کہ بندگان درگاہ گردوں پیش گاہ بارسال آن مامور گردند۔ در عریضہ علٰحدہ اظہار میلان خاطرِ خورشید آثار اعلیٰ حضرت بادشاہِ گردوں بارگاہ بارسالِ عمدۃ الاماثل والاشباہ برہان الدین خویش ایالت و شوکت پناہ فاضل خاں شدہ بود برآن غلام زادہ بواجبی ظاہر ست کہ درحینیکہ جان نثار خاں بہ رسم حجابت بدرگاہ خلایق پناہ آمدہ از جملہ مطالبے کہ بعرض آن مامور شدہ استدعاے رخصت جمعے از مردم این دیار بود و چوں درآں وقت تراکم غبار نقار مانع دخول شاہد مسئول بحجلہ اجابت و قبول بود بپیرایۂ حصول نہ پوشیدہ دریں وقت کہ بحمد اللہ تعالیٰ آں غبار از رہگذر خاطر رفتہ و گلہاے یک جہتی بر شاخسار مودت شگفتہ زبدۃ اقران موی الیہا مرخص فرمودہ اتمام مطاعۂ لازم الاطاعت باسم بیگلربیگیان عظام و امراے کرام و وزراے ذوی الاحترام ممالک محروسہ شرف صدور یافت کہ مانع و مزاحم مشار الیہ نشدہ اورا درکمال رفاہ حال و فراغ بال بامنسوبان و متعلقان و احمال و اثقال روانہ نمایند و علی قلی بیگ مشمول عنایات شاہانہ والتفات خسروانہ شد۔ چوں خاطر والا و طبع اقدس و اعلیٰ متوجہ رسیدن اخبار صحت آثار ذاتِ ستودہ صفات کامل المبجیات اعلیٰ حضرت بادشاہِ والاجاہ ستارہ سپاہ می باشد و آں غلام زادہ نیز مدتیست کہ از شرف درگاہ خلایق پناہ دور و از شرف بندگی مہجور شدہ در حین در و رقم اشرف رخصت انصراف حاصل نمودہ روانہ شود و بہ توجہات شاہانہ متسالی باشد" فقط

جب تک یہ سفیر دہلی میں رہا اورنگ زیب اپنی تمام حرکات و سکنات میں سخت احتیاط کا پابند رہا برخلاف شاہجہاں کے جس نے نامور شاہ عباس کے سفیر کو کبھی تو بے موقعہ نخوت دکھاکر ناراض کر لیا اور کبھی ایسی بے تکلفی اختیار کی جو اُس کی شان کے لائق نہ تھی۔

سفیر ایران اور شاہجہاں کے لطیفے جب کوئی ایرانی ہندوستانیوں کی ہنسی اُڑانا چاہتا ہے تو مندرجہ ذیل قصے بیان کرتا ہے۔ اول یہ کہ جب شاہجہاں کی کوئی تدبیر نہ چل سکی کہ سفیر ایران ہندوستان کے درباری قاعدہ کے موافق رسم تسلیمات جس سے اُس کو انکار تھا بجا لائے تو اُس نے یہ تدبیر نکالی کہ عام وخاص کے دروازے کا پھاٹک تو بند کروا دیا اور صرف کھڑکی کھلی رہنے دی جس میں سے بغیر سر جھکائے گذر نہیں ہو سکتا تھا شاہجہاں کو اُمید تھی کہ اس "تدبیر" سے ہم کو اس بات کے کہنے کا موقعہ ملے گا کہ سفیر ایران کو دربار میں حاضر ہونے کے وقت ہندوستان کی رسم سے بھی زیادہ سر جھکانا پڑا۔ لیکن یہ سرکش اور چالاک ایرانی فوراً تاڑ گیا اور شاہجہاں کی طرف پیٹھ کرکے کھڑکی میں داخل ہوا شاہجہاں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور مصنف نے جو ایران کی کمزوری کے ثبوت میں یہ لکھا ہے کہ باہمی فساد کے دنوں میں داراشکوہ۔ شاہجہاں سلطان شجاع اور شاید صوبہ دار کابل نے بھی اُن سے مدد مانگی تھی مگر باوجود ایسے عمدہ موقعہ مداخلت کے وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس کے متعلق کتاب طاہر وحید میں اگرچہ شاہجہاں شجاع اور مہابت خاں صوبہ دار کابل کے نام کی تو کوئی تحریر نہیں ملتی۔ مگر شاہ عباس کی طرف سے مراد بخش داراشکوہ اور والیانِ بیجاپور اور گولکنڈا کے نام کے نامے بے شک موجود ہیں۔ جن سے پایا جاتا ہے کہ مراد بخش کو خالی وعدے تو بہت بڑے لفظوں میں دیئے گئے تھے مگر اخیر میں ایفائے وعدہ میں لیت ولعل اور امروز فردا کر دینے کے لئے قصداً گنجایش رکھ لی گئی تھی۔ اور داراشکوہ کو جو لواح سندھ میں پہنچ کر طالب امداد ہوا تھا مدد کا وعدہ دے کر یوں ٹال دیا تھا کہ آپ اپنے دادا ہمایوں کی طرح اول ہمارے پاس اصفہان میں تشریف لے آیئے پھر سب طرح سے بندوبست ہو جائے گا۔

اور بیجاپور و گولکنڈا والوں کو جو شاہان صفویہ کے ہم مذہب تھے شاہانِ مغلیہ کا سنی المذہب ہونا بہت شدومد سے جتا کر اگرچہ یہ صلاح تو دی گئی تھی کہ اس وقت یہ اپنے خانگی فسادوں میں مبتلا ہیں تم دونوں متفق رہ کر ان کی بیخ کنی میں کوشش کرو مگر اپنی فوج وغیرہ بھیجنے کا کوئی وعدہ و اقرار نہ تھا۔

ان حالات پر غور کرنے سے برنیئر کی یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ اہل ایران ظاہری نمائش کے لئے خالی شیخیاں بہت بگھارتے تھے مگر اپنی طاقت کا اندازہ اپنے دل میں خوب سمجھے ہوئے تھے۔ س م ح

یہ دیکھکر کہ اس چال میں بھی وہی غالب رہا بہت جھنجلایا اور سفیر کو حقارت سے مخاطب کرکے بولا۔

"اے بدبخت کیا تو اپنے جیسے گدھوں کا طویلہ سمجھکر اس میں داخل ہوا ہے"؟

اُس نے کہا بے شک میں یہی سمجھا تھا۔کیونکہ ایسے دروازہ میں سے گذر کرتے ہوئے کون شخص یہ خیال کرسکتا ہے کہ گدھوں سے ملنے کے سوا وہ کسی اور جگہ جا رہا ہے۔

دوسرا یہ کہ شاہجہاں نے سفیر ایران کے کسی بے ادبانہ اور کرخت جواب سے ناراض ہوکر کہا

"اے بدبخت شاہ عباس کے دربار میں کیا کوئی شریف آدمی نہ تھا جو تجھ جیسے خر دماغ کو میرے پاس بھیجا"؟

اُس نے کہا کیوں نہیں بہت سے مہذب اور لائق لوگ موجود ہیں مگر وہ ہر ایک کی لیاقت کے موافق سفیر بھیجا کرتا ہے۔

تیسرا یہ کہ ایک دن شاہجہاں نے سفیر ایران کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا اور حسب معمول اُس کے چھیڑنے کے لئے موقعہ دیکھتا رہا۔پس جب سفیر نے قاب میں سے ڈھونڈکر ہڈیاں نکالیں اور چچوڑنی شروع کیں تو بادشاہ نے چپکے سے کہا "ایلچی جی کتے کیا کھائیں گے؟ اُس نے کہا "کھچڑی" جسے بادشاہ بڑی رغبت سے نوش جان فرما رہے تھے۔کھچڑی ایک کھانا ہے جو چاول اور مونگ یا ماش وغیرہ ملاکر پکایا جاتا ہے اور جس کو عموماً ہندوستان کے غریب آدمی کھاتے ہیں۔پھر بادشاہ نے پوچھا کہ تم ہمارے شہر دہلی کو۔ (جو اُس وقت نیا تیار ہو رہا تھا) اصفہان کے مقابلہ میں کیسا خیال کرتے ہو؟ سفیر نے بلند آواز سے جواب دیا کہ "واللہ باللہ اصفہان تو آپ کے شہر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا"۔ بادشاہ نے اسے تعریف جانا۔لیکن سفیر نے ہجو بلیغ کی تھی۔کیونکہ شاہجہان آباد کا گرد و غبار بہت ہی تکلیف دہ ہے۔

ایک قصہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب شاہجہاں نے سفیر کو اس امر پر مجبور کیا کہ ٹھیک طور پر بتائے کہ ایران اور ہندوستان کی سلطنت کی قوت میں کس قدر فرق ہے تو اُس نے عرض کیا کہ ہندوستان چودھویں رات کے چاند کے موافق ہے اور ایران محض دوسری یا تیسری رات کے چاند کے مطابق۔جس سے شاہجہاں اپنی عظمت کی بات سمجھ کر بہت ہی خوش ہوا۔لیکن جب اس ذومعنی جواب کا اصل مطلب خیال میں آیا جو

یہ تھا کہ سلطنت ہند زوال کے قریب ہے اور ایران ایک بڑھتی ہوئی دولت ہے تو دل ہی دل میں بہت پیچ وتاب کھایا۔ الغرض ہندوستان میں جو ایرانی رہتے ہیں وہ اپنی ذہانت اور حاضرجوابیوں کی نسبت اسی طرح کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں اور ایسے قصے بیان کرتے ہوئے کبھی سیر ہی نہیں ہوتے۔ مگر میری رائے میں یہ نسبت تعلی اور تدمغ اور طنز وایما کے سفیروں کے لئے زیبا طریق یہ ہے کہ وہ متانت اور وقار اور ادب کو ملحوظ رکھیں۔

شاہ عباس کا یہ سفیر اگرچہ ان پسندیدہ اوصاف سے تو معرا ہی تھا۔ مگر تعجب تو اس بات کا ہے کہ اس کو اتنا معمولی شعور بھی نہ تھا کہ اپنی جان اور آبرو کو بچائے رکھتا اور خواہ مخواہ ایک خودسر بادشاہ کو اپنی نسبت غضبناک نہ کرلیتا۔ چنانچہ ایک واقعہ ہے جس میں اُس کی جان جانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا تھا ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے ایسی ہی نادانی کی باتوں سے شاہجہاں کو اپنے سر کرلیا تھا یعنی اس پادشاہ کو اُس سے ایسی دلی رنجش ہوگئی تھی کہ اُس سے بات چیت کرنے میں حقارت آمیز الفاظ علانیہ کہہ بیٹھتا تھا بلکہ مخفی طور پر یہ حکم دیدیا تھا کہ جب وہ دربار کو آئے تو عام وخاص کے راستہ میں (جو مثل ایک لمبے اور تنگ کوچہ کے ہے) ایک خونی ہاتھی اُس پر چھوڑدیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اگر یہ شخص چالاک اور دلیر نہ ہوتا تو ضرور مارا جاتا۔ لیکن وہ اپنی پالکی سے نہایت پھرتی کے ساتھ کود گیا اور اُس نے اور اُس کے ہمراہیوں نے ایسے تیر پر تیر مارے کہ ہاتھی بھاگ گیا اور اُس کی جان بچ گئی۔

اورنگ زیب کا اپنے اُستاد کے ساتھ سلوک جس مہینے سفیر ایران اپنے ملک کو واپس گیا ملا صالح کی دربار میں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ یہ بڈھا عالمگیر کا اُستاد تھا اور ایک مدت سے اپنی جاگیر میں جو شاہجہاں نے

لہ شاہجہاں کا مورخ خاص ملا عبدالحمید لاہوری پادشاہ نامہ کے وہ رسالہ اول کے خاتمہ میں جو ۱۰۴۶ھ ہجری کے متعلق تھا دربار شاہجہانی کے علماء وفضلا کی فہرست میں اورنگ زیب کے اُستاد کی نسبت یہ عبارت لکھتا ہے۔ میر محمد ہاشم معروف بہ حکیم ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی مدت دوازدہ سال درحرمین شریفین بودہ منقولات را از شیخ محمد عربی محدث و شیخ عبدالرحیم حسانی و ملا علی نبیرۂ ملا عصام الدین مشہور۔ ومعقولات را از میر نصیر الدین حسین پسر زادہ میر غیاث الدین منصور و مرزا ابراہیم

اُسے دے رکھی تھی رہتا تھا جب اُس نے سُنا کہ شاہزادوں کی باہمی لڑائیاں ختم ہو چکیں اور اُس کے شاگرد نے اپنے اولوالعزمانہ منصوبوں میں پوری کامیابی حاصل کرلی تو فوراً دہلی آیا ہے اور اُس کو پوری اُمید تھی کہ اب امارت کا درجہ بہت جلد حاصل ہوجائے گا چنانچہ جو لوگ دربار میں ذی وجاہت تھے سب کو اُس نے اپنا جانب دار بنالیا یہاں تک کہ کئی شخصوں بلکہ روشن آرا بیگم نے بھی اورنگ زیب کو یاد دلایا کہ آپ کا قابل التنظیم اور کامل الاخلاص اُستاد عزت و اکرام کا یقیناً مستحق ہے۔ مگر تین مہینے تک تو اُس نے یہ بھی جاننا نہ چاہا کہ وہ دربار میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن آخر کار جب

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ ہدایتی فرا گرفتہ بہ ہندوستان آمد طب و ریاضی نزد سرآمد اطبائے حکیم علی گیلانی ورزیدہ چندے در احمد آباد گجرات بتدریس مشتغل بود چوں دانائی او در فنون و فضائل خصوصاً طب بعرض اقدس رسید حکم شد کہ در ہماں بلدہ بخدمت صدارت و طبابت پردازد۔ پس از انقضائے مدتے ملتزم عبودیت سدہ سینہ گشتہ بامر خاقانی شرف تعلیم اختر برج سعادت پادشاہزادہ محمد اورنگ زیب بہادر دریافت واکنوں در ملازمت آں والا گوہر کامیاب است بر تفسیر بیضاوی حاشیہ نگاشتہ بنام نامی حضرت شاہنشاہی سطر زگردانیدہ است" نقط چونکہ اورنگ زیب کی ولادت پندرھویں ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ ہجری کی تھی۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ ۱۰۴۷ھ میں اُس کی بیس برس کی عمر تک اُس کا یہی اُستاد اُس کے پاس تھا اور اُس وقت کے نامور عالموں کی مذکورہ بالا فہرست میں صالح نامی کسی شخص کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ صاحب عمل صالح نے شاہجہاں کے عہد کے خوشنویسوں کے ذکر میں میر عبداللہ مشکیں رقم کے بیٹوں میر محمد صالح و میر محمد مومن کے نام لکھکر اُن کی خوشنویسی کی بہت تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ علاوہ خوشنویسی کے یہ دونوں بھائی ہندوستان کے فن موسیقی میں بھی نہایت کامل گوّیے تھے اور شاعر بھی تھے۔ چنانچہ میر صالح اشعار فارسی میں کشفی اور ہندی اشعار میں سبحان اپنا تخلص کرتا تھا اور یہ دونوں اپنے اشعار زیادہ تر اہل بیت اطہار سلام اللہ علیہم کے مناقب میں لکھتے اور اہل تصوف سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے۔ اور منصب داروں کی فہرست میں اس میر صالح کو نہ صدی صد سوار کا منصب دار لکھا ہے مگر اورنگ زیب کا اُستاد ہونا کہیں نہیں لکھا فقط

س م ح

اُس کو دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا تو حکم دیا کہ ملا خلوت کے دربار میں حاضر ہو۔ جہاں صرف حکیم الملک دانشمند خاں اور تین چار اور امیر جو علم و فضل میں مشہور ہیں موجود تھے۔ اگرچہ میں اس موقعہ پر حاضر نہ تھا اور ہوتا بھی تو ناممکن تھا کہ اُس طول طویل گفتگو کو یاد رکھتا جو اورنگ زیب نے مُلا سے کی تھی۔ مگر جو کچھ اپنے آغا کی زبانی میں نے سنا ہے کچھ شک نہیں کہ اُس کا مطلب حسب ذیل تھا۔ یعنی اورنگ زیب نے فرمایا۔

ملاجی! براہِ مہربانی یہ تو فرمایئے کہ آپ ہم سے چاہتے کیا ہیں؟ کیا آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم آپ کو دربار کے اوّل درجہ کے اُمرا میں داخل کرلیں؟ لیکن اس سے پہلے اس بات کا ثابت کرنا ضروری ہے کہ آپ کسی نشانِ عزت کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ اگر آپ ہماری تعلیم و تربیت شائستہ طور پر کرتے تو ضرور ایسی ہی عزت کے مستحق ہوتے آپ ہم کو ایک تربیت یافتہ نوجوان شخص بتایئے تاکہ ہم بتادیں کہ اُس کی تعلیم و تربیت کی بابت شکرگذاری کا زیادہ مستحق اُس کا اُستاد ہے یا اُس کا باپ۔ فرمایئے تو سہی کہ آپ کی تعلیم سے کون سی واقفیت مجھے حاصل ہوئی ہے کیونکہ آپ نے تو مجھکو یہ بتایا تھا کہ تمام فرنگستان ایک چھوٹے سے جزیرہ سے زیادہ نہیں ہے جس میں سب سے بڑا بادشاہ اول شاہ پرتگال تھا۔ پھر بادشاہ ہالینڈ ہوا۔ اور اُن کے بعد شاہِ انگلستان اور فرنگستان کے اور بادشاہوں مثلاً فرانس اور اُندلس کی بابت آپ یہ بتایا کرتے تھے کہ یہ لوگ ہمارے ہاں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے موافق ہیں۔ اور یہ کہ ہندوستان کے پادشاہوں میں صرف ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہی ایسے شاہنشاہ ہوئے ہیں۔ جن کے آگے تمام دنیا کے پادشاہوں کی شان و شوکت مدھم ہے۔ اور یہ کہ ایران۔ ازبک۔ کاشغر۔ تاتار۔ پیگو۔ سیام چین۔ اور ماچین کے بادشاہ سلاطین ہند کے نام سے کانپتے ہیں سبحان اللہ آپ کی اس جغرافیہ دانی اور کمال علم تاریخ کا کیا کہنا ہے۔ کیا مجھ جیسے شخص کے اُستاد کو لازم نہ تھا کہ دنیا کی ہر ایک قوم کے حالات سے مجھے مطلع کرتا مثلاً اُن کی قوتِ جنگی سے، اُن کے وسائل آمدنی اور طرزِ جنگ سے اُن کے

رسم ورواج اور مذاہب اور طرزِ حکمرانی سے' اور اُن خاص خاص اُمور سے جن کو وہ اپنے حق میں زیادہ مفید سمجھتے ہیں بہ تفصیل مجھکو آگاہ کرتا، اور علم تاریخ مجھے ایسا سلسلہ وار پڑھاتا کہ میں ہر ایک سلطنت کی جڑ بنیاد اور اسبابِ ترقی وتنزل اور اُن حادثات و واقعات اور غلطیوں سے واقف ہوجاتا جن کے باعث سے اُن میں ایسے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے رہے ہیں۔ اور قطع نظر اس سے کہ آپ مجھکو بنی آدم کی وسیع اور کامل تاریخ سے آگاہ کرتے آپ نے تو ہمارے اُن مشہور و معروف بزرگوں کے نام بھی اچھی طرح نہیں بتائے جو ہماری سلطنت کے بانی تھے۔ اور اُن کی سوانح عمری اور اُن کی خصوصی قابلیتوں سے بھی آگاہ نہیں کیا۔ جن کے باعث وہ بڑی بڑی فتوحات کرنے کے قابل ہوئے اور اُن فتوحات سے پہلے جو واقعات ظہور میں آئے اُن سے بھی ناواقف رکھا۔ اور باوجودیکہ بادشاہ کو اپنی ہمسایہ قوموں کی زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے بجائے اُن کے آپ نے مجھ کو عربی لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اگرچہ اس زبان کے سیکھنے میں میری عمر کا ایک بڑا حصہ ضایع ہوا۔ مگر بے شک آپ نے یہ سمجھا تھا کہ آپ مجھ پر ایک ایسی زبان کے سکھانے سے جو دس بارہ برس برابر محنت کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ایک دایمی احسان کر رہے ہیں۔ آپ نے بغیر اس کے کہ یہ سوچیں کہ ایک شاہزادہ کو زیادہ تر کن علوم کے پڑھانے کی ضرورت ہے صرف صرف ونحو اور ایسے فنون کی تعلیم کو۔ جو ایک قاضی کے لئے ضروری ہیں مقدم جانا اور ہماری جوانی کے ایام کو بے فائدہ اور لفظی بحثوں کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کیا۔"

یہ الفاظ تھے جن میں اورنگ زیب نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ لیکن بعض پڑھے لکھے آدمی یا تو بادشاہ کی خوشامد اور اُس کے کلام کی قوت دکھانے کو یا ملا صالح کے حسد کے مارے یوں کہتے ہیں کہ بادشاہ کا ملا کو ملامت کرنا اسی پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے دوبارہ ملا کو کہا۔

"کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ بچپن میں جب کہ قوت حافظہ قوی ہوتی ہے

ہزاروں معقول باتیں ذہن نشین ہو سکتی ہیں اور آسانی کے ساتھ انسان ایسی مفید تعلیمات حاصل کر سکتا ہے کہ جن سے دل میں نہایت اعلیٰ خیال پیدا ہو جاتے ہیں اور انسان بڑے بڑے نمایاں کاموں کے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ کیا نماز صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ سے ادا ہو سکتی ہے اور ہماری اصلی زبان میں اُسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اور تحصیل مسائل شرعیہ کیا زبان عربی ہی پر موقوف ہے۔ آپ نے ہمارے والد ماجد کو تو یہ سمجھا دیا کہ ہم اسے فلسفہ پڑھاتے ہیں۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے برسوں تک ایسے بیہودہ اور لغو مسائل سے میرے دماغ کو پریشان رکھا جن کے حل ہو جانے کے بعد بھی کچھ اطمینان خاطر حاصل نہیں ہوتا۔ اور جو معاملات دنیاوی میں کبھی کار آمد نہیں ہوتے۔ اور صرف ایسے غیر معین اور فضول خیالات اور توہمات ہیں۔ جو سمجھ میں تو بڑی مشکل سے آتے ہیں مگر بہت ہی جلد ذہن سے اُتر جاتے ہیں۔ اور جن کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ دماغ پریشان اور عقل خبط ہو کر آدمی ایسا منہ زور اور ہٹیلا ہو جائے کہ لوگ اُس سے دق ہو جائیں۔ بے شک آپ نے میرے اوقات گراں مایہ کے کئی سال ایسے مسائل مفروضہ کی تعلیم میں جو آپ کو مرغوب تھے صرف کرائے۔ مگر جب میں آپ کی تعلیم سے علیٰحدہ ہوا تو کسی بڑے علم کے جاننے کا فخر نہیں کر سکتا تھا بجز اس کے کہ ایسی چند عجیب اور غیر معروف اصطلاحوں سے واقف تھا۔ جو ایک عمدہ سمجھ کے نوجوان شخص کی ہمت کو شکستہ، دماغ کو مختل، اور طبیعت کو حیران کر دیتی ہیں۔ اور جو مدعیان فلسفہ کے جھوٹے دعووں اور جہالت کے چھپانے کی خاطر جو آپ کی مانند لوگوں کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ وہ عقل و دانش میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ کہ اُن کی تاریک اور مشتبہ المفہوم جق جق بق بق میں ایسے بہت سے دقائق ہیں جو بجز اُن کے اور کسی کو معلوم نہیں گھڑ لیئے گئے ہیں اگر آپ مجھکو وہ فلسفہ سکھاتے جس سے ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ بغیر برہان اور دلیل صحیح کے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یا آپ مجھکو ایسا سبق پڑھاتے

جس سے انسان کے نفس کو ایسا شرف اور علو حاصل ہو جاتا ہے کہ دنیا کے انقلابات سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور ترقی و تنزل کی حالت میں ایک ہی سا رہتا ہے۔ یا تم مجھے انسان کے لوازم فطرت اور مقتضیات طبیعت سے واقف کرتے۔ یا مجھے ایسے طریق استدلال کا عادی بناتے کہ تصورات و تخیلات کو چھوڑ کر ہمیشہ اصول صادقہ بدیہہ کی طرف رجوع کیا کرتا اور عالم ومافیہا کی حقایق واقعیہ اور اُس کے کون و فساد کی ترتیب و نظام کے معارف یقینیہ سے مجھے مطلع کرتے اور جو فلسفہ آپ نے مجھے تعلیم کیا ہے وہ ایسے مسائل پر مشتمل ہوتا۔ تو میں اُس سے بھی زیادہ آپ کا احسان مانتا جتنا کہ سکندر نے ارسطو کا مانا تھا۔ اور ارسطو سے بھی زیادہ آپ کو انعام عطا کرتا۔ ملاجی نا قدردانی کا جھوٹا الزام خواہ مخواہ مجھ پر نہ لگائیے۔ کیا تم یہ نہ جانتے تھے کہ شاہزادوں کو اتنی بات تو ضرور ہی سکھانی چاہیئے کہ اُن کو رعایا سے اور رعایا کو اُن کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا لازم ہے۔ اور کیا تم کو اول ہی یہ خیال کرلینا ضروری نہ تھا کہ میں کسی وقت تخت و تاج کی خاطر بلکہ اپنی جان بچانے کے لئے تلوار پکڑ کر اپنے بھائیوں سے لڑنے پر مجبور ہوں گا۔ کیونکہ تم خوب جانتے ہو کہ سلاطین ہند کی اولاد کو ہمیشہ یہی معاملے پیش آتے رہے ہیں۔ پس تم نے کبھی لڑائی کا فن یا کسی شہر کا محاصرہ کرنا یا فوج کی صف آرائی کا طریقہ مجھے سکھایا تھا۔ مگر میری خوش طالعی تھی کہ میں نے ان معاملات میں ایسے لوگوں سے کچھ سیکھ لیا تھا جو تم سے زیادہ عقلمند تھے۔ پس اپنے گاؤں کو چلے جائیے اور آج کے بعد کوئی نہ جانے کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا حال ہے[1]۔

---

[1] اس ساری تقریر کو پڑھنے کے بعد تو کچھ ایسا شبہ ہوتا ہے جیسے برنیر تعلیم و تربیت کے موضوع پر اپنے خیالات اورنگ زیب کے منہ سے کہلوانا چاہتا ہے جس کا مقصد محض مشرقی علوم کی تحقیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حالانکہ اس زمانہ میں رومن کیتھولک گرجا کی جو تعلیمات اور فلسفے یورپ میں رائج تھے وہ بھی کہیں زیادہ بعید از قیاس اور حقائق سے دور تھے۔ ایک میں تین اور تین میں ایک کی تجسیم و تشکیل کے بنیادی نظریئے نے ان کے سارے علوم کو ایک عجیب گورکھ دھندا بنا رکھا تھا۔

بادشاہی منجم کی ناگہانی موت

انھیں دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ نجومیوں کے حق میں بہت غیر مفید تھا۔ بات یہ ہے کہ ایشیائی لوگ اکثر احکام نجوم کے ایسے معتقد ہیں کہ اُن کے نزدیک دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو کواکب اور افلاک کی گردش پر منحصر نہ ہو اور اس لئے وہ ہر ایک کام میں نجومیوں سے مشورہ لیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عین لڑائی کے وقت جب کہ دونوں طرف صف بندی بھی ہو چکی ہو کوئی سپہ سالار اپنے منجم سے ساعت نکلوائے بغیر لڑائی شروع نہیں کرتا۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نامبارک لگن میں لڑائی شروع کر دی جائے بلکہ منجموں سے پوچھے بغیر کوئی شخص سپہ سالاری پر مامور بھی نہیں کیا جاتا۔ علی ہٰذالقیاس بغیر اُن کی اجازت کے نہ شادی بیاہ ہو سکتا ہے نہ کہیں سفر کیا جاتا ہے۔ بلکہ ذرا ذرا سی باتیں بھی اُن سے پوچھے بغیر نہیں کی جاتیں مثلاً کسی لونڈی غلام کا خریدنا یا نیا کپڑا پہننا۔ اور اس احمقانہ توہم نے خلایق کو عموماً ایسی دقت میں ڈال رکھا ہے۔ اور اس سے ایسے اہم اور نامرغوب نتیجے پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے سخت تعجب ہے کہ اس قدر مدت سے یہ اعتقاد کیوں کر قائم چلا آتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک تجویز سے خواہ وہ کسی سرکاری کام کے متعلق ہو یا نج کے۔ اور ہر ایک معاملہ سے خواہ وہ معمولی ہو یا غیر معمولی نجومی کو واقف کرنا ضروریات سے ہے[1]۔

وہ واقعہ جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ خاص بادشاہی منجم کسی اتفاق سے پانی میں گر پڑا اور ڈوب کر مر گیا۔ اس افسوس ناک واقعہ سے دربار میں بڑی حیرت پیدا ہوئی۔ اور ان نجومیوں کی شہرت کو جو اسرار غیبی کے جاننے والے گنے جاتے ہیں

---

[1] آثر عالمگیری اور سیر المتاخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے اٹھارھویں سال (۱۰۸۵ہجری) میں تمام منجموں کو جو بادشاہ اور شاہزادوں اور صوبہ داروں کے پاس ملازم رہتے تھے موقوف کر دیا تھا بلکہ اس حکم کی تعمیل اس سختی سے کی گئی تھی کہ اس کے مقرب خاص بختاور خاں نے ان سے مچلکے لکھوائے تھے کہ آئندہ تقویم (جنتری) تک بھی نہ بنایا کریں اور باوجودیکہ حسابوں کی صحت کے لئے سرکاری دفتروں میں جنتریوں کا موجود رہنا ایک ضروری امر تھا۔ اور مذہب کی رو سے کچھ منع بھی نہ تھا مگر ان کا رکھنا اور دیکھنا بھی موقوف کیا گیا۔ اور صورت نکلوا کر سفر کرنے کی جگہ یہ دستور مقرر کیا گیا کہ وہ شنبہ اور پنجشنبہ کو کوچ ہوا کرے۔ س م ع

بڑا شہرہ پہنچا - چونکہ یہ شخص ہمیشہ بادشاہ اور اُمرا کے لئے ساعتیں نکالا کرتا تھا اس لئے لوگوں کو اس کے اس طرح جان دینے سے قدرتی طور پر نہایت تعجب ہوا کیونکہ ایک ایسا مشاق نجومی جو برسوں تک اوروں کے لئے مبارک اور خوش آیندہ باتوں کی پیش گوئی کرتا رہا ہو اُس آفت سے جو خود اُس پر آنے والی تھی واقف نہ ہو سکا - اور لوگ یہ کہنے لگ گئے کہ فرنگستان[1] میں جہاں علم کا بڑا چرچا ہے نجومیوں کو وہاں کے لوگ مثل فریبیوں اور شعبدہ بازوں کے گنتے ہیں اور اس علم کو عمدہ اور صحیح اصول پر مبنی نہیں سمجھتے بلکہ یہ جانتے ہیں کہ مکار لوگوں نے بڑے آدمیوں کے درباروں میں رسائی پیدا کرنے اور اُن کو اپنا محتاج ثابت کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے -

ایران کے نجومی کا لطیفہ

الغرض لوگوں کے ان خیالات اور علی الخصوص مندرجہ ذیل واقعہ سے جس کا عموماً بڑا چرچا تھا منجم بہت ناخوش ہوئے - اور وہ یہ ہے کہ ایران کے نامور بادشاہ شاہ عباس نے کہیں اپنے محل میں پائیں باغ لگانے کا حکم دیا تھا اور اس کام کے لئے دن بھی مقرر ہو چکا تھا - اور باغبان شاہی نے میوہ کے چند درختوں کے لئے ایک مناسب موقعہ بھی تجویز کر لیا تھا - مگر بادشاہی منجم نے ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا کہ اگر ساعت دریافت کئے بغیر درخت لگائے جائیں گے تو ہرگز سرسبز نہ ہوں گے - شاہ عباس نے اُس کی بات مان کر ساعت تجویز کرنے کو کہا

تو اُس نے کچھ پانسا وانسا ڈال اور اپنی کتاب کے ورق اُلٹ پلٹ اور حساب لگا کر عرض کیا کہ ستاروں کے فلاں، فلاں مقام پر ہونے کی وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دوسری گھڑی کے گذرنے سے پہلے پہلے درخت لگا دیئے جائیں شاہی باغبان جو نجومیوں سے پوچھ گچھ کرنے کو ایک لاحاصل بات خیال کرتا تھا - اس حکیمانہ تجویز کے وقت حاضر نہ تھا پس بغیر اس کے کہ اُس کے آنے کا انتظار کیا جائے گڑھے کھدوائے گئے اور بادشاہ نے خاص اپنے ہاتھ سے درختوں کو جا بجا لگا دیا تاکہ یادگار کے طور پر کہا جائے کہ وہ خود شاہ عباس کے لگائے ہوئے ہیں - مگر باغبان جب اپنے معمولی وقت پر سہ پہر کو آیا تو درختوں کو لگا ہوا دیکھ کر بہت متحیر ہوا - اور یہ خیال کر کے

---

[1] اب چاہے لوگوں نے کہا ہو یا نہ کہا ہو برنیئر کو تو مغرب کی برتری ظاہر کرنے کے لئے اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا تھا - حالانکہ یورپ نے تو صدیوں بعد جا کر حقیقت پسندی کا درس سیکھا اور اسلام نے آغاز ہی سے کہانت اور اٹکلے بازی پر سخت تنقید کی اور حقایق پر علوم کی بنیاد رکھی -

کہ اُس قرینہ سے نہیں لگاتے گئے جو اُس نے تجویز کر رکھا تھا مثلاً سیب کی جگہ زرد آلو اور بادام کی جگہ ناشپاتی لگاتے ہوئے تھے تو ان کو اکھاڑ کر اور جڑوں پر کچھ مٹی ڈال کر رکھدیا۔ اور رات بھر اسی طرح ڈالے رکھے۔ منجم کو بھی فوراً کسی نے جا کہا اور اُس نے بھی فوراً ہی شاہ عباس کے پاس جاکر باغبان کی اس حرکت کی سخت شکایت کی۔ پس یہ گنہگار باغبان اُسی وقت طلب ہوا اور بادشاہ نے نہایت غضبناک ہو کر کہا کہ تو نے یہ کیا حرکت کی کہ جن درختوں کو ہم نے نیک ساعت نکلوا کر خود اپنے ہاتھ سے لگایا تھا اُن کو اُکھاڑ ڈالا۔ اور اب کیا اُمید ہے کہ اس باغ کا کوئی درخت پھل لائے گا۔ کیونکہ جو ساعت نیک تھی وہ گذر گئی اور پھر کہاں آسکتی ہے۔ یہ صاف باطن اور سادہ لوح دہقانی جو اس وقت شیرازی شراب کا ایک قدح بھی چڑھائے ہوئے تھا نجومی کی طرف ترچھی نظر سے دیکھکر بولا " واللہ باللہ خوب ہی ساعت نکالی۔ ارے کمبخت بدشگونی ذرا خیال تو کر کہ بس یہی تیرا نجوم ہے کہ جو درخت تیرے کہنے سے دوپہر کو لگاتے گئے وہ شام سے پہلے ہی اکھڑ گئے شاہ عباس یہ بے ساختہ اور مزے دار لطیفہ سُن کر بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور نجومی کی طرف پیٹھ پھیر کر وہاں سے چلا گیا۔

ضبطی جائداد سے متعلق لطیفے

اب دو قصے میں اور بیان کرتا ہوں جو اگرچہ شاہجہاں کے زمانہ کے ہیں مگر اُن کے بیان سے اس امر کا ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اُس ملک میں یہ کیسی ظالمانہ پرانی رسم چلی آتی ہے کہ جب کوئی شاہی ملازم مرتا ہے تو اُس کی جائداد بحق سرکار ضبط ہو جاتی ہے۔ پس اُن میں سے ایک قصہ تو یہ ہے کہ اُمرائے دربار میں نیک نام خاں نامی ایک نامور امیر تھا جس نے چالیس پچاس برس کے عرصہ میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہ کر بہت مال و دولت جمع کر رکھا تھا یہ شخص اس ظالمانہ اور مکروہ رسم کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ کیونکہ اس کے باعث بڑے بڑے امیروں کی بیگمیں یکایک ایسی محتاج اور فقیر ہو جاتی ہیں کہ بادشاہ سے اُن کو اپنی تھوڑی سی معاش کے واسطے التجا کرنی پڑتی ہے اور اُن کے بیٹے کسی امیر کے ماتحت عام سپاہیوں میں نوکری کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں پس اس کا اخیر وقت جب قریب آن پہنچا تو اُس نے مخفی طور پر اپنا تمام خزانہ تو مصیبت زدہ بیواؤں اور ایسے غریب امیرزادوں کو جو بیچارے سواروں میں نوکری کرکے بسر اوقات کرتے تھے تقسیم کر دیا اور خالی صندوقوں کو لوہے کے ٹکڑوں، ہڈیوں، پرانی جوتیوں، اور پھٹے پرانے کپڑوں سے بھر کر خوب طرح سے مُہریں لگوا دیں اور وصیت

کی کہ ان میں جو مال و اسباب بند ہے وہ خاص اعلیٰ حضرت کے لئے ہے۔ میرے مرنے کے بعد باحتیاط تمام حضور میں پہنچا دیا جائے۔

پس نیک نام خاں کے انتقال کے بعد جب یہ صندوق سرکار میں آتے تو اتفاقاً بادشاہ دربار میں بیٹھا تھا۔ اُن کو دیکھکر اُس کا دل ایسا للچایا کہ سردربار اُن کے کھولے جانے کا حکم دیا۔ مگر اُن کے کھلتے ہی جو انفعال اور مایوسی اُس کو ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اور اس قدر شرمندہ ہوا کہ فوراً دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ نیک نام خاں کے مرنے کے چند سال بعد ایک دولت مند بنیا جو ہمیشہ سے بادشاہی ملازم تھا۔ اور اپنے ملک کے دستور کے موافق بڑا بیاج خور تھا مر گیا تو اُس کے بیٹے نے اپنی ماں سے کچھ روپیہ لینے کے واسطے لڑنا جھگڑنا شروع کیا مگر اُس نے اُس کی عیاشی اور فضول خرچی کی وجہ سے دینے سے انکار کیا تو اس احمق نے شاہ جہاں کے پاس جاکر کہہ دیا کہ اُس کا باپ دو لاکھ "کرون" یعنی پانچ لاکھ روپیہ چھوڑ مرا ہے اس پر بادشاہ نے فوراً اس بیوہ مہاجنی کو دربار میں بلاکر یہ حکم دیا کہ ایک لاکھ روپیہ تو خزانہ شاہی میں بھیج دے۔ اور باقی میں سے پچاس ہزار روپیہ اپنے بیٹے کو دید ے۔ اور حکم قطعی دے کر چوب داروں سے کہا کہ اس بڑھیا کو دربار سے نکال دو۔ یہ سن کر اگرچہ یہ بیچاری بہت متحیر ہوئی اور اُس کو اس بات کا بھی بڑا رنج ہوا کہ بلا سماعت اس کے عذر کے دربار سے نکالے جانے کا حکم ہوا لیکن تاہم یہ باہمت بڑھیا گھبرائی نہیں اور چوب داروں کو جھڑک کر بولی کہ ہٹو، میں ابھی بادشاہ سے کچھ عرض کیا چاہتی ہوں، اس پر شاہجہاں نے: ہاں اچھا جو کہنا چاہتی ہے کہنے دو۔ پس اُس نے عرض کیا کہ حضرت میرا بیٹا جو اپنے باپ کے مال کا دعوےٰ کرتا ہے کچھ بے جا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا بیٹا...... اور ہمارا وارث ہے۔ مگر میں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہوں کہ سرکار کا میرے خاوند کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ جو حضور ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہیں۔ شاہجہاں یہ مختصر اور بے ساختہ سوال سُن کر بہت خوش ہوا اور اس خیال سے کہ شہنشاہ ہند ہوکر ایک بنیے کا رشتہ دار کہلائے اُس کو بڑی ہنسی آئی اور کئی بار قہقہہ مارا اور حکم دیا کہ اچھا اسے جانے دو اور اس کے مال و دولت سے کوئی متعرض نہ ہو۔

شاہزادوں کی باہمی لڑائی تقریباً ۱۶۶۰ء میں جب ختم ہو چکی اُس وقت سے لے کر کوئی چھ برس بعد تک جب کہ میں ہندوستان سے رخصت ہوا جو جو واقعات قابل غور پیش آئے

رہے اب میں اُن سب کو لکھنا نہیں چاہتا۔ اگرچہ کچھ شک نہیں ہے کہ اُن میں سے بعض کے لکھ دینے سے میرا یہ مدعا کہ مغلوں اور ہندوستانیوں کے طور وطریق اور ذہن وذکا کا حال ناظرین کتاب پر واضح ہو جائے بہت کچھ پورا ہو جاتا اسی فروگذاشت کی وجہ سے مجھے وہ واقعات تمام وکمال کہیں پھر لکھنے پڑیں گے۔ لیکن سردست میں صرف انھیں خاص خاص لوگوں کے بعض اہم حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جن کے نام سے ناظرین واقف ہو چکے ہیں اور اس بیان کو شاہجہاں کے حال سے شروع کرتا ہوں۔

شاہجہاں کے ساتھ اورنگ زیب کا سلوک

اگرچہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کو قلعہ آگرہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قید کر رکھا تھا اور کسی ایسی بات میں مطلقاً غفلت نہیں کی جاتی تھی جس سے اُس کے نکل بھاگنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اور سب طرح نہایت ادب اور ملائمت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اور اُن شاہی محلوں میں رہنے سہنے کی بھی اجازت دیدی گئی تھی کہ جن میں وہ پہلے رہا کرتا تھا۔ اور اُس کی بیٹی معروف بیگم صاحب سے ملنے کی بھی اجازت تھی۔ اور محل کی کل متعلقہ عورتیں مثلاً عملہ باورچی خانہ اور ناچنے گانے والیاں وغیرہ سب حاضر رہتی تھیں۔ اور ایسے معاملات میں اُس کی کوئی خواہش رد نہیں کی جاتی تھی اور اب جو یہ بڈھا عابد وزاہد بن گیا تھا بعض ملاؤں کو بھی اُس کے پاس جا کر تلاوت قرآن کی پروانگی تھی اور خاصے گھوڑوں اور باز جرے وغیرہ شکاری جانوروں کے منگا لینے اور ہرنوں اور مینڈھوں وغیرہ کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے کی بھی اجازت تھی غرض کہ اورنگ زیب کا برتاؤ شاہجہاں کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا اور حتی الامکان وہ اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے خاطرداری کرتا اور نہایت کثرت سے تحفے تحائف بھیجتا رہتا اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں اُس کی رائے اور مشورہ کو مثل ایک پیرو مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا تھا۔ اور اُس کے عریضوں سے جو اکثر لکھتا رہتا تھا ادب اور فرماں داری ظاہر ہوتی تھی۔ پس اس طرح سے شاہجہاں کی گردن کشی اور اُس کا غصہ آخرکار یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ معاملات سلطنت کے بارے میں بیٹے کو لکھنے پڑھنے لگا۔ اور داراشکوہ کی بیٹی کو بھی اُس کے پاس بھیج دیا۔ اور وہ بیش بہا جواہرات جن کے دینے سے پہلے انکار کر کے یہ کہدیا تھا کہ اگر پھر مانگو گے تو کوٹ کر چورا کر ڈالوں گا مگر دوں گا نہیں اُن میں سے بھی بعضے جواہر اورنگ زیب کے پاس ازخود

بھیج دیئے بلکہ اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اُس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی۔

حالانکہ اورنگ زیب بڑی لجاجت سے بارہا معافی مانگ چکا تھا اور شاہجہاں اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ مگر میرے اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاہجہاں کی ہر ایک بات بلا عذر تسلیم کر لی جاتی تھی۔ کیونکہ مجھے اورنگ زیب کے ایک عریضہ کی طرز تحریر سے معلوم ہوا کہ جب کبھی یہ بڈھا بادشاہ تحکم کے طور پر اُس کو کچھ لکھتا تھا تو یہ اُس کے جواب میں جرأت کے ساتھ اپنی ہی بات پر قائم رہنے کا اظہار کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُس کے چند فقرے پڑھے ہیں جن کا مضمون یہ تھا۔

"کیا حضور یہ چاہتے ہیں کہ میں سختی کے ساتھ پُرانی رسموں کا پابند رہوں؟ اور جو کوئی ہمارا نوکر چاکر مر جائے اُس کی جائداد ضبط کر لوں، اگرچہ شاہانِ مغلیہ کا یہ دستور رہا ہے کہ اپنے کسی امیر یا کسی دولت مند مہاجن کے مرنے کے بعد بلکہ بعض اوقات تو دم نکل جانے سے بھی پہلے ہی اُس کے تمام مال و اسباب کا تعلیقہ کراتے تھے اور جب تک اُس کے نوکر چاکر جزو کل مال و دولت بلکہ ادنیٰ ادنیٰ زیور بھی نہ بتلا دیں اُن پر مار پیٹ اور قید و بند کا تشدد کیا جاتا تھا اور یہ دستور بے شک فائدہ مند بھی ہے۔ لیکن جو ناانصافی اور بے رحمی اُس میں ہے اُس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور اگر ہر ایک امیر نیک نام خاں کا سا معاملہ کرے یا کوئی عورت اُس بیوہ مہاجنی کی طرح اپنے مال کو پوشیدہ کرے تو اس میں وہ حق بجانب ہے یا نہیں؟

حضور کی خفگی سے بہت ڈرتا ہوں اور اس امر کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ حضور میرے طور طریق کی نسبت غلط فہمی فرمائیں۔ اور جیسا کہ حضور خیال فرماتے ہیں تخت نشین ہونے نے مجھے خود رائے اور مغرور نہیں بنا دیا۔ چالیس برس سے زیادہ کے تجربہ سے حضور خود ہی خیال فرما سکتے ہیں کہ تاج شاہی کس قدر گراں بار چیز ہے۔ اور بادشاہ جب دربار سے اُٹھتا ہے تو کس قدر افکار اُس کے دل کو غمگین اور دردمند بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے مشہور و معروف جدامجد جلال الدین محمد اکبر نے اسی غرض سے کہ اُن کی اولاد دانائی اور نرمی اور تمیز

کے ساتھ سلطنت کرے اپنے عہد سلطنت کی تاریخ میں امیر تیمور گورگان کا ایک ذکر بطور نمونہ لکھکر اپنی اولاد کو اُس کی طرف توجہ دلائی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ جب بایزید یلدرم گرفتار ہوکر امیر تیمور کے حضور میں لایا گیا اور امیر بہت غور کے ساتھ اُس مغرور قیدی کی طرف دیکھکر ہنس دیا ۔ تو بایزید نے اس حرکت سے ناراض ہوکر امیر کو کہا کہ تم کو اپنی فتح مندی پر اس قدر اترانا نہ چاہیئے عزت وذلت منجانب اللہ ہے اور ممکن ہے کہ جس طرح تم آج فتح یاب ہوئے ہو کل میری طرح پکڑے جاؤ۔ امیر نے جواب دیا کہ میں دنیا اور اُس کے جاہ ودولت کی بے ثباتی سے خوب واقف ہوں اور خدا نہ کرے کہ میں اپنے کسی مغلوب دشمن کی ہتک کروں ۔ اور میری ہنسی کا سبب یہ نہ تھا کہ تمھارا دل دُکھاؤں بلکہ مجھے تمھیں دیکھکر اپنی اور تمھاری بدصورتی کے خیال نے بے اختیار ہنسایا کیونکہ تم تو کانے ہو اور میں لنگڑا ہوں ۔ اور یہ بات میرے دل میں گذری کہ تاج سلطنت ایسی کیا چیز ہے جس کو پاکر بادشاہ اپنی ہستی کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ اس کو اپنے ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے جو کانے اور لنگڑے ہوں[۱]۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضور یہ خیال فرماتے ہیں کہ میری مصروفیت بہ نسبت اُن اُمور کے جن کو میں نظم ونسق، ملک داری اور سلطنت کے اندرونی استحکام کے لئے نہایت ضروری جانتا ہوں نئی نئی فتوحات اور ملک گیری کی جانب زیادہ ہونی چاہیئے ۔ اس امر سے میں ہرگز انکار نہیں کرسکتا کہ ایک بڑے شہنشاہ کا عہد دولت نئی نئی فتوحات کی وجہ سے ممیز اور ممتاز ہونا لازم ہے اور اگر میں ایسا نہ کروں تو گویا اپنے نامور بزرگ امیر تیمور گورگان کی نسل کو دھبہ لگاؤں گا ۔ مگر بہرحال یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ مجھے کاہلی اور خاموش بیٹھے رہنے کا الزام دیا جائے ۔ کیونکہ بنگالہ اور دکن میں میری فوجوں کی مصروفیت کو تو حضور بھی عبث خیال نہیں فرماسکتے ۔ اور میں

---

[۱] سلطان بایزید یلدرم کے مغلوب اور قید ہونے کے ذکر میں یہ روایت نہ تیمور نامہ میں لکھی ہے نہ اکبر نامہ میں ۔ س م ع

حضور کو یہ بھی یاد دلاتا ہوں کہ بڑے سے بڑا ملک گیر بھی ہمیشہ سب سے بڑا بادشاہ نہیں ہوا۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ کبھی کبھی دنیا کے اکثر حصے بالکل وحشی اور ناتربیت یافتہ قوموں نے فتح کر لئے ہیں اور نہایت وسیع سلطنتیں تھوڑے ہی عرصہ میں بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہیں۔ پس حقیقت میں سب سے بڑا بادشاہ وہی ہے جو رعایا پروری اور عدل و انصاف ہی کو اپنا حاصل عمر جانے۔

اس عریضہ کے باقی حصہ کے پڑھنے کا مجھے موقعہ نہیں دیا گیا۔

میر جملہ کی کارگذاریاں مہم آسام اور اُس کی موت

اب میں چند کلمے اُس مشہور شخص کے باب میں کہنے چاہتا ہوں جس کو میر جملہ کہتے ہیں اور اُن معاملات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے شاہزادوں کی باہمی لڑائی کے بعد اُس کا تعلق رہا اور یہ کہ اس نامور شخص کا خاتمہ کس طور پر ہوا۔

بنگالہ پر قبضہ حاصل کرنے میں اُس نے سلطان شجاع کے ساتھ وہ بے رحمی اور بے ایمانی نہیں کی جو جیون خاں نے داراشکوہ سے اور سری نگر کے راجہ نے سلیمان شکوہ سے کی تھی۔ بلکہ اس نے ایک ہنرمند سپہ سالار کی طرح ملک پر قبضہ حاصل کیا اور بغیر اس کے کہ کسی دغا اور فریب سے سلطان شجاع کو گرفتار کرے صرف اس پر قناعت کی کہ سلطنت کے چھوڑ دینے اور سمندر کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ سلطان شجاع کی مہم کے خاتمہ کے بعد میر جملہ نے ایک خواجہ سرا کو عرضی دے کر اورنگ زیب کے حضور میں بھیجا اور التماس کی کہ میرے اہل و عیال کو اس کے ساتھ بنگالہ چلے آنے کی اجازت بخشی جائے اور لکھا کہ "لڑائی بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ اور چونکہ میں ضعیف اور بوڑھا ہو گیا ہوں حضور کی نوازش سے مجھے اُمید ہے کہ اس سے زیادہ اہل و عیال سے میری جدائی کو پسند نہ فرمایا جائے گا۔ لیکن اورنگ زیب اس چالاک مدبر کے مطلب کو فوراً سمجھ گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس کے بیٹے محمد امین خاں کو بنگالہ بھیج دیا جائے گا تو میر جملہ یقیناً بنگالہ کا خودسر بادشاہ بننے کا ارادہ کرے گا اور شاید کہ یہ عجیب شخص اس پر بھی قناعت نہ کرے۔ کیونکہ میر جملہ بیدار مغز اولوالعزم۔ شجاع اور دولت مند ہونے کے علاوہ اس وقت ایک فتحیاب فوج کا سپہ سالار تھا۔ اور اُس سے اہل سپاہ کو محبت بھی

تھی۔ اور اُس کا رعب بھی مانتے تھے۔ اور ہندوستان کا سب سے عمدہ صوبہ اُس کے قبضہ میں تھا۔ اور گولکنڈے میں جو معاملات پیش آئے تھے اُن سے ثابت ہو چکا تھا کہ میر جملہ کیسا ایک بے صبر اور بے باک طبیعت کا انسان ہے۔ پس ایسے شخص کی درخواست کو قطعًا رد کر دینا بالضرور خطرناک نتائج کا باعث ہوتا۔ مگر اورنگ زیب نے اس موقعہ پر بھی اپنی مخصوص احتیاط اور دانائی سے کام لیا۔ یعنی میر جملہ کی بیوی اور پوتے پوتیوں کو بنگالہ روانہ کر دیا۔ اور امیر الامراؔ کا خطاب عنایت کیا جو ایک ایسا خطاب ہے جس سے بڑھکر شہنشاہ ہند کوئی خطاب نہیں دے سکتا اور اُس کے بیٹے محمد امین خاں کو میر بخشی کا منصب عطا کیا جو سلطنت کے منصبوں میں دوسرے یا تیسرے درجہ کا منصب ہے مگر اس منصب دار کو ہمیشہ دربار میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اور بادشاہ سے اُس کا علیحدہ ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو بے شک ہے۔ اس کے علاوہ میر جملہ کو بنگالہ کی مستقل صوبہ داری بھی عنایت فرمائی۔

میر جملہ جب اپنی مراد میں کامیاب نہ ہوا تو اُس نے سوچا کہ اگر بیٹے کے بلانے کی مکرر درخواست کروں گا تو یہ امر یقینًا بادشاہ کے عتاب کا باعث ہوگا اس لیے اُس نے بھی اسی کو بہتر جانا کہ ان انعامات شاہی کا شکر بجالائے اور خاموش ہو رہے ان معاملات پر جب کہ ایک سال کے قریب گذر چکا تو اورنگ زیب نے صحیح طور پر یہ خیال کر کے کہ ایک اولوالعزم سپاہی اب زیادہ عرصہ تک نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ اور اگر اُس کو لڑائی بھڑائی میں مشغول نہ رکھا جائے تو خود اپنی ہی سلطنت کے اندر کوئی بکھیڑا کھڑا کر دے گا۔ میر جملہ کو آسام کے راجہ پر فوج کشی کی تیاری کا حکم دیا جو ایک زبردست اور دولتمند راجہ ہے اور جس کا ملک ڈھاکہ کے شمال میں خلیج بنگالہ کے کنارے پر ہے۔

ادھر میر جملہ خود بھی اس مہم کی فکر میں تھا کیونکہ اُس کو امید تھی کہ اس طرح پر سرحد چین تک ملک فتح کر کے ایک دائمی شہرت حاصل کروں گا۔ غرضکہ اورنگ زیب کے پیغام رساں نے میر جملہ کو اس مہم پر پہلے ہی سے آمادہ پایا اور فورًا ایک سپاہ جرار ڈھاکہ سے کشتیوں میں اُس دریا کے راستہ روانہ ہوئی جو آسام سے نکلتا ہے، اور گوشہ شمال و مشرق

لہ ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ اس کو خان خاناں سپہدار بنگالہ لکھا جاتا تھا۔ امیر الامرا کا خطاب شائستہ خاں کا تھا۔ س م ح۔

سے چل کر ایک قلعہ پر جس کو آنزو کہتے ہیں اور جو ڈھاکہ سے قریب تین سو میل کے ہے اور جس کو آسام کے راجہ نے بنگالہ کے ایک صوبہ دار سے سابق میں چھین لیا تھا جا پہنچی۔ اور دس بارہ دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہو گیا۔ اور میر جملہ چمدارا کی طرف جو آسام کا دروازہ سمجھا جاتا ہے بڑھا اور اٹھائیس دن کے لمبے سفر کے بعد وہاں جا پہنچا۔ اور یہاں ایک لڑائی ہوئی اور راجہ شکست کھا کر گرگانوں کی طرف جو آسام کی راجدھانی اور چمدارا سے ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے بھاگ گیا۔ لیکن میر جملہ کے پرزور اور چست تعاقب نے وہاں بھی دم لینے نہ دیا۔ اور بغیر اس کے کہ کچھ مورچہ بندی وغیرہ کر سکے مجبوراً پیچھے کو ہٹتا ہٹتا مملکت لاسا کے کوہستان میں جا گھسا اور چمدارا اور گرگانوں لوٹ لئے گئے۔ خصوصاً گرگانوں سے بہت مال و دولت فوج کے ہاتھ آیا۔ گرگانوں ایک بڑا اور عمدہ شہر ہے اور تجارت کی بڑی منڈی ہے اور یہاں کی عورتوں کا حسن مشہور ہے۔ مگر کثرت بارش کی وجہ سے جو موسم سے ذرا پہلے شروع ہو گئی تھی سپاہ آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ اُس ملک میں اس قدر مینہ برستا ہے کہ بجز گاؤں کی آبادیوں کے جو چھانٹ کر اونچی اونچی زمینوں پر بسائے جاتے سب جگہ پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اور راجہ نے موقعہ پا کر لشکر کے آس پاس کے ملک کو مویشی اور ہر قسم کے مایحتاج سے خالی کر ڈالا۔ اور اگرچہ فوج نے بہت سا مال و دولت جمع کر لیا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ برسات ختم ہو۔ رسد کی طرف سے نہایت دقت اور تکلیف میں پڑ گئی آ
میر جملہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ کیونکہ سامنے جو پہاڑ تھے وہ نہایت ہی دشوار گذار تھے اور پیچھے ہٹنا اس لئے مشکل تھا کہ پانی اور دلدل کی کثرت کے علاوہ راجہ نے ہوشیاری کر کے وہ پشتہ بھی تُڑوا ڈالا تھا ج
پر سے چمدارا کا راستہ تھا بس برسات بھر مجبوراً وہیں ٹھہرنا پڑا۔ مگر خشک موسم کے آنے تک رات دن کی تکلیف
اور رسد کے نہ ملنے سے فوج ایسی شکستہ خاطر ہو گئی کہ میر جملہ کو آسام کی فتح کا ارادہ مجبو
ترک کرنا پڑا۔ اگر یہ فوج کسی اور کم لیاقت سردار کے ماتحت ہوتی تو بنگالہ کو واپس آنا خ
تھا۔ کیونکہ رسد بہت مشکل سے بہم پہنچتی تھی۔ اور راستہ میں دلدل اب بھی اس ک
سے تھی کہ سپاہ جلد جلد کوچ نہیں کر سکتی تھی۔ اور راجہ چُستی کے ساتھ پیچھے لگا ہ
تھا۔ مگر میر جملہ اپنی معمولی ہوشیاری سے لشکر کو ایسے ڈھنگ سے ہٹا لایا کہ اُس
حُسنِ تدبیر کی اور بھی دھوم مچ گئی اور مال و دولت بھی خوب ساتھ لایا۔ اور واپ

ہوئے قلعہ آزو کو خوب مستحکم کر کے ایک جرار سپاہ وہاں اس غرض سے چھوڑا یا کہ اگلے برس کے شروع میں برسات سے پہلے پہلے پھر چڑھائی کی جائے۔ لیکن یہ نامی سردار مرض پیچش سے جو اُس کے لشکر میں بنگالہ پہنچتے ہی پھیل گیا تھا مر گیا۔ اور جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اُس کی وفات سے تمام ہندوستان میں تہلکہ پڑ گیا۔ مگر بہت سے عقلمند لوگوں کا قول یہ ہے کہ حقیقت میں اورنگ زیب بنگالہ کا بادشاہ ابھی ہوا ہے۔ اگرچہ اورنگ زیب میر جملہ کی خدمات کا معترف اور شکر گذار تھا۔ لیکن شاید ایک ایسے نائب السلطنت کے مر جانے سے جس کا اقتدار اور دانشمندی اُس کو ہمیشہ مشوش رکھتی تھی غمگین نہیں ہوا۔ چنانچہ سر دربار محمد امین خاں سے کہا۔

"افسوس ہے کہ تمھارا شفیق باپ اور ہمارا نہایت قوی اور نہایت خوفناک دوست چل بسا"

مگر بہر حال اورنگ زیب نہایت مہربانی اور فیاضی کے ساتھ محمد امین خاں سے پیش آیا۔ اور اُس کو یقین دلایا کہ اپنے باپ کی جگہ اب ہم کو سمجھو۔ اور بجائے اس کے کہ اُس کی تنخواہ میں کچھ کمی کرے۔ یا میر جملہ کے مال و دولت کو ضبط کرے محمد امین خاں کو میر بخشی کے عہدہ پر مستقل کر دیا۔ بلکہ تنخواہ میں ایک ہزار روپیہ ماہوار کا اضافہ کر دیا۔ اور اُس کے باپ کے کل مال و دولت سے بھی کچھ تعرض نہیں کیا[1]

شائستہ خاں اراکان کی مہم پر

اب میں تھوڑا سا حال اورنگ زیب کے ماموں... شائستہ خاں کا جس کا کچھ ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے اور جس کی مؤثر تقریریں اور جوڑ توڑ اُس کے بھانجے کے لئے ایسے عظیم الشان مرتبہ پہ پہنچنے کا باعث ہوئے۔ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تم پڑھ چکے ہو کہ کھجوہ کی لڑائی سے

---

[1] میر جملہ کا ایک مظفرانہ طور پر آسام سے واپس آنا جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے درست نہیں ہے اور اُس کے علاوہ اور بھی غلطیاں ہیں۔ اور اس مہم کا صحیح اور مفصل حال جو کوچ بہار اور آسام دونوں پر ایک ہی وقت میں کی گئی تھی عالمگیر نامہ میں اس خوبی سے لکھا ہے کہ اُس وقت کی فارسی تاریخوں میں ایسے عمدہ طور کا بیان شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے اور اگرچہ وہ تفصیل اور جزئیات سب کے سب نہایت ہی دلچسپ اور قابل دید ہیں لیکن اگر اُن کو پورا نقل کیا جاتا تو بجائے خود ایک چھوٹی سی کتاب بن جاتی اس لئے کچھ اُس کا خلاصہ لکھ کر بطور ایک حاشیہ کی اس جلد کے خاتمہ میں لگا دیا گیا ہے اُس کو ملاحظہ کرنا چاہتے ہیں۔ ع

پہلے جب کہ اورنگ دارالخلافت سے شجاع کے مقابلہ کو گیا تھا شائستہ خاں آگرہ کا صوبہ دار مقرر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا اور وہاں کی سپہ سالاری بھی اسی کو تفویض کی گئی۔ اور اب میر جملہ کی وفات کے باعث بنگالہ کا صوبہ دار اور وہاں کی فوج کا سپہ سالار بھی مقرر ہوا۔ اور امیرالامرا کا خطاب بھی اُس کو دیا گیا۔ شائستہ خاں کی ناموری کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنگالہ پہنچتے ہی جو مہم عظیم اُس نے اپنے ذمہ لی تھی۔ اُس کا بیان کیا جائے۔ اور جب یہ خیال ہوتا ہے کہ خدا جانے کس باعث سے اُس کے نامور جانشین سابق (میر جملہ) نے اُس کو اختیار نہیں کیا تھا تو یہ مہم اور بھی زیادہ توجہ کے قابل ہو جاتی ہے۔ اور میرے اس بیان سے مملکت بنگالہ اور اراکان کی گذشتہ اور موجودہ حالت جو اب تک لوگوں کو چنداں معلوم نہیں ہے منکشف ہو گی۔ اور کچھ اور حالات بھی جو توجہ کے لائق ہیں ظاہر ہوں گے مگر اس مہم کی کیفیت معلوم ہونے اور اُن واقعات کے بخوبی سمجھنے کے لئے جو خلیج بنگالہ میں واقع ہوئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اراکان میں جسے مگہ لوگوں کا ملک بھی کہتے ہیں برسوں سے بہت سے لوآباد پرتگیز اور عیسائی غلام اور دوغلے پرتگیز اور اہلِ فرنگ جو اِدھر اُدھر کے ملکوں سے آن کر جمع ہو گئے تھے رہتے تھے اور یہ ریاست اُن بدچلن لوگوں کے لئے جائے پناہ تھی جو گوا۔ سیلان۔ کوچین۔ ملاکا اور ہندوستان کے اور مقامات سے جو قبل ازیں پرتگیزوں کے قبضہ میں تھے یہاں چلے آتے تھے۔ اور جو بدمعاش فقیر اپنی خانقاہوں کو چھوڑ آتے تھے یا جو بداطوار لوگ دو تین عورتوں سے شادی کر کے یا کسی اور بڑے گناہ کے مرتکب ہو کر بھاگ آتے تھے یہاں اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ یہ صرف نام کے عیسائی تھے۔ اور اراکان میں ان کا طرز معاشرت نہایت قابلِ نفرت تھا۔ چنانچہ بے دھڑک ایک دوسرے کو قتل کرتے یا زہر دید یتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے واعظ پادریوں کو بھی جو سچ پوچھو تو وہ بھی ان سے کچھ کم نہ تھے مار ڈالتے تھے۔ اور اراکان کے راجہ نے جو ہمیشہ سلاطین مغلیہ سے خائف رہتا تھا۔ اپنے ملک کی سرحد پر اُن کے وجود کو بمنزلہ ایک جنگی چوکی کے کارآمد سمجھکر چاٹ گام کی بندرگاہ اور بہت سی زمینیں آبادی کے لئے اُن کو دے رکھی تھیں۔ اور چونکہ وہ اُن لوگوں سے کسی طرح کی مزاحمت اور بازپرس نہیں کرتا تھا۔ تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان بدمعاش اور بے لگام لوگوں کا پیشہ لوٹ کھسوٹ اور سمندری

غارت گری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ یہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چڑھکر ادھر ادھر سمندر میں گشت لگاتے اور گنگا کی بے شمار شاخوں اور کھاڑیوں میں جا گھستے۔ اور زیریں بنگالہ کے جزیروں کو تباہ و برباد کرتے۔ اور اکثر سو ڈیڑھ سو میل تک ملک کے اندر چلے آتے تھے اور جہاں کہیں بازار لگا ہوا ہوتا یا کوئی شادی بیاہ یا کوئی اور تقریب ہوتی وہاں یکایک جا پڑتے اور تمام لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ اور بدنصیب قیدیوں کو غلام بناتے۔ اور جو چیز اٹھائی نہ جاتی اس کو جلا ڈالتے تھے۔ اور یہ اس ہمیشہ کی لوٹ مار ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم گنگا کے دہانہ پر ایسے عمدہ جزیروں کو جو کسی وقت خوب آباد اور معمور تھے۔ ویران اور سنسان پڑا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور سوائے شیروں اور جنگلی جانوروں کے اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔ اور ان قیدیوں کے ساتھ وہ بڑی بے رحمی اور بدسلوکی سے پیش آتے تھے اور ان کو یہاں تک جرأت ہو گئی تھی کہ بڈھے آدمیوں کو نکمے اور بیکار جان کر انھیں مقامات میں بیچنے کو لے جاتے تھے۔ جہاں سے ان کو پکڑ کر لاتے تھے اور اکثر دیکھا جاتا تھا کہ وہ جوان شخص جو کل اتفاقاً بھاگ کر ان کے ہاتھ سے بچ گئے تھے آج اپنے بڈھے باپ کو خرید کر ان کے پنجہ سے چھڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جوان قیدیوں کا یہ حال تھا کہ یا تو ان کو قزاقی سکھاتے تھے یہاں تک کہ وہ خود قتل و غارت کے شایق بن جاتے تھے۔ یا ان کو گوا۔ سیلان۔ اور سین طامس کے پرتگیزوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ بلکہ خاص بنگالہ میں ہگلی کے رہنے والے پرتگیز بھی ان بیچاروں کے خرید لینے میں کچھ تامل نہ کرتے تھے اور یہ ہولناک تجارت گالیس تک بھی ہوتی تھی جو راس[1] ڈاس پال ماس کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ ان قزاقوں کا یہ معمول تھا کہ فروخت طلب غلاموں کو کشتیوں میں بھر کر مقررہ مقامات پر لے جاتے اور باہمی قرارداد کے مطابق پرتگیزوں کے آنے کے منتظر رہتے تھے۔ اور وہ ان سب کو نہایت ہی ارزاں قیمت پر خرید لے جاتے تھے اور نہایت افسوس ہے کہ پرتگیزوں کے زوال قوت کے بعد فرنگستان کی اور قوموں نے بھی چاٹگام کے ان قزاقوں کے ساتھ (جو یہ شیخی بگھارتے ہیں کہ ہم ایک سال کے اندر اس قدر ہندوؤں کو عیسائی بنا لیتے ہیں جو پادری لوگ تمام ہندوستان میں دس برس میں بھی نہیں بنا سکتے) اس مذموم تجارت

---

[1] راس ڈاس پال ماس۔ افریقہ کے اس مغربی ساحل کے نزدیک واقع ہے جس کو انگریزی میں گولڈ کوسٹ (یعنی ساحل الذہب) کہتے ہیں اور جزائر سین طامس اور گالیس بھی اسی

کو جاری رکھا۔ سبحان اللہ۔ عیسائی مذہب کے پاک اوامر کو اس طرح سے متواتر توڑنا اور اُس سے نواہی کی تحقیر کر کے علانیہ اُس کے برخلاف عمل کرنا کیا ہی عمدہ طریقہ ہمارے دین مقدس کے پھیلانے کا ان کمبختوں نے نکالا ہے۔

جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں پرتگیزوں کا حال

یہ لوگ ہگلی میں جہانگیر کی مہربانی سے آباد ہوئے تھے جو عیسائیوں سے بالکل تعصب نہ کرتا۔ اور اُن کی تجارت سے فوائد کثیر حاصل کرنے کی اُمید رکھتا تھا۔ علاوہ بریں ان لوگوں نے اُس سے یہ عہد بھی کیا تھا۔ کہ ہم خلیج بنگالہ کو بحری قزاقوں سے محفوظ رکھیں گے مگر شاہجہاں نے جو باپ کی بہ نسبت مذہب اسلام کا زیادہ پابند تھا اِن کو اس سبب سے سخت سزا دی کہ وہ نہ صرف اراکان کے قزاقوں کو جرأت دلاتے تھے۔ بلکہ خود بھی بہت سے غلام جو بادشاہی رعیت تھے اپنے پاس رکھکر اُن کے آزاد کرنے سے انکار کرتے تھے۔ پس اُس نے اول تو دھمکا کر اور پھسلا کر بہت سا روپیہ وصول کیا مگر جب بادشاہ کے احکام کے موافق جن جن باتوں کی تعمیل مطلوب تھی، نہیں ہوئی تو آخر کار محاصرہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا گیا اور عموماً سب کو غلام بنا کر آگرہ بھیج دیا۔ زمانہ قریب کی تاریخوں میں ان لوگوں کی مصیبت کی کوئی مثال پائی نہیں جاتی۔ بلکہ وہ اس گروہ بنی اسرائیل کی مصیبت سے بہت کچھ مشابہ تھی جو بیت المقدس سے قید کیے جا کر سب بابل کو بھیج دیئے گئے تھے[۱] کیونکہ شاہجہاں کے حکم کی تعمیل سے نہ کوئی بچہ ہی مستثنیٰ رہا نہ کوئی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کے نزدیک ہیں۔ یہ سب مقام زمانہ سابق میں پرتگیزوں کے تحت حکومت تھے۔ اور چونکہ سینٹ طامس ایک جگہ مدراس کے قریب بھی پرتگیزوں کے قبضہ میں تھی۔ اس لئے سیاق کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وہ افریقہ کا سینٹ طامس مراد نہیں ہے۔ س م ح

[۱] یہ ماجرا بنی اسرائیل کے قصص تاریخی سے متعلق ہے اور مختصر بیان اس کا اس طرح پر ہے کہ الیاقیم ابن یوشیا بیت المقدس میں آل یہودا ابن یعقوب علیہ السلام کا ۱۴ واں ۱۸ہہ ہو طلی میں جس کو اب ر ۱۹۸۶ء اور سنہ ۳۰۴۰ھ) سے دو ہزار چھ سو ستاون برس کا عرصہ گذرا۔ اس طرح پر بادشاہ ہوا تھا کہ مصر کے بت پرست بادشاہوں میں سے جو فرعون کہلاتے تھے اُس کے ایک ہم عصر فرعون نے اس کے بھائی یوحاز کو مغلوب اور قید کر کے الیاقیم کو بطور اپنے خراج گذار کے اور یویاقیم نام رکھکر بنی یہودا کا بادشاہ بنا دیا تھا۔ یہ بادشاہ بہت ظالم تھا اور جیسا کہ اور بنی اسرائیل بھی بعض اوقات کرتے رہتے تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اس نے شریعت موسوی کے برخلاف بت پرستی اختیار کرکے اس طریق کو رواج دینا شروع کیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت اوریا نبی کو جو حضرت یرمیا نبی کی طرف سے شرع موسوی کے موافق بنی اسرائیل کو گمراہیوں اور جور و جفا اور سخت بدعتوں اور اعمال قبیحہ اور بت پرستی سے منع کرتے اور قہر الٰہی کے نازل ہونے سے ڈراتے تھے ناراض ہوکر اس بادشاہ نے قتل کرنے کا ارادہ کیا اور آخر کار مصر سے کہ جہاں وہ بھاگ کر چلے گئے تھے ڈھونڈ واکر اور اپنے مربی فرعون کی معرفت پکڑ منگا کر بیت المقدس میں قتل کرا دیا۔ بطور انتقام الٰہی ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔

کہ بخت نصر ثانی پسر نب پلسر۔ کلدانیوں کے بت پرست بادشاہ نے جس کے خاندان کی سلطنت عراق میں تھی اور دریائے فرات کے نزدیک شہر نینوا اور بابل (کربلائے معلی اور بغداد کے قریب) ان کے دارالحکومت تھے ۶۰۴ء ہو ظلم میں بادشاہ ہوکر اول تو اُن قبائل کو جو ملک فلسطین میں رہتے تھے مملکت بابل کا مکرر مطیع کیا۔ اور بعد ازاں یویاقیم کے گیارھویں سال جلوس میں ایک لشکر عظیم کے ساتھ اپنے دارالملک نینوا سے بیت المقدس پر چڑھائی کی اور یویاقیم جو اُس کے مقابلہ میں محض بے حقیقت تھا بجز اطاعت کے کوئی چارہ نہ دیکھکر معہ سرداران آل یہودا حاضر ہوگیا۔ چنانچہ بخت نصر نے بلا مقابلہ و مزاحمت شہر میں داخل ہوکر بیت المقدس پر قبضہ کرلیا اور جب کل بندوبست حسب دل خواہ کر چکا تو یاقیم کو پابہ زنجیر کرکے معہ اُس کی ماں اور ملکہ اور بیٹیوں اور دس ہزار اور یہودیوں کے کہ جن میں سے ایک ہزار شہزادے اور سردار اور جنرل اور سات ہزار سپاہی تھے اور دو ہزار اور عوام الناس اور جن میں حضرت دانیال پیغمبر پسر یوحنا یویاقیم کے بھتیجے بھی بارہ برس کی عمر میں معہ بعض اور صلحائے قوم کے تھے سب کو قید کرکے بابل کو بھیج دیا اور اپنے سپہ سالار بنوزردان کو حکم دے کر بیت المقدس کو جلا کر خاک سیاہ اور بے نشان کر ڈالا۔ اور بے شمار باشندگان ملک کو قتل کرایا۔ اور جو مال و دولت کہ مسجد اقصیٰ اور خزانہ شاہی اور رعایا کے گھروں میں تھا سب لوٹ کھسوٹ کر اور ستر ہزار بوجھے لاد کر نینوا کو چلا آیا۔ اور بنی اسرائیل میں سے ایک اور شخص کو اپنی طرف سے وہاں کا حاکم بنا کر یہودا بن یعقوب کے خاندان کی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ چونکہ بیت المقدس کی خرابی عبری گیارھویں مہینے آب کی نویں تاریخ کو ہوئی تھی اس لئے بنی اسرائیل اب تک سوگ مناتے ہیں۔ س م ع

ماخوذ از ناسخ التواریخ۔

واعظ اور نہ کوئی درویش۔ چنانچہ حسین اور خوبصورت عورتیں تو کیا بیاہی کیا کنواری لونڈیاں بنا کر محل سرائے شاہی میں بھیج دی گئیں۔ اور جو زیادہ عمر کی تھیں یا اُن کی شکل اچھی نہ تھی امیروں کو تقسیم کی گئیں۔ اور کم سن لڑکے ختنہ کئے جا کر غلام بنائے گئے۔ اور جو جوان تھے وہ بڑے بڑے وعدوں کی اُمید پر یا ہاتھی کے پاؤں سے کچلوائے جانے کی متواتر دھمکیوں سے مسلمان ہو گئے۔ البتہ چند درویش اپنے مذہب پر قائم رہے اور فرقہ جیسویٹ کے عیسائیوں اور پادریوں کی مہربانی سے جنھوں نے اس آفت کے زمانہ میں بھی آگرہ کا رہنا ترک نہ کیا اور بہت سا روپیہ خرچ کرکے اور دوستوں سے سعی سفارش کرا کر اپنے فیاضانہ ارادہ میں کامیاب ہوئے گوا اور اُور مقامات مقبوضہ اہل پرتگال کو بھیجے گئے مگر ہگلی کے حادثہ سے پہلے یہ پادری بھی شاہجہاں کے عتاب سے نہ بچے تھے۔ چنانچہ اُس نے آگرہ کا عالی شان اور خوبصورت گرجا جو جہانگیر کے عہد میں مع ایک اور گرجا کے جو لاہور میں بنایا گیا تھا مسمار کرا دیا تھا۔ اس گرجا کے مینار پر ایک گھنٹہ لگا ہوا تھا جس کی آواز تمام شہر میں سُنائی دیتی تھی[1]

---

[1] شاہجہاں کے مورخ خاص ملا عبدالحمید لاہوری نے ہگلی کے پرتگیزوں کے اس واقعہ کو بادشاہ نامہ میں یوں لکھا ہے کہ "بنگالیوں کے عہد میں (یعنی ہمایوں اور اکبر کے زمانہ سے پہلے جبکہ بنگالہ میں تیموریہ خاندان کی حکومت نہ تھی) فرنگی سوداگروں کا ایک گروہ جو سراندیپ (لنکا) کے رہنے والے تھے۔ ساتگاؤں (چاٹگام) میں آمد و رفت رکھتا تھا ان لوگوں نے ساتگاؤں سے آگے بڑھ کر کھاڑی کے کنارے (جس کو ملا عبدالحمید "خور" لکھتا ہے) اس بہانہ سے کہ خرید و فروخت کے لئے کوئی جگہ چاہیئے بنگالیوں کی اجازت سے جہاں اب شہر ہگلی آباد ہے اول چند گھر بنائے۔ اور بمرور ایام حکام بنگالہ کی بے شعوری اور لاپروائی سے اس نئی آبادی میں بہت سے فرنگی جمع ہو گئے۔ اور ان لوگوں نے یہ کام کیا کہ ایک طرف تو دریا موجود ہی تھا باقی تینوں طرف عمیق خندق کھدوا کر اور پانی سے بھر کر اس مقام کو ایک جزیرہ کی شکل بنا لیا۔ اور اُس کے اندر مضبوط اور عالی شان عمارتیں بنا کر توپ بندوق اور سامان جنگ سے خوب مستحکم کر لیا۔ اور یہ آبادی ایسی بڑھی کہ بندر ساتگاؤں کا بازار سرد ہو گیا۔ اور جہازات فرنگ کی آمد و شد اور خرید و فروخت اسی جگہ مقرر ہو گئی۔ اور یہ مقام ایک بڑا شہر بن کر بندر ہگلی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے ہوگلی کی کھاڑی کے دونوں طرف جو پرگنے تھے تھوڑے تھوڑے معاملہ پر وہ بھی اجارے پر لئے اور وہاں کی رعایا کو زبردستی اور طمع دونوں طور سے کرسچن بنا بنا کر فرنگستان کو بھیجنا شروع

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کیا۔ اور اگرچہ رعیت کے کم ہو جانے سے اجارہ کا روپیہ گرہ سے بھرنا پڑتا تھا۔ مگر باوجود اس کے وہ اس فعل کو موجب ثواب سمجھکر اس نقصان کو سوداگری کے نفع سے پورا کرتے تھے اور آخر کار اُن کی یہ کارروائی محال اجارہ کے دیہات پر ہی محدود نہ رہی تھی بلکہ دریا کنارہ کا جو کوئی آدمی تابو چڑھ جاتا اُس کو بھی پکڑ کر اسی طرح عمل کرتے تھے۔ شاہجہاں کو جو اپنے باپ کے عہد میں بنگالہ جانے کا اتفاق ہوا تو بادشاہی رعایا اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کا یہ طرز سلوک بہت ناگوار گذرا اور اُس وقت سے ان کی بیخ کنی کا خیال اُس کے دل میں ایسا جما کہ جب وہ بادشاہ ہوا۔ اور قاسم خاں کو بنگالہ کی صوبہ داری پر مقرر کیا تو اُس "عقدۂ دشوار کشا" کے کھولنے کو خشکی اور تری دونوں طرف سے حملہ کرنے کی تدبیریں اُس کو اپنی زبان خاص سے سمجھائیں جس کے موافق خان مذکور نے صوبہ کے اور ضروری انتظاموں سے فارغ ہوکر سردی کے اخیر میں بماہ شعبان سن ایک ہزار اکتالیس ہجری الہ یار خاں نامی ایک سردار کو معہ عنایت اللہ اپنے بیٹے اور کئی اور سرداروں اور امیروں کے یہ تدبیر سمجھائی کہ اول بردوان جاکر ٹھہریں۔ اور بجائے ہوگلی کے یہ مشہور کردیں کہ بردوان کی طرف مقام ہجلی کی تاخت وتاراج کے لئے یہ فوج آئی ہے۔ اور بہادر نامی ایک سردار کو جو اُس کا ذاتی ملازم اور نہایت محل اعتماد تھا مخصوص آباد (مرشد آباد) کے محال خالصہ کے بندوبست کے بہانہ سے اُس کو یہ سمجھا کر روانہ کیا کہ ضرورت کے وقت اللہ یار خاں اور عنایت اللہ کے پاس پہنچ کر شامل ہو جانا اور یہ سب احتیاطیں اس اندیشہ سے تھیں کہ کہیں اس ارادہ کی خبر پاکر پرتگیز لوگ مال و عیال کو لے کر اپنی کشتیوں میں نہ جا چڑھیں۔ علاوہ بریں یہ تدبیر کی گئی کہ چند سرداروں نے سری پور بندر سے لواڑہ میں بیٹھکر اول کھاڑی کے دہانہ کو جا روکا اور بعد ازاں الہ یار خاں اور عنایت اللہ نے بردوان سے دفعتہً کوچ کرکے ایک جگہ سات گاؤں اور ہگلی کے بیچ میں آ ڈیرا کیا۔ اور بہادر نے پانچ سو سواروں اور پیادوں کی جمعیت کثیر سے مخصوص آباد سے آکر اور خواجہ شیر وغیرہ کے ساتھ جو لواڑہ میں سری پور سے آئے تھے شامل ہو کر ہگلی کی کھاڑی میں ایک تنگ جگہ کشتیوں سے پل باندھکر اُن کے سمندر میں بھاگ جانے کا رستہ بند کر دیا اور بعد اس کے دوسری ذی الحجہ ۱۰۴۱ھ کو کھاڑی اور خشکی دونوں طرف سے آگے کو بڑھے۔ اور قصبہ بالی میں پہنچ کر جو یہ بستی بھی خندق سے اس طرف پرتگیزوں ہی کے متعلق تھی اُن کے ایک گروہ کو تہ تیغ کیا۔ اور جو کچھ ملا لوٹ لیا۔ اور کچھ سپاہ نے کھاڑی کے دونوں طرف اُن کے اجارے کے پرگنوں میں داخل ہوکر نصرانی اجارہ داروں کو قتل و قید کیا اور سب سے زیادہ کارآمد تدبیر یہ کی کہ اُن کے لواڑہ کے ملازموں کے اہل و عیال کو بھی جو سب بنگالی تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ پکڑ لائے جس کے باعث ایسی ضرورت کے وقت چار ہزار ملاح اُن کی نوکری چھوڑ کر بادشاہی لشکر میں حاضر ہو گئے۔ اس کے بعد بادشاہی سرداروں نے خاص ہگلی کو جا گھیرا۔ اور ایام محاصرہ میں ساڑھے تین مہینے تک اُن کی یہ حالت رہی کہ کبھی تو لڑائی لڑتے تھے اور کبھی صلح کے پیغام و سلام بھیجتے تھے اور اس کج وار و مریز سے اصل مقصود یہ تھا کہ فرنگستان سے کمک آنے کے منتظر تھے۔ چنانچہ اسی پیغام و سلام میں اگرچہ بطور تمہید صلح اور عذر و معذرت کے ایک لاکھ روپیہ نقد بھی نذر کر دیا مگر باوجود اس کے تقریباً سات ہزار بندوقچی جو حالت محاصرہ میں اُن کے پاس موجود تھے اُن کو لڑنے کے لئے بھی مامور کئے رکھا۔ اور جس باغ میں بادشاہی سپاہ اُتری ہوئی تھی اُس کے درختوں کو بھی چھٹوا دیا تاکہ بندوقوں کی زد سے پناہ نہ مل سکے۔ آخرکار بادشاہی سرداروں نے (جو دریائی لڑائی میں عموماً لاچار تھے۔ یہ تدبیر کی کہ بیلدار لگا کر گرجا کی طرف کی خندق میں (جس کا عرض اور عمق کم تھا) چھوٹی چھوٹی نالیاں کھدوا کر اس کو پانی سے خالی کر ڈالا اور اپنے مورچوں میں سے تین سرنگیں لگائیں جن میں سے دو کو تو خبر پا کر انھوں نے خراب کر دیا۔ مگر تیسری سرنگ ٹھیک اُس مکان تک جا پہنچی جو سب میں اونچا اور زیادہ مضبوط تھا اور جس میں بہت سے فرنگی جمع رہتے تھے۔ اور جب اُس سرنگ میں بارود بھر دی گئی تو چودھویں ربیع الاول کو اُسی مکان کے سامنے صفِ لشکر آراستہ کی گئی تاکہ لڑائی کا زور اسی طرف سمجھ کر وہ سب ادھر ہی آن کر جمع ہو جائیں۔ اور جب ایسا ہی ہوا تو اول توپ اور بندوق سے لڑائی شروع کر کے آخرکار سرنگ کو آگ دیدی جس سے وہ مکان اور بہت سے فرنگی دھوئیں کی طرح اُڑ گئے۔ اور باقی ماندہ جو اپنی کشتیوں میں جا چڑھنے کو بھاگے تو مارے گھبراہٹ کے اکثر تو پانی میں ڈوب گئے۔ اور جو لوگ ڈوبتے اُچھلتے کشتیوں تک جا بھی پہنچے اُن کو بادشاہی نواڑہ کی فوج نے جا لیا یہاں تک کہ پرتگیزوں نے اپنی تباہی کو یقینی جان کر اپنے ایک بڑے جہاز کو جس میں قریب دو ہزار کے مرد و عورت اور بہت سا مال و اسباب اور بارود کا ذخیرہ تھا اس خیال سے کہ غنیم کے ہاتھ نہ پڑے بارود میں آگ دے کر از خود جلا دیا۔ اور اسی طرح جو لوگ چھوٹی کشتیوں میں چڑھ گئے تھے انھوں نے بھی اپنے آپ کو جلا کر ہلاک کر ڈالا غرضکہ چونسٹھ بڑے ڈونگوں اور ستاون غراب اور دو سو جلیوں میں سے صرف ایک غراب اور دو جلیے تو محض اس وجہ سے کہ یورش کے وقت چند تیل کی شاہی کشتیوں میں آگ لگ کر کچھ راستہ کھل گیا تھا، بچ کر نکل گئے مگر اس کے سوا جو کچھ آگ اور پانی سے بچا سب بادشاہی لشکر کے قابو میں آگیا۔ اور شروع جنگ سے اس وقت تک اگرچہ لشکر شاہی میں سے تو صرف ایک ہی ہزار آدمی مارے گئے۔

ہگلی کے چھن جانے سے پہلے جب کہ باشبیان کان سالو اراکان کے قزاقوں کا سرغنہ تھا اور ایسا نامی اور زبردست شخص ہو گیا تھا کہ شاہ اراکان کی بیٹی سے اُس نے شادی کرلی تھی ان قزاقوں نے گوا کے والیسرائے کی خدمت میں باقاعدہ طور پر یہ درخواست پیش کی تھی۔ کہ اگر آپ چاہیں تو تمام ملک اراکان پر ہم آپ کا قبضہ کرا سکتے ہیں۔ پرتگیزوں کی اس وضع اور رویہ کے پیش نظر جو انھوں نے جاپان۔ پیگو۔ اتھو پیا اور دوسرے ملکوں میں اختیار کر رکھا تھا اس تجویز کو قبول کر لینا خلاف توقع نہ ہوتا۔ مگر کہتے ہیں کہ ویسرائے گوا نے غرور اور حسد کے مارے اس کو منظور نہ کیا۔ اور اُس کو یہ امر نازیبا معلوم ہوا کہ شاہ پرتگال ایک ایسے بڑے معاملہ میں ایک ایسے چھوٹے اور کم اصل شخص کا احسان اُٹھائے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مگر اس آفت خیز لڑائی میں محصوروں کے عورت مرد بوڑھا جوان دس ہزار کے قریب ضائع ہوئے اور ما بقی "نصرانی مرد و عورت" چار ہزار چار سو قید ہوئے۔ اور رعایائے بادشاہی میں سے جو دس ہزار آدمی کے قریب ان کی قید میں تھے اُن کو رہائی دی گئی اور ۱۱ محرم ۱۰۴۲ھ کو قاسم خاں کے بیٹے عنایت اللہ مذکور نے بنگالہ سے آکر چھوٹے بڑے چار سو مرد و عورت "اسیرانِ فرنگ" دیا اگرچھاپہ میں کچھ غلطی ہو گئی ہو تو وہی چار ہزار چار سی معہ اُن کے بتوں کے (جو رومن کیتھلک عیسائیوں کے گرجاؤں میں اکثر ہوا کرتے ہیں) بادشاہ کی نظر سے گذرانے جب نے ان کی نسبت یہ حکم دیا کہ سختی کے ساتھ قید رکھے جائیں اور جو کوئی مسلمان ہو جاوے اُس کا گزارہ مقرر کیا جائے۔ اور جو مسلمان نہ ہو وہ برابر قید رہے۔ چنانچہ بعضے تو مسلمان ہو کر مورد عنایات ہو گئے اور بعضے قید ہی مر گئے اور اُن کے بتوں میں سے جو مورتیں کہ بعض پیغمبروں کی تھیں اُن کو تو ادب کے خیال سے دریائے جمنا میں ڈلوا دیا اور باقی کو توڑ واڈالا۔

صاحب سیر المتاخرین نے ملا عبدالحمید کی طرح اُن کو محض سراندیپ کے فرنگی نہیں بتایا بلکہ جیسا کہ چاہیے تھا بہ تخصیص تو میت "پرتکیس" لکھا ہے۔ اور اس مصیبت کا باعث اُن کا "تمرد اور بغاوت" اور قیدیوں کی تعداد چار ہزار چار سو زن و مرد لکھی ہے۔ اور چونکہ سرنگ اُڑنے کے بعد بادشاہنامہ میں بھی اتنے ہی آدمیوں کا قید ہونا لکھا ہے اس لئے اغلب ہے کہ یہی شمار صحیح ہو مگر ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ چار ہزار چار سو نصرانی قیدیوں میں سے ہندوستانی نصرانیوں کو چھوڑ کر صرف چار سو گورے چٹے فرنگی مردوں اور عورتوں ہی کو چھانٹ کر غلامی کے لئے حاضر کیا گیا ہو۔ ۱۲

س م ح۔

پرتگیزوں کی بداعمالی

امر واقعی یہ ہے کہ ہندوستان میں پرتگیزوں کے زوالِ طاقت کا باعث اُن کی بداعمالی ہے۔ اور جیسا کہ وہ خود بھی قبول کرتے ہیں اس کو غضب الٰہی کا ایک نشان سمجھنا چاہیے۔ اگلے زمانہ کے پرتگیزوں کا ہندوستان میں بڑا نام تھا۔ اور تمام ہندوستانی رؤسا اُن کی دوستی کے خواہاں تھے۔ اور وہ جرأت دینداری دولت مندی اور بڑی بڑی عظیم الشان مہموں کے سر کرنے میں مشہور تھے[1] اور وہ ایسے نہ تھے جیسے کہ آج کل کے پرتگیز ہیں جو ہر ایک معیوب فعل کے عادی ہیں اور جن کا ہر ایک ذلیل اور بدحیایانہ کام میں دل لگتا ہے۔

اسی زمانہ کے قریب جس کا میں ذکر کر رہا ہوں جزیرہ سوندیپ[2] کو ان دریائی قزاقوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا جو گنگا کے دہانہ کی ناکہ بندی کے لئے ایک اہم اور کارآمد ناکا تھا اور وہ نامی بدمعاش فراجوان جواگسٹاین فرقہ کے درویشوں میں سے تھا نہ معلوم کس فن وفریب سے وہاں کے حاکم کو نکال کر ایک مدت تک اس جزیرہ کا چھوٹا سا راجہ بنا رہا اور یہ وہی قزاق تھے جن کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے کہ اپنی گیلی[3] آس قسم کی کشتیوں میں

---

[1] اس کتاب کے مترجم انگریزی مسٹر ارونگ براک نے پرتگیزوں کے ہندوستان میں آنے اور ان کے عروج و زوال کا حال ایک حاشیہ میں بہت تفصیل سے لکھا تھا۔ چونکہ وہ دلچسپ مضمون کسی قدر طولانی ہے اس لئے خفیف کمی بیشی کے ساتھ ہم نے اس جلد کے خاتمہ میں لگا دیا ہے۔ س م ح

[2] یہ چھوٹا سا جزیرہ خلیج بنگالہ میں چاٹ گام کے نزدیک ہے۔ س م ح۔

[3] اہل فرنگ گے لی اور گے لی آس مندرجہ ذیل شکل کی ایسی کھلی کشتیوں کو کہتے ہیں جیسی کہ اکثر پنجاب اور ہندوستان کے بعض بڑے دریاؤں میں ہوتی ہیں چپوؤں سے کھیتی جاتی ہیں۔ ضرورت کے وقت ان پر بادبان بھی چڑھا سکتے ہیں۔ ایک مختصر سا کمرہ بھی ایک سرے پر بنا ہوا ہوتا ہے۔ اور گے لی اور گیلی آس میں صرف اتنا فرق ہے۔ کہ گیلی آس اُس سے زیادہ اونچی ہوتی ہے۔ اور باقی ترکیب اور وضع سب وہی ہے اُس وقت کی فارسی تاریخوں میں بنگالہ کی ان دریائی لڑائیوں کے ذکر میں تین قسم کی کشتیاں لکھی ہیں۔

(۱) غراب یعنی ڈونگہ (۲) ڈونگہ کلاں (۳) جلبیہ فرنگی۔ پس معلوم ہوتا ہے ڈونگہ کلاں تو گیلی سے مراد ہے۔ اور جلبیہ فرنگی گیلی آس سے اور ان پر توپوں کے چڑھانے کی بھی گنجائش ہوتی تھی۔ س م ح

بیٹھکر سلطان شجاع کے پاس ڈھاکہ میں اس غرض سے آئے تھے کہ اُس کو اراکان لے جائیں ۔اُس موقعہ پر بھی ان بدمعاشوں نے ایک عجیب چالاکی کی تھی کہ کسی طرح اس کے اسباب کے صندوقوں میں سے بہت سے جواہرات نکال لئے تھے اور اراکان پہنچ کر جزوی قیمت پر خفیہ خفیہ بیچتے پھرتے تھے جن میں سے ڈچوں اور اور فرنگیوں نے اکثر ہیرے یہ دم دے کر کہ یہ کچے ہیں ان بیوقوفوں سے تھوڑی سی قیمت پر اُڑا لئے تھے۔

شائستہ خاں کی پرتگیزی قزاقوں پر چڑھائی

میں خیال کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس امر کے اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ سلاطین مغلیہ کو کس قدر زحمت اور خرچ ان ظالم اور زبردست لٹیروں کے سبب سے اٹھانا پڑتا تھا۔اور اُن کے بنگالہ میں گھس آنے کے خوف سے ہمیشہ نوج اور گیلی آس قسم کی کشتیوں کے بیڑے ناکوں کے روکنے کے لئے تیار رکھنے پڑتے تھے۔اور اس پر بھی ان کے ہاتھ سے ملک ہمیشہ تباہ و برباد ہوتا رہتا تھا۔ اور یہ قزاق اس قدر دلیر اور اپنے فن میں ایسے مشاق ہو گئے تھے کہ صرف چار پانچ گیلی آس کشتیوں میں بیٹھکر چڑھ آتے تھے اور عموماً چودہ پندرہ گیلی قسم کی بادشاہی کشتیوں کو گرفتار کر لیتے یا تباہ کر ڈالتے تھے۔اس لئے شائستہ خاں نے بنگالہ کا صوبہ دار مقرر ہو کر ان کی بیخ کنی کی ٹھانی۔اور اس میں اُس کے دو مطلب تھے کہ سردست تو ان بے رحم وحشی قزاقوں کے متواتر اور برباد کن حملوں سے اپنے صوبہ کی حفاظت اور آخرکار اراکان کے راجہ پر چڑھائی۔اور اُس بے رحمی کا انتقام جو اُس نے سلطان شجاع اور اُس کے اہل و عیال کے ساتھ کی تھی ۔کیونکہ اورنگ زیب کا مستقل ارادہ تھا کہ اُن عالی منزلت لوگوں کے خون کا انتقام لے اور اس مثال سے قرب و جوار کے تمام رئیسوں کو یہ سبق دے کہ خاندان شاہی کے لوگ خواہ کسی حالت میں کیوں نہ ہوں انسانیت اور ادب کے ساتھ سلوک کئے جانے کے مستحق ہیں ۔چنانچہ شائستہ خاں نے اپنی تجویز کے ابتدائی امور کو انتہائی ہوشیاری کے ساتھ پورا کیا۔ اور چونکہ دریاؤں اور ندی نالوں کی وجہ سے جو راستہ میں پڑتے ہیں خشکی کی راہ سے اراکان میں فوج کا لے جانا بہت مشکل تھا اور اس فوقیت کے باعث جو ان بحری قزاقوں کو جہازی لڑائی میں حاصل تھی سمندر کے راستہ سے فوج کشی کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار تھا اس لئے اُس نے ڈچ لوگوں سے مدد لینا مناسب سمجھا اور جس طرح پر شاہ عباس بادشاہ ایران نے انگریزوں

کے اتفاق سے جزیرہ ہرمز[1] پر قبضہ کرلیا تھا اُسی طرح اس نے بھی ڈچوں کی امداد سے اراکان پر قبضہ کرلینا چاہا۔ اور بٹیویا کے گورنر کے پاس اپنے ایلچی کو چند خاص شرطوں کے ساتھ عہد و پیمان کے لئے بھیجا۔ اور یہ پیغام دیا کہ آؤ ہم تم مل کر اراکان پر مشترکہ قبضہ کرلیں۔ بٹیویا کا گورنر اس تجویز کے قبول کر لینے پر اس وجہ سے آسانی کے ساتھ مائل ہوگیا کہ اس کے ذریعہ سے اُن کو ہندوستان کے معاملات میں پرتگیزوں کی مداخلت کے کم کرنے کا (جس سے ڈچ کمپنی[2] کا بہت فائدہ تھا) زیادہ موقعہ ہاتھ آتا تھا۔ اور اُس نے اپنے دو جنگی جہاز بنگالہ کو

[1] اس مقام کو پرتگیزوں نے ایرانیوں سے چھینا ہوا تھا۔ مگر سولہ سو بائیس عیسوی میں ایرانیوں نے انگریزوں کی مدد سے پھر واپس لے لیا (تاریخ ہند منشی ذکاءاللہ)

[2] ہندوستان کی دولت مندی کی شہرت نے مدتوں سے یورپ کی اکثر قوموں کو اس ملک کے ساتھ تجارت کا سلسلہ جاری کرنے کے لئے بے چین کر رکھا تھا۔ مگر خشکی کے راستہ کی مشکلات اور سمندر کی راہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سب لاچار تھے لیکن پرتگیزوں کے بادشاہ امان وئیل کے عہد میں اُس کا اولوالعزم امیر البحر واسکوڈی گاما جب اپنے بادبانی جہازوں کے ذریعہ سے ایک پُرصعوبت اور خطرناک اور طولانی سفر طے کرکے ماہ جولائی ۱۴۹۸ء میں ساحل ملابار پر آ پہنچا (جس کا مفصل حال اُس حاشیہ میں درج ہے جو اس جلد کے خاتمہ میں لگایا گیا ہے) تو اُس وقت سے سو برس کے عرصہ تک تو مشرقی سمندروں اور جزیروں اور سواحل ہندوستان میں انھیں کا غلبہ اور دور دورہ رہا۔ مگر جب سنہ ۱۶۰۰ء میں ڈچ لوگ سپین کی حکومت سے آزاد ہوگئے تو انھوں نے بھی ہندوستان کی تجارت کے لئے کمپنیاں بنائیں اور ایسے بڑھے کہ بحرالہند میں خط استوا کے قریب جزیرہ جاوا وغیرہ پر جہاں اب تک شہر بٹیویا اُن کی حکومت کا صدر مقام ہے قابض ہوگئے۔ اور پھر جہاں کہیں قابو پایا۔ پرتگیزوں کو بھی پس پا کرنا شروع کیا یہاں تک کہ مشہور اور زرخیز جزیرہ لنکا بھی جو اب گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں ہے ڈچوں نے پرتگیزوں سے چھین لیا۔ اور اس قدر ترقی پائی کہ پرتگیز پست ہوگئے اور خاص ہندوستان کی تجارت اور بندرگاہوں میں بھی آخرکار انھیں کا غلبہ ہوگیا۔ اسی زمانہ کے قریب یعنی سنہ ۱۵۹۹ء میں انگریزوں نے بھی اپنی نامور ملکہ کوئین الزبتھ کی اجازت سے ہندوستان کی سوداگری شروع کی اور ان کے سولہ سو ڈنمارک والوں نے جو یورپ کی ایک چھوٹی سی قوم ہے اور جن کو ڈنیز کہتے ہیں اول مدراس کی طرف سمندر کے کنارے ترنگی بارہ میں (جس کا صحیح نام ملنکم باڑی معلوم ہوتا ہے) جو تنجور کے راجہ سے خرید لیا تھا۔ اور پھر کلکتہ کے قریب سیرام پور میں اپنی کوٹھیاں

بھیج دیئے تاکہ شائستہ خاں کی فوج کو آسانی کے ساتھ چاٹگام میں پہنچا دیں چونکہ اس عرصہ میں شائستہ خاں نے بھی گیلی آس وغیرہ قسم کی بڑی بڑی کشتیاں جمع کرلی تھیں۔ پس اُس نے ان قزاقوں کو اس طرح پر دھمکایا کہ "اگر فوراً اطاعت قبول نہ کروگے تو نیست ونابود کردیئے جاؤ گے کیونکہ اورنگ زیب نے اراکان کے راجہ کی سزادہی کا ارادہ مصمم کرلیا ہے اور ڈچوں کے جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا بھی جس کا تم مقابلہ نہ کرسکوگے بہت جلد آنے والا ہے۔ پس اگر تم کو کچھ عقل ہے اور اپنی اور اپنے اہل وعیال کی خیریت چاہتے ہو تو راجہ کی نوکری چھوڑ کر شاہی ملازمت اختیار کرلو اور جس قدر تم کو ضرورت ہو بنگالہ میں زمین عطا کی جائے گی اور راجہ کے ہاں سے جتنی تنخواہ ملتی ہے اُس سے دوچند دی جائیگی۔"

اتفاقاً انھیں ایام میں ان قزاقوں نے راجہ اراکان کے ایک بڑے عہدہ دار کو مارڈالا تھا۔ اب اگرچہ یہ بات تو ٹھیک معلوم نہیں کہ راجہ کی سزادہی کے اندیشہ نے انھیں ڈرایا یا شائستہ خاں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کھولیں اور سب سے آخر میں ۱۶۶۴ء میں فرانس کے قابل ولایق وزیر کولبرٹ نے بھی (جس کو ڈاکٹر برنیر نے اپنا خط جو اس جلد کے خاتمہ میں ہے نذر کیا تھا) تجارتی کمپنی کھڑی کی اور فرنچوں نے قصبہ چندرنگر معروف بہ فرانس ڈانگا کے علاوہ جو کلکتہ کے پاس ہے مدراس کے قریب[ا] پانڈے چری کو اپنا صدر مقام قرار دے کر ایسے زور وشور سے قدم جمانے چاہے کہ گویا ہندوستان کے مالک ہی ہو چلے تھے۔ مگر اتفاقات وقت سے ان سب قوموں کا فروغ یکے بعد دیگرے گھٹتا گیا۔ اور خداوند تعالیٰ نے صرف انگریزوں کو جو ان سب میں دور تر جزیرہ کے رہنے والے اور تعداد میں چار پولے چار کروڑ سے زیادہ نہ تھے اوصاف واقبال خداداد کی وجہ سے اس ملک کا شہنشاہ اور یہاں کے پچیس ستائیس کروڑ باشندوں کا مختار مطلق بنادیا۔ منجملہ ان پانچوں قوموں کے ہندوستان میں اب ڈچوں اور ڈنمارک والوں کی حکومت کسی جگہ نہیں ہے۔ البتہ گورنمنٹ انگریزی کی رعایت اور اُس باہمی لحاظ وملاحظہ سے جو ان سلطنتوں کے باہم یورپ میں ہے فرنچوں کی حکومت پانڈیچری میں معہ اُس کے علاقہ متعلقہ کے اور نیز قصبہ چندرنگر میں چلی آتی ہے اور پرتگیزوں کی حکومت بھی گوا میں اور نیز جزیرہ دیو متعلقہ کاٹھیاواڑ میں باقی ہے مگر فی زمانہ یہ دونوں حکومتیں ہندوستان کے عام نظم ونسق کے اعتبار سے ایسی غیر محسوس اور بے وقعت ہیں کہ یہاں کے امور پولٹیکل پر اُن کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ س م ح

[ا] صاحب جام جہاں نما اس کا صحیح نام پتوچری بتاتے ہیں۔ س م ح

کی دھمکیوں اور وعدہ وعید نے اُن پر اثر کیا۔ مگر یہ امر متحقق ہے کہ ایک دن ان نالائق پرتگیزوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ یک لخت چالیس پچاس گالیاسوں میں بیٹھکر بنگالہ کو چل پڑے۔ اور ایسے اضطراب سے روانہ ہوئے کہ اس ہڑبڑاہٹ میں جورو بچے اور مال و اسباب بھی بمشکل ساتھ لا سکے شائستہ خاں ان نئے ملاقاتیوں سے بڑے اخلاق کے ساتھ ملا اور بہت سارو پیہ اُن کو دیا اور شہر ڈھاکہ میں اُن کے اہل وعیال کے رہنے کے لئے عمدہ بندوبست کر دیا۔ اور اس طرح پر اُن کو اُس کے حسن سلوک پر ایسا اعتماد ہو گیا کہ از خود بادشاہی لشکر کے ساتھ مہم پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اور جزیرہ سوندیپ پر چڑھائی کرنے اور فتح کر لینے میں (جو کچھ دنوں سے راجہ اراکان کے قبضہ میں چلا گیا تھا) شریک ہوئے اور پھر یہاں سے بادشاہی فوج کے ساتھ چاٹگام کو گئے۔ اب اگرچہ ڈچوں کے وہ دونوں جنگی جہاز بھی آ پہنچے مگر شائستہ خاں نے اُن کے سرداروں کی مہربانی کا شکریہ ادا کر کے یہ کہلا بھیجا کہ اب آپ کے تکلیف کرنے کی کچھ حاجت نہیں رہی۔

بنگالہ میں یہ جہاز میں نے بھی دیکھے تھے اور اُن کے عہدہ داروں سے ملاقات بھی ہوئی تھی جو اس بات کے شاکی تھے کہ اس ہندوستانی سردار نے محض زبانی جمع خرچ اور خشک شکریہ پر ہی ان کو ٹالا اور شرائط مقررہ کا کچھ لحاظ نہ کیا۔

شائستہ خاں کا برتاؤ ان پرتگیزوں کے ساتھ اگرچہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ شاید بلحاظ اُن کی خدمات کے ہونا چاہیئے تھا مگر ہاں وہ اُن سے اُس سلوک سے پیش آتا ہے جس کے کہ وہ واقع میں لائق ہیں۔ اُس نے چاٹگام سے تو اُن کو اُکھیڑ ہی دیا ہے اور وہ اب اپنے اہل وعیال سمیت اُسی کے قابو میں ہیں۔ اور اُن کی امداد کی بھی کچھ حاجت نہیں رہی اس لئے اُس نے سمجھ لیا ہے کہ جو وعدے ان سے کئے گئے تھے اُن میں سے اب کسی کے بھی ایفا کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ کئی کئی مہینے گذر جاتے ہیں کہ تنخواہ کی بابت پھوٹی کوڑی تک نہیں ملتی۔ اور وہ علانیہ کہا کرتا ہے کہ یہ ایسے دغاباز اور نالائق ہیں کہ جس راجہ نے اِن سے اس قدر سلوک کئے تھے یہ پاجی اُسی کے ساتھ بے ایمانی سے پیش آئے۔ اس لئے ان پر بھروسہ کرنا نادانی ہے۔ اور اس طرح سے اُس نے چاٹ گام میں ان پرتگیزوں کی طاقت کے چراغ کو بجھا دیا جنھوں نے بنگالہ کے زیریں علاقہ میں اس قدر اندھیر مچا کر تمام ملک کو ویران اور بے چراغ کر دیا تھا۔ اور یہ امر زمانہ کے گذرنے

پر معلوم ہوگا کہ آیا شایستہ خاں کو ایسی ہی کامیابی اراکان کی مہم میں بھی ہوتی ہے یا نہیں؟[1]

[1] چاٹگام کے پرتگیزوں کی دریائی غارت گری اور رعایائے بادشاہی کو لوٹ لینے اور پکڑے جانے کے الزام کے متعلق جس تفصیل و توضیح سے مصنف نے لکھا ہے نیز اس سبب سے بھی کہ اس کی یہ تحقیقات ایک یورپین قوم کے حالات سے متعلق ہے ہمارے نزدیک بھی بہ نسبت کسی فارسی مورخ کی تحریروں کے یہی بیان زیادہ تر اعتماد اور سند کے لائق ہے۔ مگر صاحب عالمگیر نامہ نے جس طرح پر اس مہم کے واقعات کو لکھا ہے وہ یوں ہے کہ اس نے چاٹ گام کے پرتگیزوں کی نسبت کوئی الزام نہیں لگایا۔ اور بیان میں جو عموماً برنیر کے بیان کے قریب قریب ہے ان کل حرکتوں کا ملزم خود اراکانیوں کو بتایا ہے اور دریائی لڑائی اور فن کشتی رانی میں جو فوقیت اس نے پرتگیزوں سے منسوب کی ہے صاحب عالمگیر نامہ نے اس کو بھی اراکانیوں ہی سے منسوب کیا ہے۔ بلکہ بلا لحاظ خوشامد و چاپلوسی اپنے بادشاہ یا حکام سلطنت اس امر کو صاف صاف لکھدیا ہے کہ بہ نسبت بادشاہی نواڑے کے اپنے فن میں یہ لوگ مشاق بھی زیادہ تھے۔ اور اُن کی جنگی کشتیاں سامان توپ خانہ اور مضبوطی اور استحکام میں بھی پادشاہی کشتیوں سے بہت بڑھ کر اور زیادہ عمدہ تھیں اور وجوہ فوج کشی کے متعلق شجاع کے واقعہ کا تو کوئی اشارہ نہیں صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی کشتیوں کے ذریعہ چاٹ گام کے رستہ سے صوبہ بنگالہ میں داخل ہوکر مذکورہ بالا جرائم کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے شایستہ خاں نے علاوہ شاہی بیڑہ کی ماموری اور گشت کے اپنے سرحدی مقاموں نواکھالی اور سنگرام گڈھ اور بھلوہ وغیرہ کو مستحکم کیا اور خود چاٹ گام کو چھین لینا بھی مناسب جانا۔ اور اس ارادہ کی تکمیل کے لئے اول تو جزیرہ سوندیپ کو جو چاٹ گام کے قریب نواکھالی کے محاذی ہے۔ دلاور نامی وہاں کے "زمیندار" یعنی راجہ سے جو شایستہ خاں کے فرستادہ سواروں کے ساتھ ایک دو لڑائیاں لڑچکا تھا چھین لیا۔ اور اس کو اور شریف نامی اس کے بیٹے کو جو لڑائی میں زخمی ہوگیا معہ اہل و عیال کے قید کرلیا۔ کیونکہ یہ شخص ظاہر میں مطیع سلطنت اور باطن میں اراکانیوں کا مددگار تھا۔ اور باوجودیکہ بذات خود حاضر ہوجانے اور امداد دینے کے وعدے کرچکا تھا۔ مگر اس مہم میں شریک خدمت نہ ہوا تھا بعد اس کے لکھا ہے کہ اُن "فرنگیوں" کی استمالت جو چاٹ گام میں رہتے تھے اور راجہ اراکان سے موافقت رکھتے تھے اس مہم کے سرانجام دینے کے لئے نہایت ضروری تھی۔ اس لئے امیرالامرا نے اُن "فرنگیوں" کو جو اس کے ماتحت بنگالہ کی اور بندرگاہوں میں رہتے تھے بہت سے وعدہ آمیز خطوط لکھکر ان کی معرفت چاٹ گام کے فرنگیوں کے پاس روانہ کئے۔ اتفاقاً ان میں سے بعض خطوط لکمرام کبری نام ایک اراکانی سردار نے جس کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ راجہ نے اپنے معمول کے موافق دریائی قزاقی کے لئے سوندیپ کی طرف بھیجا ہوا تھا پکڑ لئے اور راجہ کے پاس بھیج دیئے۔ اس لئے چاٹ گام کے فرنگیوں سے راجہ بدظن ہوگیا۔ اور کرام کبری کو لکھا کہ تم ان سب کو معہ ان کے متعلقین کے اراکان کو بھیج دو نتیجہ اس حکم کا یہ ہوا کہ اراکانیوں سے فرنگی لڑ پڑے اور اُن کی کچھ کشتیوں کو جلا پھونک کر معہ اپنے متعلقوں اور متوسلوں کے پچاس ۵۰ جلیوں میں جو سامان جنگ اور توپ بندوق سے بخوبی تیار تھے چاٹ گام سے بھلوہ کے تھانیدار فرہاد خاں کے پاس نواکھالی میں چلے آئے اور اُس نے اُن کے بعض سرگروہوں کو امیرالامرا کے پاس بھیج کر باقی کو اپنے پاس ٹھیرا لیا۔ امیرالامرا نے ان کی بہت خاطر کی اور اُن کے ساتھ کئی طرح کی رعایتیں کیں غرضکہ چاٹ گام کی فتح کے لئے جب یہ ابتدائی بندوبست پورے ہو چکے تو امیرالامرا نے اپنے بیٹے بزرگ امید خاں کو چند مسلمان اور ہندو اُمرا اور منصب داروں کے ہمراہ خشکی کے راستہ سے اور فرہاد خاں مذکور اور ابن حسین داروغہ نواڑہ (جو غالباً کوئی عرب تھا) اور میر مرتضیٰ داروغہ توپ خانہ کو کپتان مور سرگروہ فرنگیان چاٹ گام اور اُن کے دوسرے سرداروں کے ساتھ روانہ کیا اور ان کو انعام واکرام وغیرہ سے پوری طرح خوش کردیا اُن کے بیڑہ کے ساتھ بادشاہی بیڑہ بھی دریا کے راستہ سے روانہ کیا۔ چونکہ بزرگ امید خاں کو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں جنگلوں کو کٹوا کر اور ندیوں اور دریاؤں کو عبور کر کے بڑی مشکلوں سے کوچ کرنا پڑتا تھا اس لئے بادشاہی بیڑہ برعو خشکی کی فوج سے کسی قدر آگے بڑھ گیا تھا اراکانیوں کے بیڑہ نے حملہ کیا۔ اور جانبین سے توپ بندوق اور تیروں سے ایک دریائی لڑائی ہوئی جس میں اراکانی مغلوب ہوگئے اور دس غراب اور تین جلبے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ چونکہ ابھی پیچھے سے بڑی بڑی بادشاہی کشتیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں اس لئے ابن حسین نے زیادہ تعاقب نہ کیا اور اپنے بیڑہ کو اُن کے بیڑہ سے کسی قدر فاصلہ پر روک لیا۔ جب بزرگ امید خاں اس کامیابی کے حال سے مطلع ہوا تو اُس نے میر مرتضیٰ اور فرہاد خاں کو تاکید سے حکم بھیجا کہ جنگل وغیرہ کو کٹوا کر اور راستہ بنوا کر کوچ کرنے کا خیال تو چھوڑ دیں اور جس طرح بن پڑے ابن حسین کی مدد کو جا پہنچیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ بھی ابن حسین کے نواڑہ کے پاس دریا کے کنارے پہنچ گئے تو ابن حسین نے دریائے کرن پھولی میں جہاں اراکانیوں کا نواڑہ ٹھیرا ہوا تھا پہنچ کر حملہ کر دیا۔ اور جانبین سے چھ گھنٹہ تک سخت دریائی لڑائی ہوئی جس میں بہت سے اراکانی مارے گئے۔ بہت سے ڈوب گئے۔ بہت سے پکڑے گئے اور ابن حسین نے فتح یاب ہو کر اپنے بیڑے کو قلعہ چاٹ گام کے نیچے جا کھڑا کیا۔ اور اس لڑائی میں کپتان مور مذکور نے بھی نہایت عمدہ خدمتیں

اورنگ زیب کے بیٹوں کا حال محمد سلطان تو اب تک قلعہ گوالیار میں قید ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ اب اُس کو حسب قاعدہ پوست کا قدح نہیں پلایا جاتا۔ اور محمد معظم بدستور اپنی ہوشیاری اور سلامت روی کی چال پر چلے جاتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ سے ایسا پایا جاتا ہے کہ شاید بادشاہ اُس سے کچھ ناراض تھا۔ اور اس ناراضگی کا سبب یا تو یہ ہوگا کہ اپنے باپ کی شدت مرض کے زمانہ میں کوئی خفیہ کارروائی کی ہوگی یا کوئی اور نامعلوم سبب ہوگا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر کسی مخفی رنجش کے صرف اُس کی جرأت اور اطاعت کا امتحان ہی منظور ہو۔ مگر بہرحال اورنگ زیب نے ایک روز بھرے دربار میں اُس کو یہ حکم دیا کہ "ایک شیر جو پہاڑ سے اُتر آیا ہے اور گرد و نواح کے لوگوں کو تکلیف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ انجام دیں اور جو فرنگی چاٹ گام میں اب تک کسی قدر موجود تھے اور اراکان سے اُن کی مدد کو آئے تھے سب ابن حسین کے پاس حاضر ہو گئے۔ اور اس سے دوسرے دن خشکی کے راستہ سے فوج لے کر بزرگ امید خاں بھی آن پہنچا اور قلعہ چاٹگام پر دریا اور خشکی دونوں طرف سے حملہ شروع ہوا۔ اہل قلعہ نے اگرچہ کچھ عرصہ تک بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر آخر امان چاہی اور عالمگیر کے آٹھویں سال جلوس میں آخر رجب ۱۰۷۵ھ کو چاٹگام کا مشہور و مستحکم قلعہ اور بندرگاہ جس پر بقول صاحب عالمگیرنامہ اس سے پہلے کسی مسلمان بادشاہ کا تسلط نہ ہوا تھا معہ ولایت چاٹگام اور توپ خانہ اور بیڑہ کے حوالہ کر کے چاٹگام کا حاکم جو راجہ اراکان کے چچا کا بیٹا تھا اپنے بیٹے اور چند رشتہ داروں اور کئی سو اور اہالی موالی کے ساتھ قید ہو گیا۔ اور ایک سو پینتیس جنگی کشتیاں اور ایک ہزار چھبیس برنجی اور آہنی توپیں اور بہت سی بندوقیں اور زنبورک اور سکہ و بارود بے شمار مصالحہ توپ خانہ اور چند ہاتھی قبضہ میں آئے اور بنگالہ کی رعایا میں سے جو ایک خلق کثیر مدتوں سے ان کی قید میں تھی انھوں نے رہائی پائی اگرچہ اس کے بعد بزرگ امید خاں کے حکم سے میر مرتضیٰ نے قلعہ بندر رامبو کو بھی جو چاٹگام سے چار منزل آگے چاٹگام اور اراکان کے درمیان تھا اور راستہ میں دشوار گذار جنگل اور ندیاں نالے اور پہاڑ واقع تھے راجہ اراکان کے بھائی سے جنگ و جدال کے بعد چھین لیا۔ مگر چونکہ ایام برسات میں چاٹگام اور رامبو کے درمیان پانی ہی پانی ہو جاتا ہے۔ اور گھنے جنگلوں اور ندیوں نالوں اور پہاڑوں کے علاوہ دو ایسے دریا بھی ہیں کہ جن کو بغیر کشتی کے عبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے قرب برسات کے اندیشے اور قلت رسد کے خیال سے فتح کے بعد اس مقام کو چھوڑ دیا گیا۔ اور عالمگیر نامہ میں جو تفصیلات ہیں اُن کا حساب لگانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں دس بارہ ہزار سے کم فوج مامور نہ تھی۔ س م ح

دیتا ہے اُس کو جا کر مار آتے ۔ اور اگر چہ پادشاہی میر شکار نے ذرا جرأت کر کے عرض کیا کہ جہاں پناہ وہ بڑے بڑے جال بھی تو ساتھ لے جانا مناسب ہے جو اس خطرناک شکار کے واسطے مخصوص ہیں ۔ لیکن پادشاہ نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ نہیں ۔ اُن کی کچھ حاجت نہیں ۔ کیونکہ ایام شہزادگی میں ہم نے تو کبھی اس قسم کی احتیاطوں کا خیال بھی نہیں کیا ۔ اور یہ حکم ایسے قطعی طور پر دیا کہ شہزادہ کو بلا عذر جانا ہی پڑا ۔ اور اگرچہ اس معرکہ میں دو تین آدمی کام آئے اور کچھ گھوڑے بھی زخمی ہوئے اور شیر زخم کھا کر اور جست کر کے شاہزادہ کے ہاتھی کے سر پر بھی آن پڑا مگر مار لیا گیا ۔ اور جب سے یہ جرأت اور دلاوری شاہزادہ سے ظہور میں آئی ہے بادشاہ اُس سے بڑی محبت سے پیش آتا ہے ۔ اور یہاں تک اُس کا رتبہ بڑھایا ہے کہ دکن کی صوبہ داری بھی دیدی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اُس کے اختیارات خصوصاً رقمی معاملات میں ایسے محدود ہیں کہ اُس سے کسی تکلیف کے پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا

مہابت خاں صوبہ دار کابل کی اطاعت

اب میں مہابت خاں صوبہ دار کابل کا ذکر کرتا ہوں کہ اُس نے بھی آخر کار کابل کی حکومت سے دست بردار ہو کر حاضر ہو جانا ہی مناسب سمجھا ۔ اور اورنگ زیب نے بھی ازراہ عالی ہمتی اُس کا قصور معاف کر دیا ۔ اور فرمایا کہ ایسے سپاہی کی جان بہت قیمتی ہے اور اپنے آقا شاہجہاں کے ساتھ اُس کی وفاداری تعریف کے لائق ہے ۔ بلکہ عفو قصور کے علاوہ راجہ جسونت سنگھ کی جگہ (جو شائستہ خاں کی مدد کے لئے شیواجی مرہٹہ کی بیخ کنی کے لئے دکن کو بھیجا گیا تھا) گجرات کا صوبہ دار بھی مقرر کر دیا ۔ مگر اس جگہ یہ بات بھی جتا دینے کے قابل ہے کہ علاوہ اُن تحائف کے جو اُس نے روشن آرا بیگم کو دیئے تھے پندرہ سولہ ہزار اشرفیاں اور بہت سے ایرانی اونٹ اور گھوڑے خود بادشاہ کی نذر کئے ۔ پس تعجب نہیں ہے کہ ان تحائف ہی نے بادشاہ کے دل کو نرم کر دیا ہو ۔

قندھار پر ایران و ہندوستان کی لڑائیاں

مہابت خاں کے ساتھ چونکہ کابل کا ذکر آ گیا ہے ۔ تو اس وجہ سے اُس کے ہمسایہ صوبہ قندھار کا خیال بھی میرے دل میں پیدا ہوتا ہے اس لئے لازم ہے کہ اس کے بیان میں بھی دو ایک صفحے لکھ ڈالوں ۔ یہ صوبہ فی زمانہ سلطنت ایران کا باج گزار ہے ۔ اس کے حالات اور خصوصاً وہ پولیٹیکل حسد اور مخالفت جو اس ملک کے باعث ایران اور ہندوستان کے

پادشاہوں کے درمیان پیدا ہوتی رہتی ہے لوگ بہت کم واقف ہیں۔

پس واضح ہو کہ یہ ملک اور اس کا دارالحکومت جو اس زرخیز اور خوش نما صوبہ کے اندر ایک مستحکم قلعہ ہے دونوں کو قندھار کہتے ہیں۔ اور اُس پر قبضہ حاصل کرنے کی خاطر ایرانیوں اور سلاطین مغلیہ کے درمیان ایک مدت سے برابر خون ریز لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر نے اس کو ایرانیوں سے چھین لیا تھا۔ اور اس کے عہد تک برابر اُس پر قبضہ رہا مگر شاہ عباس نے اُس کے بیٹے جہانگیر سے پھر لے لیا۔ اور شاہ جہاں کے وقت میں علی مردان خا کی نمک حرامی سے جو یہاں کا حاکم تھا اور شاہجہاں سے سازش کر کے فوراً اپنے اس نئے آقا کی پناہ میں چلا آیا تھا پھر سلطنت مغلیہ کے قبضہ میں آگیا۔ اور اس کا باعث یہ تھا کہ دربار ایران میں علی مردان خاں کے بہت سے دشمن تھے اور وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اُن فرمانوں کی تعمیل کروں گا جو صوبہ کا حساب سمجھانے کے بارہ میں صادر ہوئے ہیں تو کیا نتیجہ ہوگا۔

اس کے بعد شاہ عباس کے بیٹے نے محاصرہ کر کے اس کو پھر فتح کر لیا اور اگرچہ شاہجہاں نے دو بار فوج بھیجی مگر دونوں دفعہ ناکام ہی رہا۔ چنانچہ پہلی دفعہ کی ناکامی کا سبب تو اُن ایرانی اُمرا کی نمک حرامی تھی جو شاہ جہاں کے دربار میں سب سے بڑھ کر ذی اقتدار تھے اور باطن میں اپنے ملک کو نہایت عزیز جانتے تھے۔ جنھوں نے اس محاصرہ میں شرمناک حد تک پہلوتہی کی اور راجہ روپ سنگھ کو جس نے اپنا نشان اُس دیوار پر جا گاڑا تھا جو سب سے زیادہ پہاڑ کے قریب تھی مدد نہ دی۔ اور دوسری بار ناکام رہنے کا باعث اورنگ زیب کا رشک و حسد تھا جس نے اُس راستہ سے جو انگریزوں پرتگیزوں، جرمن اور فرانسیسیوں کی توپوں نے دیوار قلعہ کو توڑ کر خاصہ گذر کے قابل بنا دیا تھا حملہ کر کے داخل ہی ہونا نہ چاہا۔ کیونکہ اس مہم کا آغاز دارا شکوہ نے کیا تھا جو اُس وقت باپ کے ساتھ کابل میں تھا اور اورنگ زیب کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ اس قابل قدر ارادہ میں کامیاب ہونے کی ناموری دارا شکوہ کو حاصل ہو۔ اگرچہ شاہجہاں نے شاہزادوں کی باہمی جنگ سے چند سال پہلے تیسری دفعہ بھی قندھار کا محاصرہ کرنا چاہا تھا لیکن میر جملہ نے اس مہم سے روک دیا۔ اور جیسے کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اس کے عوض دکن پر فوج کشی کرنے کی صلاح دی اور علی مردان خاں نے بڑے زور سے اُس کے دلائل کی تائید کی تھی اور یہ عجیب لفظ کہے تھے کہ حضور قندھار کو کبھی فتح نہ کر سکیں گے جب تک کہ کوئی مجھ سا ہی نمک حرام اُس کا پھاٹک نہ کھول دے یا حضور تمام ایرانیوں کو جو

سپاہ میں ہیں محاصرہ کرنے والی فوج سے بالکل خارج نہ کردیں۔ اور اس مضمون کا اشتہار جاری نہ فرمادیں کہ بازاری لوگوں سے جو فوج کے لئے رسد لائیں کسی طرح کا محصول نہ لیا جائے گا۔"

چند سال ہوئے کہ اورنگ زیب نے بھی اپنے بزرگوں کی تقلید میں یا تو اُس خط کی وجہ سے جو شاہ ایران نے لکھا تھا یا اُس کم التفاتی کے سبب جو اُس کے سفیر تربیت خاں کی تعظیم وتکریم کے بارے میں دربار ایران کی طرف سے ہوئی تھی ناراض ہوکر قندھار پر مہم کی تیاری کی لیکن شاہ ایران کے انتقال کی خبر سُن کر اسے ملتوی کردیا اور یہ بات بنائی کہ ہمارا دل گوارا نہیں کرتا کہ ایک لڑکے پر جو ابھی تخت نشین ہوا ہے چڑھائی کریں۔ حالانکہ میرے قیاس میں شاہ سلیمان کی عمر جو باپ کی جگہ تخت نشین ہوا ہے پچیس برس سے کم نہیں۔

مخلص رفقاء

اب میں اورنگ زیب کے سرگرم رفیقوں کا جن میں سے اکثر کو بڑے بڑے منصب اور عہدے دیئے گئے تھے ذکر کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں تو جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے دکن کا صوبہ دار بنایا گیا۔ اور جو فوج وہاں متقرر تھی اُس کی سپہ سالاری بھی اُسی کو دی گئی اور آخرکار بنگالہ کی صوبہ داری پر سرافراز ہوا۔ اور امیر خاں کو کابل۔ خلیل اللہ خاں کو لاہور۔ میر بابا کو الہ آباد لشکر خاں کو پٹنہ اور الہ ویردی خاں کے بیٹے کو جس کے باپ کی صلاح سے سلطان شجاع نے کھجوہ کے مقام پر شکست کھائی تھی سندھ کا صوبہ دار متقرر کیا گیا۔ فاضل خاں کو جس کی معقولیت اور دانشمندانہ صلاح مشوروں سے اورنگ زیب کو بہت بڑی مدد ملی تھی خانسامانی کا عہدہ ملا دہلی کی صوبہ داری دانشمند خاں کو عنایت ہوئی اور اس رسم قدیم کے بجالانے سے کہ ہر ایک امیر کو صبح وشام تسلیمات کے واسطے دربار میں حاضر ہونا لازم ہے (اور اگر اس میں کبھی فروگذاشت ہو جائے تو جرمانہ بھرنا پڑتا ہے) خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے معاف کیا گیا کہ سیر کتب اور مطالعہ کا اُس کو نہایت شوق ہے۔ اور اس کے علاوہ صیغہ دول خارجہ کے متعلقہ کاموں میں بھی بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ دیانت خاں کو کشمیر کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ جو اگرچہ دشوار گذار اور مختصر سا ملک ہے۔ مگر ایسا پُرفضا قطعہ ہے کہ ہندوستان کا بہشت گنا جاتا ہے اور جس کو اکبر نے ایک حیلہ سے فتح کر لیا تھا۔ اور اس بات کا فخر اُس کو حاصل ہے کہ اُس کی صحیح تاریخ خود وہیں کی زبان میں موجود ہے جس میں شاہان سلف کے ایک طول طویل سلسلہ کا دلچسپ حال مندرج ہے جو کسی زمانہ میں ایسے طاقتور تھے کہ تمام

ہندوستان کو ملنگا تک فتح کر لیا تھا۔ ان تاریخوں کا ترجمہ خلاصہ کے طور پر جہانگیر نے فارسی زبان میں کرایا تھا جس کی ایک نقل میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس موقعہ پر یہ امر بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ اورنگ زیب نے نجابت خاں کو جس نے سموں گڈہ اور کھجوہ کے معرکوں میں بڑی شجاعت دکھلائی تھی اُس کے منصب سے گرا دیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے عزتی اُس کو اس لئے نصیب ہوئی تھی کہ اُس نے اپنی خدمتیں بار بار جتلائی تھیں۔

سیواجی مرہٹہ

جسونت سنگھ اور جے سنگھ کی حالت اگرچہ کچھ مبہم سی ہے مگر میں اُس کی توضیح کی کوشش کروں گا۔ واضح ہو کہ بیجاپور میں ایک ہندو نے بغاوت کرکے کئی بڑے بڑے قلعوں اور بندرگاہوں پر جو شاہ بیجاپور کی عملداری میں تھے قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس قسمت آزمائی کرنے والے نڈر شخص کا نام سیواجی ہے جو ایک بڑا ہوشیار صاحب داعیہ اور ایسا مشہور آدمی ہے کہ اپنے مرنے جینے کی اُس کو پرواہی نہیں ہے چنانچہ جس زمانہ میں کہ شائستہ خاں دکن کا صوبہ دار تھا وہ اس کو شاہ بیجاپور کی تمام سپاہ اور ان راجاؤں کی متفقہ قوت کی بہ نسبت جو کسی مشترکہ دشمن کے مقابلہ میں اس کے ساتھ شامل ہوجایا کرتے ہیں زیادہ خوفناک سمجھتا تھا۔

اس شخص کی جرأت وجسارت کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے کہ باوجودیکہ شائستہ خاں کی سپاہ چپے چپے پر پھیلی ہوئی تھی اور شہر اورنگ آباد فصیل سے بھی محصور تھا مگر اس پر بھی ایک رات صرف چند سپاہیوں کے ساتھ شائستہ خاں کے مکان کے اندر اس ارادہ سے جا گھسا کہ شائستہ خاں کو پکڑ کر اُس کے تمام مال ودولت پر قابض ہوجائے اور اگر تھوڑی دیر اور خبر نہ ہوتی تو کچھ شک نہیں ہے کہ یہ اپنے منصوبہ میں ضرور کامیاب ہوجاتا۔ چنانچہ شائستہ خاں اس موقعہ پر سخت زخمی ہوا۔ اور اُس کا بیٹا میان سے تلوار نکالتے ہوئے مارا گیا۔

سیواجی کی بندرگاہ سورت میں غارت گری

اس سے تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے ایسا ہی ایک اور چھاپا مارا جس میں زیادہ کامیابی ہوئی یعنی چپکے سے دو تین ہزار چیدہ سپاہی ساتھ لے کر اپنے لشکرگاہ سے نکل کھڑا ہوا۔ اور یہ مشہور کیا کہ ایک راجہ بادشاہ کے سلام کو دہلی جاتا ہے اور جب شہر سورت کے قریب پہنچا اور وہاں کا حاکم اُس کو ملا تو اُسے یہ دم دے دیا کہ میرا قصد شہر میں جانے کا نہیں ہے سیدھا باہر باہر جاؤں گا حالانکہ اس منصوبہ کا اصل مدعا اسی مشہور اور دولت مند بندرگاہ کو لوٹنا تھا

چنانچہ شمشیر بکف شہر میں آگھسا اور تین دن تک لوگوں کو سخت تکلیفیں اور عذاب دے دیکر خوب تنگ کیا اور کئی ملین[1] روپیہ سونے۔ چاندی اور موتیوں اور ریشمی کپڑوں اور عمدہ ململوں اور تجارتی مال و اسباب سے اپنی سواریاں لادکر رخصت ہوگیا۔ اور جو چیز اُٹھا نہ سکا اُس کو جلاکر خاک سیاہ کرگیا۔

چونکہ اس موقعہ پر کسی نے اس سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں اس وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ اُس کے اور راجہ جسونت سنگھ کے باہم خفیہ سازش ہے۔ شائستہ خاں پر حملہ کرنا اور سورت کو لوٹنا سب اُس کے علم و اشارہ سے ہوا ہے۔ اس لئے راجہ دکن سے واپس بُلایا گیا۔ مگر وہ دہلی آنے کے بجائے اپنی ریاست کو چلاگیا۔

لو! یہ کہنا تو میں بھول ہی گیا کہ سیواجی۔ نہیں نہیں۔ دھرم آتما سیواجی صاحب نے سورت کو لوٹتے وقت ریورینڈ فادر ایمبروز کے مکان کو جو فرقہ کپوشین[2] میں سے ایک مشنری تھے ہاتھ تک نہیں لگایا اور کہا کہ فرنگیوں کے پادری نیک شخص ہیں ان کو ستانا نہیں چاہیئے اسی طرح ایک ہندو کے مکان کو بھی (جو ڈچ سوداگروں کی دلالی کا کام کرتا تھا) اس لئے نہ چھیڑا کہ وہ بہت سخی اور پن دان میں مشہور تھا انگریزوں اور ڈچوں کے مکانات بھی بچے رہے لیکن اس کا سبب یہ نہ تھا کہ سیواجی ان کا کچھ لحاظ کرتا تھا بلکہ اُنھوں نے اپنی ہمت اور دلیری سے اپنے آپ کو بچایا۔ انگریزوں نے تو اپنے جہاز کے خلاصیوں وغیرہ کی مدد سے کمال ہی کر دکھایا اور نہ صرف اپنے ہی مکانات بچائے بلکہ پڑوسیوں تک کے مکانوں پر بھی آنچ نہ آنے دی۔ اس موقعہ پر قسطنطنیہ کے رہنے والے ایک یہودی نے عجیب ہٹ دکھلائی جس سے لوگ حیران رہ گئے۔ سیواجی نے یہ سُن کر کہ اُس کے پاس نہایت قیمتی یاقوت ہیں (جن کو وہ بیچنے کے لئے اورنگ زیب کے پاس لے جانا چاہتا ہے) اُس کو تین دفعہ گھٹنوں بٹھلاکر اور ننگی تلواریں تول تول کر ہر چند ڈرایا۔ مگر اُس نے ہرگز نہ بتایا۔ اور یہودیوں کی اس عادت کو کہ روپیہ کو جان سے زیادہ عزیز جانتے ہیں خوب نباہا۔

سورت کے واقعہ کے بعد اورنگ زیب نے جے سنگھ کو فوج مامورہ دکن کی سپہ سالاری قبول کرنے پر رضامند کیا اور سلطان محمد معظم کو بھی اُس کے ساتھ بھیجا۔ مگر شاہزادہ کو کسی قسم

---

[1] ایک ملین دس لاکھ روپیہ کا ہوتا ہے۔

[2] کپوشین عورتوں کی طرح برقعہ پہننے والے عیسائی درویشوں کے ایک فرقہ کا نام ہے۔ س م ح

کا اختیار نہیں دیا۔ راجہ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ سیوا جی کے سب سے بڑے قلعہ پر زور شور سے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ مگر اس کے ساتھ حسب معمولی اپنے فن کے مطابق جوڑ توڑ اور وعدہ وعید سے بھی کام لیتا رہا جس کا حسب دل خواہ یہ نتیجہ ہوا کہ قبل اس کے کہ اہل قلعہ نہایت لاچار ہو کر مغلوب ہوتے سیوا جی نے قلعہ حوالہ کر دیا۔ اور یہ شرط بھی قبول کرلی کہ اگر بیجاپور پر فوج کشی جائے تو بادشاہی فوج کا ساتھ دوں گا — اورنگ زیب نے بالطاف شاہانہ اُس کو راجہ کا خطاب عنایت کیا اور اُس کے بیٹے کو امرا کے ذیل میں داخل کر کے شل اور امیروں کے وظیفہ مقرر کر دیا۔

سیوا جی کی دہلی میں حاضری اس سے کچھ دنوں بعد جو ایران پر چڑھائی کا ارادہ ہوا تھا تو اورنگ زیب نے سیوا جی کو نہایت عنایت آمیز اور خوش آئند الفاظ میں فرمان لکھا اور اُس کی فہم و فراست اور سخاوت و شجاعت وغیرہ کی بہت تعریف کی اور راجہ جے سنگھ بھی جان اور آبرو کی حفاظت کا ضامن بنا اس لئے سیوا جی بھی مطمئن ہو کر دہلی میں حاضر ہو گیا تھا مگر اتفاق وقت سے شائستہ خاں کی بیوی بھی اس وقت دہلی میں موجود تھی اور برابر اس امر پر مصر تھی کہ ایسا شخص جس نے میرے بیٹے کو قتل کیا۔ اور شوہر کو زخمی کیا۔ اور بند رسورت کو لوٹا ہے۔ ضرور گرفتار اور قید ہونا چاہیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیوا جی یہ دیکھکر کہ تین چار افسر اُس کے خیموں کی ہمیشہ نگرانی کرتے رہتے ہیں ایک رات بھیس بدل کر بھاگ گیا۔ اور اُس کے قابو سے نکل جانے پر شاہی محل میں بیگمات کو بہت رنج اور افسوس ہوا اور جے سنگھ کے بڑے بیٹے پر قوی شبہ ہوا کہ اُس نے سیوا جی کو مدد دے کر بھگا دیا ہے — اس کو دربار میں حاضر ہونے کی ممانعت کردی گئی۔

جے سنگھ کی وفات چونکہ اورنگ زیب راجہ جے سنگھ اور اُس کے بیٹے دونوں ہی سے خواہ دل سے خواہ محض ظاہری طور پر ناراض معلوم ہوتا تھا راجہ جے سنگھ کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اورنگ زیب اس حیلہ سے میری ریاست ہی ضبط نہ کرلے۔ پس نہایت عجلت کے ساتھ اپنا ملک بچانے کے لئے دکن سے واپس آیا۔ لیکن راستہ ہی میں برہان پور پہنچ کر مرگیا۔

یہ خبر سُنکر جے سنگھ کے بیٹے کے ساتھ اورنگ زیب نے جو اظہار عنایت کیا اور اُس کی اس مصیبت پر اپنا دلی افسوس ظاہر فرمایا اور اُس کے باپ کے منصب اور جاگیر وغیرہ پر

اُس کو بحال کر دیا۔ تو اس سے بہت لوگوں کی یہ رائے ہو گئی کہ سیواجی کا بھاگ جانا خود اورنگ زیب ہی کی چشم پوشی اور اغماض سے ہوا ہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ چونکہ بیگمات کو سیواجی سے نہایت ہی نفرت تھی اور اُن کے رنج اور تلخی وتندی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا اور وہ یہ سمجھتی تھیں کہ وہ ایک ایسا خبیث ہے کہ جس نے اُن کے عزیزوں اور قرابت داروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ اس لئے اورنگ زیب بھی دربار میں اُس کی موجودگی سے دق ہو گیا ہو گا۔

اب میں دکن کے واقعات پر ایک مجمل نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو ایک ایسا ملک ہے کہ چالیس برس سے زیادہ عرصہ سے برابر لڑائیوں بھڑائیوں کا گھر رہا ہے۔ اور جس کے واسطے سلاطین مغلیہ شاہان گولکنڈا اور بیجاپور اور ان سے کم درجہ کے رئیسوں کے ساتھ اکثر اُلجھے ہی رہتے ہیں تا وقتیکہ اُس کے فرماں رواؤں کی حالت اور اُن بڑے بڑے واقعات سے جو اس ملک میں ہوتے رہتے ہیں، بخوبی واقفیت نہ ہو۔ ان لڑائی جھگڑوں کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آنی ناممکن ہے۔

ملک دکن کی وسعت

واضح ہو کہ قریب دو سو برس سے ملک ہند کا یہ قطعہ جو مغرب کی طرف خلیج کھمبایت سے شروع ہو کر مشرق کی جانب جگن ناتھ کے قریب خلیج بنگالہ تک اور جنوب میں راس کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جو اہل یورپ کے جغرافیہ کی اصطلاح میں گریٹ انڈین پینن شلا کے نام سے معروف ہے باستثنار چند پہاڑی ضلعوں کے تمام کا تمام ایک خود مختار خاندان کے زیر فرمان چلا آتا تھا۔ مگر راجہ رام راج کی نااہلیت سے جو اُسی خاندان میں سب سے اخیر راجہ تھا یہ بڑی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ ملک مختلف مذہب کے کئی فرماں رواؤں کے زیر حکومت نظر آتا ہے۔

گولکنڈا اور بیجاپور کے فرماں روا

بات یہ ہے کہ رام[1] راج کے پاس گرجستان کے رہنے والے تین غلام تھے جن کو اُس نے ہر قسم کی عنایات سے ممتاز کر رکھا تھا یہاں تک کہ آخر کار اُن کو تین بڑے بڑے صوبوں کا حاکم بنایا۔ چنانچہ ایک تو تقریباً اُن تمام اضلاع کا جو بالفعل سلطنت مغلیہ کے قبضہ میں ہیں حاکم مقرر ہوا۔

---

[1] اصل میں رام راس لکھا ہے۔ س م ح

اور یہ صوبہ شہر بیدر اور پرینڈا اور سُورت سے لے کر دریائے نربدا تک پھیلا ہوا تھا اور دولت آباد اُس کا دارالحکومت تھا۔ دوسرا اُس ملک کا حاکم بنایا گیا جو سلطنت بیجاپور کے نام سے مشہور ہے۔ اور تیسرے کو وہ ملک سپرد ہوا جس کو گولکنڈا کی سلطنت کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ تینوں غلام نہایت ہی دولت مند اور طاقتور ہو گئے۔ اور چونکہ ان تینوں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا جو اہلِ ایران کا عام مذہب ہے۔ اس لئے رام راج کے دربار کے ایرانی اُمرا سے اُن کو بہت مدد ملتی تھی۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ ہندو کیوں نہ بن گئے اس لئے کہ ہندو نہیں چاہتے کہ کوئی غیر شخص اُن کے مذہبی اسرار سے مستفید ہو۔ پس اگر وہ چاہتے تب بھی ہندو نہیں بن سکتے تھے۔ القصہ ان تینوں نے متفق ہو کر بغاوت کی جس کا انجام یہ ہوا کہ رام راج مارا گیا۔ اور یہ اپنے اپنے صوبوں میں واپس آ کر بادشاہ بن بیٹھے۔ اور چونکہ رام راج کی اولاد میں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو ان کا مقابلہ کر سکتا اس لئے وہ صرف اُس ملک میں چپ چاپ بیٹھے رہے جو کرناٹک کے نام سے مشہور ہے اور جس کو ہمارے جہاز رانی کے مختصر نقشوں میں (جن کو چارٹ کہتے ہیں۔ بس نگر[1] لکھا ہے اور جہاں اُس کی اولاد اب تک راج کرتی ہے۔ اور اس جزیرہ نما کے باقی قطعات اُسی وقت سے اُن تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئے جو اب تک قائم ہیں اور جن کے رئیس راجہ یا نائک کہلاتے ہیں۔ ان تینوں غاصبوں کی اولاد میں جب تک اتفاق رہا اُن پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکا اور سلاطین مغلیہ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے لیکن جب سے باہمی رشک و حسد نے جگہ پائی اور اُنھوں نے یہ چاہا کہ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر خودسر ہو کر رہیں تب سے وہ نااتفاقی کے خوفناک خمیازے اٹھا رہے ہیں۔ اور پینتیس یا چالیس برس ہوئے کہ شہنشاہ مغل نے یہ دیکھ کر اُن میں اتفاق نہیں ہے نظام شاہ کی سلطنت پر جو بانی ریاست سے پانچویں یا چھٹی پشت میں تھا چڑھائی کر کے اُس کو فتح کر لیا۔ اور زمانہ ہوا کہ نظام شاہ اپنے سابقہ دارالحکومت دولت آباد ہی میں قید رہ کر قید زندگی سے بھی چھوٹ چکا ہے۔

گولکنڈہ کے سلطنتِ مغلیہ سے تعلقات

البتہ شاہان گولکنڈا اب تک حملہ سے محفوظ رہے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ بچا رہنا اُن کی زور و قوت کے سبب سے نہیں ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ شہنشاہ مغل کو اوّل اُس کی دو لوں ہم جنس

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بجے نگر کی خرابی ہے جو راجہ رام راج کا دارالحکومت تھا۔ س م ح

اور ہمسایہ ریاستوں پر مہم کرنے اور اُن کے مستحکم مقامات امبر، پرینڈا، اور بیدر کے لے لینے کی زیادہ ضرورت تھی تاکہ اس کے بعد گولکنڈا پر حملہ کرنا اور بھی آسان ہو جائے اور اُن کی یہ دانائی اور حسنِ تدبیر بھی کچھ اُن کے بچاؤ کا باعث تھی کہ اپنی بے شمار دولت میں سے مخفی طور پر شاہ بیجاپور کو ہمیشہ مدد بھیجتے رہتے تھے۔ اور جب کبھی بیجاپور پر حملہ کا اندیشہ ہوتا تھا تو یہ اپنی فوج بھی سرحد پر بھیج دیا کرتے تھے تاکہ شہنشاہ مغل کو یہ بات جتلائی جائے کہ گولکنڈا نہ صرف اپنے بچاؤ کے لئے مستعد ہے بلکہ اگر بیجاپور سخت وقت آن پڑے گا تو ہم اس کے بھی آڑے آنے کو تیار ہیں۔ علاوہ بریں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغل سپہ سالاروں کو بہت کچھ رشوتیں بھی دی جایا کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ گولکنڈا کے عوض بیجاپور پر مہم کرنے کی رائے کو ہمیشہ اس دلیل سے ترجیح دیتے رہتے ہیں کہ وہ دولت آباد سے زیادہ قریب ہے۔ اور جب سے اورنگ زیب اور گولکنڈا کے موجودہ بادشاہ کے درمیان ایک عہد نامہ ہو چکا ہے تب سے تو اورنگ زیب کا بھی اس پر چڑھائی کرنے کی طرف میلان نہیں معلوم ہوتا۔ اور اُس روز سے غالباً وہ اُسے اپنا ہی سمجھتا ہے اور چونکہ وہ مدت سے باج گزار ہے۔ اور بہت سا روپیہ اور وہاں کی بنی ہوئی نہایت عمدہ عمدہ چیزیں اور پیگو اور سراندیپ اور سیام کے ہاتھی سال بسال خراج کے طور پر بھیجتا رہتا ہے اور اب گولکنڈا اور دولت آباد کے مابین کوئی ایسا قلعہ بھی باقی نہیں رہا جو کسی مخالف کے قبضہ میں ہو اس لئے اورنگ زیب کو یقین ہے کہ ایک ہی دفعہ کی چڑھائی اس ملک کی فتح کے لئے کافی ہوگی۔ لیکن میری رائے میں اورنگ زیب کو گولکنڈا کی فتح سے بجز اس کے اور کسی بات نے نہیں روکا کہ مبادا شاہ بیجاپور اپنے اس اندیشہ سے کہ کل کو یہی دن اُس کے لئے بھی پیش آنے والا ہے کہیں خود صوبہ دکن ہی کی تاخت و تاراج شروع نہ کر دے۔ متذکرہ بیان سے اُمید ہے کہ ناظرین تصور کر سکیں گے کہ سلطنت مغلیہ اور گولکنڈا کے باہم کس قسم کے تعلقات ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ گولکنڈا کے قیام و بقا کی حالت بالکل غیر متیقن ہے۔

اور جب سے کہ وہ ناخوش گوار معاملہ پیش آ چکا ہے جو میر جملہ کی تجویز کے موافق اورنگ زیب نے اُس سے برتا تھا۔ شاہ گول کنڈا کے قوائے دماغی میں بھی بالکل فتور آ گیا ہے۔ اور سلطنت کی باگ اُس نے نہایت ڈھیلی چھوڑ دی ہے۔ اور رسم ملک کے موافق نہ کبھی

دربار میں آکر بیٹھتا ہے اور نہ انصاف وعدالت کرتا ہے ۔ بلکہ اتنی ہمت بھی نہیں رہی کہ کبھی قلعہ کی دیوار سے باہر نکلے ۔جس کا طبعی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ابتری اور بےانتظامی پھیل رہی ہے ۔اور اُمرا وحکام جو نہ اب بادشاہ کا کچھ حکم ہی مانتے ہیں اور نہ اُس سے کچھ محبت ہی رکھتے ہیں بے حد ظلم کرتے ہیں ۔ اور اُمید ہے کہ اگر کبھی موقعہ ہوا تو رعایا جو اس ظلم وستم سے تنگ آ رہی ہے بہت جلد اورنگ زیب کی اطاعت قبول کرے گی جس کی حکومت گولکنڈا کی بہ نسبت بہتر اور منصفانہ ہے ۔

اب میں چند باتیں وہ بیان کرتا ہوں کہ جن سے اس بدبخت بادشاہ کی مبتذل حالت کا ثبوت ملتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ ۱۶۶۷ء میں جب کہ میں گول کنڈا میں تھا اورنگ زیب کی طرف سے ایک سفیر خاص یہ پیغام لے کر آیا کہ یا تو دس ہزار سوار بیجاپور کی مہم کے لئے حاضر کرو ۔ یا تم بھی مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ ۔ اس نے فوج کا بھیجنا تو قبول نہ کیا ۔لیکن اُس قدر روپیہ جو دس ہزار سواروں کی تنخواہ کے لئے مکتفی ہو سکتا ہے ۔اور جس سے اورنگ زیب اور بھی زیادہ خوش ہوا دیدیا اور سفیر کی بہت ہی آؤ بھگت کی ۔اور بہت سے گراں بہا تحائف خود اُس کو دیئے اور ایک بڑا بھاری پیش کش اورنگ زیب کے لئے روانہ کیا ۔

دوسرے یہ کہ اورنگ زیب کا معمولی سفیر جو گولکنڈا میں متعین رہتا ہے احکام جاری کرتا ہے ۔ راہداری کے پروانے دیتا ہے اور لوگوں کو دھمکاتا اور بدسلوکی کرتا ہے غرضکہ اُس کی گفتار و رفتار ایسے مطلق العنان حاکم کی ہے کہ گویا بجائے خود ایک بادشاہ ہے ۔

تیسرے یہ کہ میر جملہ کا بیٹا محمد امین خاں جس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ .... اورنگ زیب کے دربار کا صرف ایک امیر ہے گولکنڈا میں اُس کا اس قدر ادب کیا جاتا ہے کہ اُسکا ٹاپیا یعنی دلال یا گماشتہ جو مچھلی پٹن میں رہتا ہے ۔ بندرگاہ کے حاکم کا سا اختیار رکھتا ہے تمام تجارتی جنسیں خریدتا ہے ۔ بیچتا ہے ۔ جہازوں پر مال چڑھاتا ہے اُتارتا ہے ۔ مگر محصول کی ایک کوڑی تک نہیں دیتا اور نہ اُس کے کام میں کوئی دخل دے سکتا ہے ۔عجب بات ہے! میر جملہ کا رعب وداب اس ملک میں اس درجہ تک تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد گویا وہ بھی وراثت میں محمد امین خاں کو مل گیا ہے ۔

چوتھے یہ کہ کبھی کبھی ڈچ لوگ گولکنڈا کے سوداگروں کے تمام جہازوں کو مچھلے ٹپوکر بندرگاہ میں روکے رکھتے ہیں ۔ اور جب تک یہ بادشاہ اُن کی بات تھا اس جوتشی کا نام تاریخ

ذوارد مسلمان صحیح لفظ کان کھیج

جانے دیتے۔ اور خود میں نے اس بادشاہ پر ان کو یہ بیہودہ اعتراض کرتے دیکھا ہے کہ

"مچھلی پٹن کے حاکم نے ہم کو انگریزوں کے ایک جہاز پر جبراً قبضہ کر لینے سے کیوں روکا۔ اور لوگوں کو ہمارے مقابلہ کے لئے ہتھیار دے کر ہمارے اس ارادہ میں کیوں مزاحم ہوا اور ہم کو یہ دھمکی کیوں دی کہ تمہاری کوٹھی کو جلا دوں گا اور تم پردیسی بدمعاشوں کو قتل کر ڈالوں گا"

پانچویں علامت اس سلطنت کے زوال کی یہ ہے کہ یہاں کے رائج سکہ کی قیمت بالکل ہی گر چکی ہے جو اس ملک کی تجارت کے حق میں نہایت مضر ہے۔

چھٹے یہ کہ یہاں تک تو نوبت پہنچی ہوئی ہے کہ پرتگیز بھی باوجود اپنی شکستہ حالی اور افلاس اور حقیر حالت کے اس کو لڑائی کی دھمکی دینے میں تذبذب نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اگر مقام سین طامس (جو چند سال ہوتے انھوں نے خود ہی شاہ گول کنڈا کو اس خیال سے دیدیا تھا کہ ڈچ جو ان سے طاقت میں زیادہ ہیں اُن کو اُس کے حوالہ کر دینے کی ذلت اٹھانی نہ پڑے) ہم کو نہ دیدو گے تو ہم مچھلی پٹن اور دوسرے مقامات پر قبضہ کر لیں گے اور لوٹ لیں گے۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے گولکنڈا ہی میں چند ذی فہم لوگ مجھ سے یوں بھی کہتے تھے کہ بادشاہ کے فہم و فراست میں کچھ بھی فرق نہیں اور اُس نے ضعیف العقلی اور ناقائم مزاجی اور سلطنت کے معاملات سے بے پروائی کی یہ حالت صرف اپنے دشمنوں کے دھوکہ دینے کو بنا رکھی ہے اور اس کے ایک ایسا جری بیٹا بھی ہے جو نہایت تیز مزاج، بلند خیال، گویا ایک پرکالہ آتش شاہزادہ ہے۔ جس کو مصلحتاً عوام کی نظروں سے چھپا رکھا ہے اور کبھی موقعہ پا کر اُس کو تخت پر بٹھلا دے گا اور جو عہد و پیمان اورنگ زیب سے کر رکھا ہے اُس کو بالائے طاق رکھ دے گا۔

ریاست بیجاپور

اب میں ان رایوں کی غلطی اور صحت کے فیصلہ کو آئندہ زمانہ پر چھوڑ کر چند الفاظ بیجاپور کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ شہنشاہ مغل کی طرف سے اس سلطنت کے ساتھ اکثر لڑائی بھڑائی رہتی ہے مگر اب تک یہ خودسر اور آزاد کہلاتی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو سپہ سالار بیجاپور کی مہم پر مامور ہوتے ہیں اُن سرداروں کی طرح جو ایسی ہی اور مہموں پر بھیجے جاتے ہیں سپہ سالار بنے رہنے کے شوق میں اس امر میں کہ دربار سے دور رہ کر فوج پر شاہانہ طور سے حکومت کرتے رہیں۔ اور سلطنت کی باگ اُس ... ٹال مٹول کرتے اور طرح طرح کے حیلوں اور بہانوں سے لڑائی

کو جو اُن کے اعزاز و اکرام کے علاوہ اُن کی آمدنی کا بھی ذریعہ ہے خواہ مخواہ طول دیتے رہتے ہیں ۔ اس وجہ سے یہ بات ہندوستان میں ایک ضرب المثل ہوگئی ہے کہ ملک دکن تو ہندوستانی سپاہی کی روٹی اور گذارہ ہے ۔

علاوہ بریں سلطنت بیجاپور میں پہاڑیوں کے اندر دشوار گذار مقاموں میں اس قدر قلعے اور گڑھیاں ہیں کہ جن کا فتح کرنا بہت ہی مشکل ہے اور جو علاقہ سلطنت مغلیہ سے متصل ہے وہ خصوصیت کے ساتھ چارے اور پانی کے موجود نہ ہونے کے باعث دشوار گذار ہے ۔ خصوصاً شہر پائے تخت ایک نہایت بے آب و گیاہ زمین پر واقع ہونے کی وجہ سے نہایت ہی مستحکم مقام ہے یہاں تک کہ پینے کے قابل پانی صرف شہر ہی کے اندر ملتا ہے ۔ مگر باین ہمہ اس سلطنت کو بھی چراغ سحری ہی سمجھنا چاہیے ۔ کیونکہ شہنشاہ مغل نے قلعہ پرینڈا پر جسے اس ملک کا دروازہ سمجھنا چاہیے اور بیدر پر جو ایک مستحکم اور خوبصورت شہر ہے اور دوسرے بڑے مقامات پر قبضہ کر لیا ہے ۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ بادشاہ لاولد مر گیا ہے اُس کی بیگم نے جو شاہ گولکنڈا کی بہن ہے ایک لڑکے کو جو اپنا متبنّٰی بنا کر پرورش کیا تھا اُس نے اُس کا یہ اجر دیا ہے کہ ابھی چند روز ہوئے یہ شاہزادی حج کر کے واپس آئی تو اُس سے سرد مہری اور حقارت کے ساتھ پیش آیا ۔ اور یہ بہانہ بنایا کہ ڈچوں کے جہاز میں (جس پر وہ سوار ہو کر مکا کو گئی تھی) اُس کا رویہ اُس کے رتبہ اور مستورات کی حالت کے مناسب نہ تھا) بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ تین جہازیوں سے (جو اپنے جہاز سے علیحدہ ہو کر مکہ تک اُس کے ساتھ گئے تھے) ناجائز تعلق رکھتی تھی[۱] ۔

---

[۱] گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کا حسب و نسب جس طرح پر برنیر نے بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ بادشاہ راجہ رام راج کے غلام نہ تھے بلکہ بہمنیہ خاندان کے بادشاہوں کے غلام تھے ۔ چونکہ بہمنیہ خاندان کا ذکر لکھے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے پہلے ہم کچھ اسی کا حال لکھیں گے اور بعد ازاں اُن کا ۔

پس واضح ہو کہ سلطنت بہمنیہ کا بانی حسن نامی ابتدا میں ایک گمنام اور ایسا مفلس شخص تھا جو فخرالدین جونا المشہور محمد سلطان شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے ایک نجومی برہمن کے پاس کہیں سے آکر نوکر ہو گیا تھا ۔ اور دہلی کے پاس جو کچھ اُس کی زمین تھی اُس میں کاشتکاری کیا کرتا تھا اس جوتشی کا نام تاریخ فرشتہ میں کانگو بہمن لکھا ہے ۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کے نو وارد مسلمان صحیح لفظ کان گبنج

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ برہمن کی جگہ اس کو کانگو بہمن کہتے ہوں گے۔ اتفاقاً حسن مذکور کو اپنے مالک کی اس زمین میں ہل چلاتے ہوئے کچھ دفینہ مل گیا جو اس نے اپنے آقا کی خدمت میں بے کم و کاست حاضر کر دیا۔ اس ایمان داری کے باعث سے وہ جوتشی اس کو اس قدر چاہنے لگا کہ تعریف و توصیف کر کے محمد شاہ کی سرکار میں نوکر کرا دیا۔ اب حسن نے یہ ایک اور حق شناسی کی کہ بادشاہ کا ملازم ہو کر جو کسی قدر عروج پایا تو مُہر میں اپنا نام ہی حسن کانگو بہمن کندہ کرا لیا۔ جب محمد شاہ تغلق نے دیوگڈھ واقع دکن کا نام دولت آباد رکھکر اُس کو ہندوستان کا دارالسلطنت بنانا چاہا تو یہ شخص بھی شامل اور ماتحت سرداروں کے قتلغ خاں اور ملک لاچین اُس کے نائبوں کے پاس دیوگڈھ میں تھا اور جب اس بادشاہ کی خبطیانہ اور ظالمانہ حرکتوں سے سلطنت میں خلل پیدا ہوا اور دکن میں بغاوت ہو گئی اور ملک لاچین مارا گیا۔ اور تغلقوں کی حکومت جاتی رہی تو اتفاقات وقت سے ۷۴۸ھ میں یہ شخص دکن کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اور اپنے پہلے نام اور لقب پر علاءالدین کا لفظ بڑھا کر علاءالدین حسن کانگو بہمن کہلانے لگا۔ حسن آباد گلبرگہ اور احمد آباد بیدر (بدر) اس خاندان کے دارالحکومت تھے۔ اور اس گھرانے کے سترہ بادشاہ ایک سو ستر برس تک ممالک دکن کے فرماں روا رہے۔ گول کنڈا اور بیجا پور کے سوا ملک برار و خاندیس وغیرہ بھی اسی سلطنت میں داخل تھے۔

نظام شاہ بہمنی بارھویں بادشاہ سے لے کر اس خاندان کے اخیر شخص ولی اللہ شاہ بہمنی تک بادشاہی کا تو ایک نام ہی نام تھا۔ کیونکہ امرائے سلطنت اپنے اپنے متعلقہ صوبوں میں خود مختارانہ حکومتیں کرتے تھے۔ مگر آخر کار ۹۳۵ھ میں اُنھوں نے اُس نام کو بھی مٹا ڈالا۔ اور بیجا پور۔ گول کنڈا۔ برار۔ خاندیس وغیرہ میں خود اپنے اپنے نام سے جدا جدا بادشاہتیں قائم کر لیں۔ چونکہ اکبر کے وقت سے شاہجہاں کے زمانہ تک خاندیس و برار وغیرہ کی حکومتیں سب دہلی کی شہنشاہی میں جذب ہو چکی تھیں۔ اس لئے ہم اُن کا ذکر قلم انداز کرتے ہیں اور خاندان گول کنڈا اور بیجا پور کا حال لکھتے ہیں۔

گولکنڈا کے خاندان کا بانی سلطان قلی نامی ہمدان کا رہنے والا ایک ترک اور محمود شاہ بہمنی کا غلام تھا۔ اور رفتہ رفتہ ایسا بڑھا کہ اس سلطنت کا وزیر ہو گیا۔ قطب الملک کا خطاب پایا۔ گول کنڈا کا "طرف دار" یعنی صوبہ دار بنا اور آخر کار (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) ۹۳۵ھ میں خود اپنے ہی نام سے سکہ و خطبہ جاری کر کے قطب شاہ بن بیٹھا۔ اس کی نسل کے چار بادشاہ ایک سو چھبیس برس تک حکومت کرتے رہے۔ لیکن جب اس خاندان کا اخیر فرماں روا عبداللہ

قطب شاہ ساٹھ برس بادشاہت کرکے مرگیا تو اُس کا داماد سید ابوالحسن معروف تاناشاہ اُس کا جانشین ہوا۔ ڈاکٹر برنیر اپنے بیان مندرجہ متن میں غفلت اور سُستی کا اشارہ اسی کی طرف کرتا ہے۔ اور فی الواقع یہ بادشاہ اپنے وقت کا راجہ اندر اور گویا عیش و عشرت کا پُتلا تھا۔ جس کے عیش و نشاط اور لطافت و نفاست مزاج کے فسانے اب تک زبان زد خلائق اور ضرب المثل چلے آتے ہیں چونکہ یہ اس قدر سست اور کاہل مزاج تھا کہ اپنی پندرہ برس کی حکومت کے زمانہ میں شہر حیدر آباد اور قلعہ گولکنڈا یا اپنے باغ میں جانے آنے کے سوا اس نے اپنے ملک کو کبھی سیر و شکار کی خاطر بھی جا کر نہ دیکھا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے سابقہ ہم جنسوں کی طرح آخر یہ بادشاہی بھی دہلی کی اعلیٰ سلطنت کا ایک جزو ہو گئی۔ یعنی جفاکش اور اولوالعزم شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنی عمر کے بہترویں سال مطابق ۱۰۹۶ھ میں شہر حیدر آباد کو اور بعد ازاں ۱۰۹۸ھ میں قلعہ گولکنڈا کو مدت کے محاصرے اور سخت حملوں کے بعد تاناشاہ سے چھین لیا۔ اور اس کی پچاس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کرکے قلعہ دولت آباد میں نظر بند کر دیا۔

اسی طرح بیجاپور کی سلطنت کا بانی گرجستان کا رہنے والا محمد یوسف نام ایک دوسرا غلام تھا جس کو بعض خوشامدی مورخوں نے سلاطین آل عثمان یعنی روم کے ترک بادشاہوں کی نسل میں جا ملایا ہے اس کو شہاب الدین محمود بہمنی نے خریدا تھا جو خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ بیجاپور کا طرف دار اور آخر کار خود سر ہو کر عادل خاں سے عادل شاہ بن گیا۔ اسی کے پوتے ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس پر ملا نورالدین ظہوری ترشیزی نے اپنی وہ فصیح و بلیغ نثریں جو خوبی و لطافتِ انشا کی وجہ سے ایران و ہندوستان میں اب تک متداول و مشہور اور سہ نثر ظہوری کے نام سے معروف ہیں لکھی تھیں۔ یہ سلطنت بھی ۱۰۹۷ھ میں اورنگ زیب نے چھین لی۔ اور سکندر عادل شاہ کو جو ایک لڑکا تھا اپنے امیروں کے ذیل میں داخل کرکے اور خان کا خطاب دے کر لاکھ روپیہ سالانہ گذارہ مقرر کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں گھرانے اخیر تک بادشاہ کہلاتے اور اپنے آپ کو خود مختار سمجھتے تھے۔ مگر سلاطین مغلیہ نہ تو ان کو خود مختار ہی مانتے تھے۔ اور نہ ان کے لقب شاہی کو ہی تسلیم کرتے تھے۔ اور ہمیشہ پیش کشوں اور نذرانوں کے متقاضی اور طلب گار اور وقت کے دستور کے موافق جائز و ناجائز حیلہ سے ان کو پامال کرنے کے لئے آمادہ اور تیار رہتے تھے۔ اور خط و کتابت میں ان کے وہی اصلی خطاب قطب الملک اور عادل خاں اور الفاظ القاب اپنے نوکروں اور صوبہ داروں کی طرح لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں کے القابوں کے نمونے یہ ہیں۔

عنوان فرمان از طرف شاہجہاں بنام قطب شاہ ۱۰۴۵ھ

"ایالت و امارت پناہ ارادت و عقیدت دستگاہ عمدۃ الماجد کرام سلالۃ اکارم عظام نقاوۂ خاندان عز و علا عضادۂ دودمانِ مجد و اعتلا زبدۂ مخلصانِ صلاح اندیش خلاصۂ تخصصاں سعادت کیش مورد الطاف شاہنشاہی مصدر آیات خیر خواہی جوہر مراۃ صفا و صفوت فروغ ناصیۂ دولت و رفعت سزاوار عاطفت بیکران المخصوص بعنایت الملک المنان قطب الملک مشمول عنایات پادشاہانہ بودہ بدانند"

ایضاً بنام عادل شاہ بسنہ مذکور

"ایالت و شوکت پناہ عدالت و نصفت دستگاہ زبدۂ ارباب دول عمدۂ اصحاب مال خلاصہ مریدان عادل خاں بوفور عنایات بادشاہانہ مفتخر و مستظہر بودہ بدانند"

بہمنیہ خاندان کے غلام اور متوسل بادشاہ (جیسا کہ برنیر نے لکھا ہے) سب شیعہ نہ تھے ۔ مگر ہاں گولکنڈا اور بیجاپور والے ضرور شیعہ تھے ۔ چنانچہ سلاطین مغلیہ ان سے کاوش کرنے کے لئے کبھی کبھی کسی مذہبی بحث کو بھی حیلہ بنا لیتے تھے مگر آخری وجہ گولکنڈا اور بیجاپور کی بربادی کے لئے یہ تھی کہ یہ لوگ سیواجی کے بیٹے سنبھاجی کو مدد دیتے تھے ۔ اور اورنگ زیب نے بذات خود دکن میں پہنچ کر گولکنڈا بیجاپور ۔ اور سنبھاجی تینوں پر ایک ہی زمانہ میں فوج کشی شروع کی تھی ۔

راجہ رام راج کا ذکر جس طرح پر ڈاکٹر برنیر نے لکھا ہے وہ بھی درست نہیں ہے بلکہ (بقول سر مونٹ الفنسٹن صاحب) صحیح حال اُس کا یوں ہے کہ وہ خاص دکن میں (یعنی مدراس کی طرف) شہر بجے نگر میں ایک بہت بڑا زبردست راجہ تھا ۔ بہمنیہ خاندان کے سب غلام بادشاہوں نے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے متفق ہو کر اُس کا ملک چھیننے کا ارادہ کیا اور چھبیسویں جنوری ۱۵۶۵ء مطابق ۲۰ جمادی الثانی ۹۷۲ سنہ ہجری کو دریائے کرشنا کے کنارے تالی کوٹ کے قریب جانبین سے بڑے اہتمام اور جوش و خروش کے ساتھ ایک نہایت خونریز لڑائی ہوئی ۔ جس میں یہ ضعیف العمر اور بہادر راجہ مغلوب ہو کر پکڑا اور مارا گیا ۔ مگر اصل مطلب کے لحاظ سے نتیجہ اس کا فتحمندوں کے حق میں چنداں مفید نہ ہوا ۔ کیونکہ ملک مفتوحہ کی تقسیم پر باہم جھگڑے پیدا ہو گئے ۔ اور اس وجہ سے اس راج کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وہاں کے "پالی گار" یعنی زمیندار ہی اپنے اپنے علاقوں میں راجہ بن گئے ۔ اور رام راج کے بھائی نے بجے نگر سے اپنی دارالریاست کو مشرق کی جانب منتقل کیا ۔ اور آخر چندر گڑھی کو اپنی ریاست گاہ بنایا ۔ جو مدراس سے شمال مغرب کی طرف سترہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔

اور زمین کا وہ قطع جو انگریزوں نے اپنے کارخانہ کے لئے پہلے پہل مدراس میں لے کر آخر کار

سیواجی کی خودسری سیواجی جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے اس سلطنت کی یہ حالت دیکھکر بہت سے قلعوں پر جو اکثر پہاڑوں کے اندر ہیں قابض ہو گیا ہے۔ اور خودسر بادشاہ کی طرح جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ اور شہنشاہ مغل اور شاہ بیجاپور جو کبھی اُس کو دھمکاتے ہیں تو اُن کی باتوں پر ہنس دیتا ہے۔ اور سورت سے لے کر گوا کے دروازے تک ملک تاخت وتاراج کرتا رہتا ہے۔ اور اگرچہ وقتاً فوقتاً بیجاپور کی ریاست کو سیواجی بڑے بڑے صدمے پہنچاتا رہتا ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ جری شخص عین وقت پر اُس کے کام بھی آجاتا ہے کیونکہ اورنگ زیب کو ہمیشہ اسی کی تاخت وتاراج کی فکر ہے۔ اور اُس کی فوجیں ہمیشہ اس کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔ اور اس طرح بیجاپور کا پیچھا چھوٹا رہتا ہے۔ اور سب سے مقدم کام یہی سمجھا جاتا ہے کہ سیواجی کی جڑ کس طرح اکھاڑی جائے سیواجی کو سورت میں جو کامیابی ہوئی ناظرین اُس کو پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بعد اس نے جزیرہ بارڈیز پر جو گوا کے نزدیک پرتگیزوں کی ایک بستی ہے۔ قبضہ کر لیا ہے[1]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

قلعہ سین جارج تعمیر کیا اسی شخص کی اولاد کے ایک راجہ سے ۱۶۴۰ء میں لیا تھا۔ س م ح

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ۔ عالمگیرنامہ۔ مآثر عالمگیری۔ سیر المتاخرین۔ تاریخ۔ الفنسٹن۔ تاریخ ذکاءاللہ)

[1] سیواجی کا مختصر حال جو ڈاکٹر برنیر نے لکھا ہے اس کو پڑھکر خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس عجیب بقیہ حاشیہ سیواجی یہ شخص کا حسب ونسب کیا تھا۔ اور اس نے اس قدر اقتدار کس طرح پایا۔ اور اس کے متعلق جو واقعات برنیر نے لکھے ہیں اُن کی مفصل اور صحیح روداد کیا تھی۔

پس واضح ہو کہ انسائیکلوپیڈیا برطانیہ میں اس کو غیر صحیح النسب اودے پور کے رانا کی نسل سے (یعنی چھتری) لکھا ہے۔ مگر سر مونٹ الفنسٹن صاحب سابق گورنر بمبئی جن کی تحقیق اُدھر کی قوموں وغیرہ کے بارہ میں زیادہ بھروسہ کے قابل ہے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان میں سیواجی کے اُن تمام ہم قوم لوگوں کو جو مہاراشٹر[2] دیس کی سکونت کے باعث مرہٹے کہلائے عموماً شودر بتاتے ہیں۔ اور سیواجی کے حسب

[2] ہندوؤں کی حکومت کے قدیم زمانہ میں مہاراشٹر کا اطلاق ملک کے اُس وسیع قطعہ پر ہوتا تھا جو دریائے نربدا کے جنوب کی طرف فی زمانہ چیف کمشنری ناگپور اور ریاست حیدرآباد دکن اور پریزیڈنسی بمبئی کی مختلف حکومتوں میں منقسم ہے۔ چنانچہ خاندیس و برار و کوکن وغیرہ کے علاقے جو علی الترتیب مذکورہ بالا حکومتوں میں واقع ہیں۔ مہاراشٹر کے عام لفظ میں داخل تھے۔ س م ح

بقیہ حاشیہ سیواجی

ولنسب کی حقیقت کو اس طولانی تمہید سے بیان کرتے ہیں کہ گولکنڈا۔ بیجا پور۔ اور احمد نگر کے مسلمان بادشاہوں کے وقت میں مرہٹوں کو قلعوں وغیرہ کے پیدل سپاہیوں میں نوکریاں ملا کرتی تھیں۔ مگر جب معلوم ہوا کہ جنگی سواروں میں بھی اچھی خدمت دے سکتے ہیں تو رسالوں میں بھرتی ہونے لگے اور ان میں سے ایسے لوگ جو ہمارے ملک کے دیہات میں چودھری اور نمبردار وغیرہ کہلاتے ہیں اور اس ملک میں اُن کے لقب پٹیل اور دیس مکھ وغیرہ ہوتے تھے موروثی عزت کے باعث سے رسالداریوں اور جمعداریوں کے عہدوں تک مامور ہو جاتے تھے منجملہ ان کے اگرچہ بعضوں نے قدرو منزلت بڑھانے کو راجپوت ہونے کا دعویٰ کیا ہے مگر الفنسٹن صاحب کی تحقیق میں تومیت کی حیثیت سے سارے ہی شودر تھے۔ اور سولھویں صدی عیسوی سے پہلے نہ تو مرہٹے بطور ایک قوم ہی کے مشہور تھے۔ اور نہ ان میں کوئی ایسا سردار تھا جو پولٹیکل لحاظ سے نامور اور ذی اقتدار گنا جاتا ہو۔ مگر اس صدی کے آغاز میں اُن کے اقبال کا زمانہ اس طرح شروع ہوا۔ کہ ملک عنبر نے (جو احمد نگر والوں کے ہاں ایک مشہور اور نہایت زبردست امیر تھا) مرہٹوں کو اپنے سواروں میں زیادہ بھرتی کیا۔ چنانچہ اُس کی فوج میں لکھجا نامی ایک سردار نے (جس کو بطور اعزازی لقب کے جادوراؤ کہتے تھے) ایسی ترقی پائی کہ دس ہزار سواروں کی سرداری کے منصب پر سرفراز ہو گیا اور یہاں تک اقتدار حاصل کیا کہ شاہجہاں اور احمد نگر والوں کی لڑائی کے زمانہ میں جب اس نے شاہجہاں سے سازش اور موافقت کر لی تو ملک عنبر کی تقدیر اُلٹ گئی اور لڑائی ہار گیا الفنسٹن صاحب خیال کرتے ہیں کہ مرہٹوں میں اگر کسی کو راجپوت ہونے کا دعویٰ پہنچتا ہو تو البتہ یہ دعویٰ اسی کے گھرانے کو شایاں وسزاوار ہو سکتا تھا۔

کیونکہ دیو گڈھ (دولت آباد) کا وہ راجہ جو دکھنی راجاؤں میں سب سے بڑا تھا۔ اور جس سے مسلمانوں نے ملک دکن کو فتح کیا تھا۔ جادو نبسی ہی کہلاتا تھا اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص غالبًا دیو گڈھ کے کسی قریب ضلع کا دیس مکھ اور جادو نبسی راجپوتوں کی نسل سے ہونے کے باعث جادوراؤ کہلاتا ہوگا۔ المختصر مالوجی بھونسلا سیواجی کا دادا اس کے متوسلوں میں ایک ایسا شخص تھا جو اگرچہ کسی قدر خاندانی اور ذی عزت گنا جاتا تھا مگر حیثیت اُس کی اس سے زیادہ نہ تھی کہ چند خود اسپہ سواروں سمیت اس کے ماتحتوں میں تھا۔ قضائے کردگار ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ جادوراؤ کے یہاں کسی تہوار وغیرہ کی تقریب میں بہت سے لوگ جمع ہوئے۔ جس میں مالوجی بھی اپنے پانچ برس کے بیٹے ساہو کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس محفل میں جہاں حسب معمول ہنسی خوشی کی باتیں ہو رہی تھیں اتفاقًا جادوراؤ

بقیہ حاشیہ سیواجی۔

نے ساہوجی اور اپنی سہ سالہ لڑکی دونوں کو زانو پر بٹھا کر ہنسی اور پیار کے طور پر کہیں یہ بات کہدی کہ یہ دونوں بالک تو بنا بنی بنانے کے قابل ہیں۔ جادو راؤ کا یہ کہنا تھا کہ مالوجی فوراً بول اٹھا کہ ساری سبھا گواہ رہے میرے بیٹے کا رشتہ جادو راؤ جی کی لڑکی سے ہو گیا! اگرچہ جادو راؤ اپنے خاندان و منصب کے غرور کے باعث مالوجی کے اس بڑے بول سے ایسا ناراض ہوا کہ دونوں کے باہم بدمزگی ہو گئی مگر مالوجی برابر اس سگائی کا دعویٰ کئے جاتا تھا۔ اور چونکہ تھوڑے ہی عرصہ میں خوش قسمتی سے یہ بھی ایسا بڑھا کہ اُسی ریاست میں پانچ ہزار سواروں کی رسالداری کے منصب پر سرفراز اور صاحب جمعیت ہو گیا۔ اور مضافات ملک کوکن میں بمقام پونا۔ (جواب پریزیڈنسی بمبئی میں ایک مشہور شہر ہے) اس کو ایک بڑی سی جاگیر مل گئی جس میں چاکند اور سوپا کے دو قلعے بھی شامل تھے تو آخر کار لکھوجی جادو راؤ کو بھی یہ خواہ مخواہ کی سگائی کا دعویٰ ماننا ہی پڑا۔ اور ساہوجی کی شادی اُس کی بیٹی سے ہو گئی۔

جس سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک ونکاجی دوسرا سیواجی (جو ماہ مئی ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا)

جب شاہجہاں نے والیٔ بیجاپور کے اتفاق سے احمد نگر کی حکومت کو پامال کر کے ملک کو آپس میں بانٹ لیا اور منجملہ اس کے کوکن کا علاقہ بیجاپور کے حصہ میں آیا تو ساہوجی نے والی بیجاپور کی نوکری اختیار کر لی۔ اور اُس کی جاگیر واقع پونا بھی جو بیجاپور کے حصہ میں آ گئی تھی بدستور اس کے قبضہ میں رہی اور وہ بیجاپور کی طرف سے کرناٹک میں ملک گیری کرتا رہا جس کے باعث سے میسور کے نزدیک بھی اُس کو ایک بہت بڑی جاگیر حاصل ہوئی جس میں بنگلور وغیرہ بڑے بڑے شہر داخل تھے۔

الغرض ونکاجی تو اپنے باپ کے ساتھ کرناٹک میں رہتا تھا۔ اور خردسال سیواجی پونا میں۔

اُس زمانہ میں مرہٹے سردار خود تو ناخواندہ ہوتے تھے۔ اور اُن کے کاروبار کا انتظام اُن اہل قلم برہمنوں کے اختیار میں ہوتا تھا۔ جو دکن کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بڑے بڑے کار آمد عہدوں پر مامور ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ساہوجی کی اس جاگیر کا اہتمام اور سیواجی کی سرپرستی داداجی کنڈو نامی ایک برہمن کو سپرد تھی۔ اُس وقت کے نوجوان مرہٹوں کو شہسواری۔ شکار بازی۔ اور نیزہ بازی وغیرہ سپاہیانہ ریاضتوں کے سیکھنے کا شوق ہوتا تھا۔ اور چونکہ پونا ایسی جگہ ہے کہ وہاں میدان اور پہاڑی ملک آپس میں ملتے ہیں تو ان سپاہیانہ شوق اور سیر و شکار کے سپاؤں کے باعث سے سیواجی کے بڑے رفیق ابتدا ہی سے ایسے لوگ ہوتے جو یا تو اُس کے باپ کے سواروں میں بھرتی تھے یا گھاٹوں (یعنی کوہستان سیادری کے سلسلوں کے) پاس پڑوس

بقیہ حاشیہ سیواجی

کے رہنے والے ڈاکو اور لٹیرے تھے۔ اور کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا کہ بعض ڈکیتی کی وارداتوں میں مخفی طور سے یہ اُن کا شریک بھی ہوتا رہا غرضکہ ان جفاکش اور مضبوط آدمیوں کی صحبت سے اور اُن دیہاتی راگوں (یعنی ساکھوں) کے سننے سے جن میں اس ملک کے بعض سورما لوگوں کی کہانیاں گائی جاتی تھیں اُس کی طبیعت میں بڑے بڑے خیال پیدا ہوتے۔ اور جب یہ آفت کا پرکالہ سولہ۱۶ برس کی عمر کو پہنچا تو اپنے اتالیق داداجی کے قابو سے بھی نکل گیا اور باپ کی جاگیر کے کاروبار میں خواہ مخواہ دخل دینے لگا۔ اور جب تھوڑے عرصہ بعد وہ برہمن بھی مرگیا۔ تو قلعہ چاکنہ پر قلعدار سے مل کر قبضہ کر لیا۔ اور قلعہ سوپا کو چھاپہ مار کر چھین لیا۔ اور وہ جفاکش پہٹے جو پونا کی سمت مغربی کے اُجاڑ علاقہ کے رہنے والے (اور ایک پرانے قصبہ ماہول متصل شولاپور کے قرب و جوار کی سکونت کی مناسبت سے) ماھولی کہلاتے تھے۔ اور بھیل اور کولی اور راموسی وغیرہ لٹیرے لوگوں کو جو پونا کے پاس ملک کوکن کے پہاڑوں اور جنگلوں میں بستے اور مثل اُس کے سب بیجاپور کی رعایا تھے جمع کر کے آس پاس کے ملک کو کہ جہاں کے حالات سے سیر و شکار اور چوریوں ڈکیتیوں کی شرکت اور اُن لٹیروں کی رہنمائی سے یہ بخوبی واقف ہوچکا تھا لوٹنا شروع کیا اور کہیں زور سے کہیں تابعداری سے اور کہیں فریب اور مکاری سے محمد عادل شاہ فرماں روائے بیجاپور کی حکومت کے اخیر زمانہ میں بسبب حاکموں کی غفلت اور ضعف وغیرہ کے علاقہ کوکن کے بہت سے قلعوں پر اپنا دخل کر لیا۔ اور منجملہ انھیں حرکتوں کے ایک حرکت یہ بھی تھی کہ اپنے مقاصد کا مخالف سمجھکر ایک راجہ کو جو پونا کے جنوب میں اکثر پہاڑی علاقوں پر حکومت رکھتا تھا کسی حکمت سے قتل کرادیا تھا۔ اور علی عادل شاہ کے ایامِ خردسالی میں باوجودیکہ اس کا باپ اور بڑا بھائی اُن کے نوکر تھے اور اُس کو ان حرکتوں سے بہت منع کرتے تھے علانیہ باغی ہوکر یہ عجیب داؤں کھیلا کہ ۱۶۵۹ء میں افضل خاں نامی اُن کے ایک بہت بڑے سردار کی خدمت میں جو اس کی سزادہی کے لئے فوج لے کر آیا تھا اور جس کی شجاعت اور زور و قوت سے فی الحقیقت یہ خائف تھا۔ یہ درخواست پیش کی کہ اگر خاں صاحب میرے حال پر ترس کھائیں تو مہربانی فرماکر میرا خوف اور اندیشہ دور کرنے کے لئے ایک جگہ لشکر سے اکیلے ہوکر تشریف لے آئیں اور اسی طرح میں بھی اکیلا ہی حاضر ہوجاتا ہوں اور جب وہ میری معروضات سُن کر تسلی و تشفی فرمادیں گے تو فرماں برداری اور اطاعت سے مجھے کچھ عذر نہیں۔ چنانچہ جب اس قرارداد کے موافق خانصاحب

بقیہ حاشیہ سیواجی :-

باریک ململ کا جامہ پہنے ہوئے۔ اور صرف شان وزیبائش کے لئے ایک سیف ہاتھ میں اٹھائے اور محض ایک خدمت گار ساتھ لئے ہوئے خراماں خراماں آگے کو بڑھے تو سیواجی بھی قلعہ پرتاب گڈھ سے سہمی صورت بنائے لرزتا کانپتا سامنے سے صرف ایک ہمراہی سمیت نظر آیا۔ اگرچہ بظاہر میں کوئی ہتھیار اُس کے پاس موجود نہ تھا۔ مگر روئی کے دگلے کے نیچے زرہ پہنے اور ایک آب دار تیغہ چھپائے ہوئے اور انگلیوں پر فولادی کانٹے جس کو بگھ نوہ یعنی ناخن شیر کہتے تھے چڑھائے ہوئے تھا۔ افضل خاں نے اُس کو خوف زدہ دیکھکر اظہار عنایت کے لئے بغل گیر ہونے کو جوں ہی ہاتھ پھیلائے تو اُس نے چھپ سے فولادی پنجہ کو جو آستین میں چھپا ہوا تھا بڑے زور سے اُس کے پیٹ میں گڑو دیا۔ اور ہنوز وہ اس حرکت بیجا کے تعجب سے فارغ نہ ہوا تھا کہ بغل سے تیغہ نکال کر کام تمام کیا۔ اور خاں صاحب نے جو پنجہ کھاکر سیف کا وار کیا تھا وہ اس کی زرہ کے باعث سے کارگر نہ ہوا۔ اس کامیابی کے بعد اور اس دشوار گزار پہاڑی ملک میں جس کی حد سمندر تک منتہی ہوتی ہے وہ ایسا زبردست شخص ہوگیا کہ سنہ ۱۶۶۲ء تک اُس کے پاس سات ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل کی جمعیت ہوگئی تھی جن کی معاش کا مدار بہ نسبت مقرر تنخواہ کے زیادہ ترلوٹ کھسوٹ پر تھا۔ اور سمندر کے کنارہ تک معہ چند بندرگاہوں کے اپنی حکومت کو وسعت دے کر کچھ کچھ مغلیہ سلطنت کے علاقوں واقع دکن میں بھی غارتگری اور دست درازی شروع کردی تھی اس لئے امیرالامرا شائستہ خاں صوبہ دار نے عالمگیر کے دوسرے سال جلوس میں دولت آباد سے فوج کشی کرکے قصبہ پونا اور چاکنہ کے مضبوط قلعہ کو سیواجی سے چھین لیا۔ مگر اس کے ناہموار اور پہاڑی ملک کی دشوار گذاری اور مرہٹوں کی سخت جفاکشی کی عادت سے شائستہ خاں کو حسب دل خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ سیواجی کے اس ابتدائی زمانہ میں اُس کے گروہ کے لوگ اور بھی زیادہ جفاکش ہوں گے مگر اس کے مرجانے کے بعد بھی مرہٹوں کا یہ حال تھا کہ جب اورنگ زیب اپنے بڑھاپے کے دنوں میں گولکنڈا اور بیجاپور کو نیست ونابود کرکے مرہٹوں کے پیچھے دوڑ دھوپ کر رہا تھا تو الفنسٹن صاحب نے اس عالی ہمت بڈھے بادشاہ کی ناکامی کی وجوہات کے ذکر میں مرہٹوں کی عادت جفاکشی کا بیان اس طرح پر لکھا ہے کہ "اُن کی سواری میں چالاک اور دوردم گھوڑے ہوتے تھے جن پر بجائے زین کے کمبل کے تہرے پر صرف ایک گدی سی کس لیتے تھے اور توڑہ دار بندوق اور ڈھال تلوار کے

بقیہ حاشیہ سیواجی :-

علاوہ عموماً ایک لمبا برچھا رکھتے تھے خوراک و لباس میں اسی پر قناعت تھی کہ جوار کی ٹکیہ اور کبھی پیاز اُن کی معمولی غذا تھی اور لباس میں ایک پگڑی چست جانگیہ اور ایک چھوٹی سی کُرتی! سوائے سرداروں کے خیمہ کسی کے پاس نہ ہوتا تھا اور لڑائی بھڑائی کے موقعوں میں مرہٹے سوار اپنے برچھوں اور بھالوں کو زمین میں گاڑ کر گھوڑوں کی رگا میں اپنے اپنے بازو سے باندھکر زمین پر پڑ رہا کرتے تھے" غرض کہ اس شعر کے مصداق تھے ۔شعر

" لنگکے زیر لنگکے بالا نے غم دزد نے غم کالا "

(ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر، نہ چور کا غم نہ اسباب کی فکر) نہ بار برداری کی ضرورت نہ کمسریٹ کی حاجت ۔ اور ان کے مقابلہ میں مغلیہ فوجوں کی یہ صورت تھی کہ اگرچہ بہادری اور سپاہگری کی تو ان میں بھی کچھ کمی نہ تھی مگر عموماً یہ خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ امیر سے لے کر سپاہی تک ساز و سامان بہت رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کے لشکروں میں اہل خدمت اور اہل بازار وغیرہ کی یہ بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی کہ بھیر کے لوگ سپاہیوں سے دس گنے ہوجاتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ رسد اور بار برداری دونوں کی نہایت ہی غیر ضروری احتیاج رہتی تھی اور اس کے باعث سے کوچ و مقام میں وہ چستی و چالاکی جو مرہٹوں جیسے جفاکش اور سُبک بار دشمنوں کے مغلوب کرنے کیلئے خصوصاً ایسے پہاڑی ملک میں ضروری تھی ۔ان سے نہیں ہوسکتی تھی ۔ بلکہ جہاں کہیں ان کا لشکر جاکر ٹھیرتا تھا رسد و بار برداری کی ضرورتوں کی وجہ سے وہاں کے باشندوں پر ایک تباہی آن پڑتی تھی ۔

غرضکہ جب شائستہ خاں کو کامیابی نہ ہوئی تو مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور صوبہ دار گجرات کو بھی معہ اس کی کل فوج کے مدد کے لئے بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ بھی مدت تک مامور رہا مگر کوئی کارنمایاں اس سے بھی ظہور میں نہ آیا۔ بلکہ اورنگ زیب کے جلوس کے چھٹے سال ۱۰۷۳ھ میں جب کہ شائستہ خاں پونا میں اُترا ہوا تھا سیواجی نے یہاں تک جسارت کی کہ ایک روز سر شام اپنے پہاڑی قلعہ سنگم نیر سے جو پونا سے بارہ میل کے فاصلہ پر تھا روانہ ہوا ۔ اور راستہ میں تھوڑے تھوڑے سپاہی اس خیال سے چھوڑتا آیا کہ اگر ضرورت پڑے تو کام آئیں اور خود صرف پچیس ۲۵ ماہولی مرہٹوں کو ساتھ لے کر ایک برات میں جو حسب اتفاق پونا کو جاتی تھی مل کر شہر میں داخل ہوگیا اور اس طرح پر شائستہ خاں کے چوکی پہروں کی مزاحمت سے بچ نکلا ۔ چونکہ شائستہ خاں

بقیہ حاشیہ سیوا جی :-

اُسی مکان میں رہتا تھا جس میں سیوا جی نے پرورش پائی تھی - اور اس وجہ سے اُس کو اُس مکان کی کل حالت بخوبی معلوم تھی اس لئے اس کے ایک دروازہ سے جو پشت مکان کی طرف تھا - چپکے سے شائستہ خاں کی خواب گاہ میں جا گھسا اور یکایک اس طرح سے حملہ کیا کہ اس ہڑبڑاہٹ میں ایک کھڑکی کے راستہ نیچے کے مکان کی طرف کود کر بھاگتے ہوئے شائستہ خاں کی تو ایک انگلی کٹ گئی اور ابوالفتح اُس کا بیٹا مقابلہ میں مارا گیا - چونکہ سیوا جی اپنے ارادہ کے موافق شائستہ خاں کو قتل یا گرفتار نہ کر سکا تو قبل اس کے کہ باہر کے پہرہ والے اس حادثہ سے خبردار ہوں پھرتی سے باہر نکل آیا - اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا تو وہ لوگ جو راستہ میں بٹھائے ہوئے تھے ساتھ ملتے گئے اور صحیح و سلامت اپنے قلعہ میں جا داخل ہوا اور اس کامیابی کی اس قدر خوشی منائی گئی کہ چراغوں اور مشعلوں کی روشنی پادشاہی فوج کو پونا میں بخوبی دکھائی دیتی تھی سیوا جی کے اس کارنامہ سے اُس کے اور اُس کی قوم کے حق میں ایک نہایت ہی مفید اثر پیدا ہوا - بادشاہ نے اس حادثہ کو امیر الامرا کی غفلت پر محمول کیا اور میر جملہ کی وفات کے باعث سے بنگالہ کی صوبہ داری پر بدل دیا اور اس کی بجائے شاہزادہ محمد معظم کو دکن کا صوبہ دار مقرر کر کے راجہ جے سنگھ کچھواہہ کو جو لیاقت اور دانائی میں مشہور اور ایک بڑا رکن سلطنت تھا راجہ جسونت سنگھ کی جگہ جس کی نسبت سیوا جی کے ساتھ سازش رکھنے کا شبہ تھا اپنے جلوس کے ساتویں سال ۱۰۷۴ھ میں معہ دلیر خان و راجہ رائے سنگھ سودیہ اور اور دس بارہ ہندو اور مسلمان بڑے بڑے سرداروں کے چودہ ہزار سواروں کی جمعیت سے روانہ کیا - خلاصہ یہ کہ راجہ جے سنگھ نے اورنگ آباد پہنچ کر اول شاہزادہ سے ملازمت حاصل کی - اور بعد ازاں پونا میں جا کر راجہ جسونت سنگھ سے مہم کا چارج لیا اور قلعہ رودرمال وغیرہ خصوصاً سیوا جی کے کلاں تر قلعہ پورن دھر کو کہ جس میں اُس کا بہت سا ساز و سامان اور چار ہزار لڑاکے سپاہی اور تین ہزار اور مرد و عورت اور بعض عزیز و اقارب اور کتنے ہی کارآزمودہ افسر موجود تھے زور شور سے دلیر خاں اور کیرت سنگھ نے گھیر لیا سیوا جی جو اُس وقت قلعہ راج گڈھ میں معہ اہل و عیال خود موقعہ جنگ سے قریب ہی تھا حملہ آوروں کی شجاعت و لیاقت کے باعث پورن دھر کے بچاؤ سے مایوس ہو گیا اور مجبور ہو کر عجز و نیاز کا اظہار شروع کیا جس کے جواب میں راجہ نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر مجرموں کی طرح ہتھیار کھول کر حاضر ہو جائے تو اس کی اطاعت قبول کی جائے گی غرض کہ جب وہ ۱۰۷۵ھ عالمگیر کے آٹھویں سال جلوس میں

بقیہ حاشیہ سیواجی۔

اس طرح حاضر ہوگیا تو راجہ نے اُس کی بہت خاطر کی اور اول قلعہ پورن دھر کو جو قریب الفتح ہوگیا تھا معہ کل سامان جنگ وغیرہ اُس سے لے کر آخران شرائط پر صلح کرلی کہ ملک کوکن کے پینتیس قلعوں میں سے جو اس وقت اُس کے قبضہ میں تھے تئیس قلعے معہ بندر چیول اور علاقہ جات جمعی دس لاکھ ہن[1] کے سرکار پادشاہی میں آگئے۔ اور باقی ماندہ بارہ قلعے معہ علاقہ جمعی ایک لاکھ ہن سیواجی کے پاس چھوڑے گئے اور اُس کے ہشت سالہ بیٹے سنبھاجی کے نام پنج ہزاری پنج ہزار سوار کا منصب عطا ہوگیا اور سیواجی نے یہ بھی قبول کرلیا کہ اس نواح میں اگر کوئی مہم پیش آئے گی تو بذات خود پادشاہی فوج میں شامل ہوکر خدمت کروں گا۔ غرض کہ جب شرطیں طے ہوچکیں اور سنبھاجی بھی راجہ کے لشکر میں پہنچ گیا تو سیواجی کو جو بغیر ہتھیار باندھے دربار میں آیا کرتا تھا راجہ جے سنگھ نے اپنے سامنے ہتھیار بندھوا دیئے۔ اور خلعت دے کر عزت کے ساتھ رخصت کردیا۔ اور چونکہ راجہ کو اسی جگہ سے بیجاپور پر فوج کشی کرنے کا حکم آگیا تھا۔ اس لئے سیواجی بذات خود معہ پندرہ سو سواروں اور سات ہزار پیادوں کے اس مہم میں کام دیتا رہا اور اگرچہ اس سے کچھ عرصہ بعد اُس نے اول سنبھاجی کو عالمگیر کے دربار میں بھیج دیا اور راجہ

لفظ ہن پر حاشیہ در حاشیہ۔ [1] ہندوستان کے ساحل مغربی وجنوبی پر ملک کا وہ تنگ اور طولانی قطعہ جس کو کنہڑ کہا جاتا ہے اور شمال کی طرف علاقہ کوکن سے شروع ہوکر جنوب کی سمت میسور کے قریب ختم ہوتا ہے وہاں کی زبان میں جسے کنہڑی کہتے ہیں ہن یا ہونو سونے کو کہتے ہیں اور اس جگہ اس سے سونے کا سکہ مراد ہے۔ اور تعجب نہیں ہے کہ فارسی اور بھاشا میں جو سین اور ہائے ہوز کہیں کہیں (مثل آماسیدن و آماہیدن سوماہ وماس۔ وده۔ ودس باہور دسور۔ ولپوس ولپوہ و بیاس دبیاہ وغیرہ) باہم بدل جایا کرتے ہیں اسی طرح اس لفظ میں سونے کا سین ہونو کی ہے سے بدل گیا ہو۔ اگرچہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے ممالک دکن میں سکہ رائج الوقت سونے ہی کا ہوتا تھا۔ لیکن ٹھیک طور پر یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ بدھ مت والوں کے زمانہ میں یا اُس سے پہلے اُن سکوں کا عام نام کیا تھا۔ مگر البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں اُس خاندان کے راجاؤں نے جن کو ڈاکٹر ہیڈی صاحب چلوکیہ لکھتے ہیں جب اودھ سے جاکر دکن میں اپنی پادشاہی قائم کی تو منجملہ اُن علامتوں کے جو بطور اپنے نشان کے وہ سکوں وغیرہ پر لگاتے تھے وبراہ کی تصویر (جو سنسکرت میں سور

بقیہ حاشیہ سیواجی :۔

جسونت سنگھ کی معرفت جان و عزت کی حفاظت اور حسن سلوک کا وعدہ لے کر اور اپنی جگہ فوج کی سرداری پر اپنے داماد کو راجہ کے پاس چھوڑ کر دربار جشن سالانہ کے موقعہ پر بادشاہ کو سلام کرنے کے لئے بطور جریدہ اکبر آباد کو چلا آیا۔ اور بادشاہ کی طرف سے بھی یہ مدارات ہوئی کہ کنور رام سنگھ پسر راجہ جے سنگھ اور مخلص خاں نامی ایک اور امیر اُس کو استقبال کرکے دربار جشن میں لاتے اور بادشاہ کے حضور میں اُس کے کھڑے ہونے کو بقول صاحب عالمگیر نامہ جگہ بھی ایسی معقول دی گئی کہ جو امرائے خاص کے لئے تھی اور اُسی دن کچھ اور اعزاز و اکرام بھی ہونے والے تھے اور یہ امر مقرر ہو چکا تھا کہ چند روز حاضرِ دربار رکھکر عزت و توقیر کے ساتھ رخصت کر دیا جائے گا۔ مگر اس اکھڑ مزاج شخص کو اپنے کھڑے ہونے کی جگہ جو بعض مورخوں کے نزدیک تیسرے درجہ کے امیروں یعنی پنج ہزاری کے منصب والوں کے لئے مقرر تھی۔ اور دوسرے رسوم درباری کچھ ایسی ناگوار اور اپنی عزت کے منافی معلوم ہوئیں کہ اُس نے کنور رام سنگھ کو علیحدہ لے جاکر اُسی وقت سخت شکایت کی اور بقول صاحب عالمگیر نامہ جو "توقعات بے جا و مقاصد دور از کار و خیال ہائے خام" پکائے ہوئے تھے۔ نہایت رنجیدگی سے اُن کا اظہار کیا۔ اگرچہ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اُس کو مارے رنج و غیرت کے دربار میں غشی ہو گئی تھی۔ مگر یہ قول کچھ معتبر نہیں معلوم

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہن۔ کو کہتے ہیں خواہ ویراہ اوتار کی مناسبت سے یا کسی اور وجہ سے اُن کے سکہ پر منقش ہوا کرتی تھی۔ چونکہ اس خاندان کی شاہانہ حکومت مدراس۔ حیدر آباد دکن۔ اور بمبئی کے ایک بہت بڑے حصہ پر تقریباً آٹھ نو سو برس تک بڑی شان و شوکت سے قائم رہی تو اس وجہ سے اُس ملک میں ان کا سکہ عموماً ویراہا مشہور تھا۔ اور اگرچہ ان کی حکومت تقریباً ۱۲۵۰ء میں جاتی رہی تھی مگر اس ملک کے سونے کے سکہ پر لفظ ویراہا کا اطلاق بعد میں بھی جاری رہا چنانچہ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی نے جو نویں صدی ہجری مطابق ۱۴۴۱ء میں سلطان شاہ رخ والی خراسان کی طرف سے راجہ دیورائے کے پاس (جس کو چلوکیہ خاندان سے کچھ تعلق نہ تھا) اس کی دارالحکومت وجی نگر میں سفارت پر آیا تھا اپنی کتاب مطلع السعدین و مجمع البحرین میں وجے نگر کے عظیم الشان راجہ کے سکہ کا نام ویراہا ہی لکھا ہے اور وزن اس کا ایک مثقال (یعنی ساڑھے چار ماشہ) بتایا ہے۔ اغلب ہے کہ جب مسلمانوں کی حکومت دکن و مدراس میں قائم ہوئی تو ویراہ (سور) کے لفظ کو مکروہ سمجھکر اس سکہ کو اُس کی جنس کے نام سے بجائے ویراہا کے ہن کہنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ فی

بقیہ حاشیہ سیواجی:۔

ہوتا۔کیونکہ صاحب عالمگیر نامہ کو اس کے چھپانے کی بحسب ظاہر کچھ ضرورت نہ تھی۔المختصر بادشاہ نے اس حرکت سے ناراض ہو کر بغیر اُن مراسم اعزاز و عنایات کے جو اُس کے لئے تجویز ہوتے تھے حکم دیا کہ ڈیرہ کو چلا جائے اور کنور رام سنگھ کو جو اُس کے معاملات میں متوسط تھا یہ ارشاد ہوا کہ اُس کو اپنے ڈیرے کے پاس (جو شہر سے باہر تھا) اُتار کر نگرانی کرتا رہے۔اور اُس کے بیٹے سنبھاجی کو جو منصب پنج ہزاری پر بدستور مامور تھا کبھی کبھی اپنے ساتھ دربار میں لاتا رہے اور اُس کے بھاگ جانے کے اندیشہ سے فولاد خاں کوتوال کو حکم ہوا کہ اُس کے ڈیرہ کے اردگرد پہرے لگا دے۔اور راجہ جے سنگھ کو جس کی وساطت سے وہ حاضر ہوا تھا لکھا گیا کہ اُس کے معاملہ میں جو مناسب جانے رپورٹ کرے۔اس عرصہ میں اگرچہ سنبھاجی دربار میں حاضر ہوتا رہتا تھا مگر سیواجی کو ایسا ہراس غالب ہوا کہ وہ سب ہوا اُس کے دماغ سے نکل گئی اور امرا کے پاس جا جا کر گڑگڑانے لگا۔اسی اثنا میں راجہ جے سنگھ کا جواب بھی آگیا کہ چونکہ میں اس کے ساتھ عہد کر چکا ہوں اور ہنوز بیجاپور کی مہم میں مشغول ہوں اگر درگذر کی جائے تو اس میں میری بھی سرخ روئی ہے۔اور کاروبار مہم کے لئے بھی یہ امر مناسب اور قرین مصلحت ہے۔اس پر بادشاہ نے اُس کی خطا معاف کر دی۔اور پہرے اٹھوا دیئے اور سنبھاجی پر بھی کچھ اور زیادہ اظہار عنایات ہونے لگا۔اور ارادہ تھا کہ چند روز بعد خود اُس کو بھی حاضر دربار ہونے کی

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہن۔ زمانہ بخارا کے سونے کے سکہ کو عموماً طلا کہتے ہیں۔غرضکہ دکن میں زمانہ دراز سے ہندوؤں کے مختلف العلامت سونے کے سکوں کا نام ہن ہے۔مگر اقوام یورپ اور اہل اسلام کے سکوں کی طرح ان پر صاحب سکہ کا نام اور سال و مقام ضرب نہیں ہوتا اس لئے ان سے علم تاریخ کے لئے چنداں فائدہ نہیں پہنچتا۔اور اگرچہ ان سکوں کا مقدار وزن کسی قدر مختلف رہا ہے اور ایک بڑے مقدار کا سکہ رام ٹکہ کے نام سے بھی مضروب ہو چکا ہے۔مگر اکثر یہ وزن اس سکہ کا قریب ایک ثلث مروجہ اشرفی کے رہا۔چنانچہ ایک ہُن جو ہمارے کرم فرما مولوی چراغ علی خاں صاحب بہادر عہدہ دار گورنمنٹ نظام نے معہ بعض کوائف تاریخی متعلقہ سکہ ہُن کے حیدر آباد دکن سے بھیجا ہے۔اس کا وزن ساڑھے تین ماشہ ہے اس کی رو کی طرف تین ہندوانی مورتیں ہیں جن میں سے ایک بیچ کی بڑی اور دو آس پاس کی چھوٹی چھوٹی ہیں اور پشت کی جانب صرف باریک باریک دانے یا نقطے سے ہیں اور اس کا قطر انگریزی دوانی سے کچھ کم ہے اور اسی طرف سے یہ کسی

بقیہ حاشیہ سیواجی۔

اجازت دے کر باعزاز واکرام رخصت کردیا جائے گا۔ مگر سیواجی کو اپنی سابقہ اور حالیہ حرکتوں کے باعث اور بادشاہ کے "قہر وغضب" کے اندیشہ سے ایسی بے قراری تھی کہ جب اُس نے دیکھا کہ پہرے اُٹھ گئے اور کنور رام سنگھ نے بھی خواہ غفلت سے خواہ سازش سے نگرانی میں کوتاہی کی تو ستائیسویں صفر ۱۰۷۶ھ مطابق سال نہم جلوس عالمگیری کو بھیس بدل کر آگرہ سے ایسا بھاگا کہ پھر کبھی قابو میں نہ آیا۔ اور جب آٹھ نو مہینے کے بعد خدا جانے کن کن حکمتوں اور تدبیروں سے اپنی اور اپنے بیٹے کی تلاش اور تعاقب کرنے والوں سے جان بچا کر ماہ دسمبر ۱۶۶۶ء میں راج گڈھ واپس جا پہنچا۔ تو اُس کے معاملات بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اُس نے تیرھویں سال جلوس مطابق ۱۰۸۱ھ میں نہ صرف بندر سورت کو ہی لوٹا اور جلایا بلکہ اکثر قلعے وغیرہ بھی جو اُس سے چھین لئے گئے تھے اُن پر بھی پھر قابض ہو گیا۔ اور چونکہ وہ کسی طرح بادشاہی فوجوں کے قابو میں نہ آتا تھا اورنگ زیب نے دق ہو کر اس مناسبت سے کہ اُس ملک کے پہاڑوں اور جنگلوں میں چوہے بہت کثرت سے ہوتے ہیں اُس کا نام "موش کوہی" رکھ دیا تھا۔

اُس نے عالمگیر کے جلوس کے تیئسویں سال میں چوبیسویں ربیع الثانی ۱۰۹۱ھ کو (حسب قول مصنف مآثر عالمگیری)، و بقول الفنسٹن صاحب پنجم اپریل ۱۶۸۰ء کو ترپین برس کی عمر میں راج گڈھ میں جو اُس کا دارالریاست تھا انتقال کیا۔ اس کی موت کا باعث مآثر عالمگیری میں یہ لکھا ہے کہ "کہیں سواری سے آکر شدت گرمی سے دو دفعہ خون کی قے کی اور مر گیا" اور انسائیکلو پیڈیا میں اُس کا مرنا ذات الصدر کی بیماری میں اور مرہٹوں کی تاریخ میں مرنے سے پہلے وجع المفاصل

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہن۔ قدر محدب یعنی کچھ اُبھرا ہوا ہے اور ایک اور ہن جو ہمارے کرمفرما کرنل سی ایچ۔ ٹی۔ مارشل صاحب بہادر نے حیدر آباد ہی سے بھیجا ہے اُس سے چھوٹا ہے۔ اور اس کے نقوش بھی اُس سے مختلف ہیں۔ یعنی رو کی طرف گرُوڈ پرندہ (نیل کنٹھ) بنا ہوا ہے اور اُس کی دونوں چونچوں اور دونوں پنجوں میں ہاتھی لٹکتے ہیں۔ اور پشت کی جانب سنسکرت کے کچھ حروف ہیں اور بحسب ظاہر اُس کی شکل اُس نقشہ کے مطابق پائی جاتی ہے جو ڈاکٹر ہمڈی نے راجہ دیو رائے وجے نگر والے کے ایک سکہ کا اپنے مضمون کے خاتمہ میں چھاپا ہے۔ جب پرتگیزوں، ڈچوں، انگریزوں نے ہندوستان کے جنوبی و مغربی ساحل پر ابتداءً دخل پایا۔ تو

بقیہ حاشیہ سیواجی۔
یا نقرس کے باعث سے گھٹنوں کے درد اور تپ میں اُس کا مبتلا ہونا لکھا ہے۔
انتقال کے وقت اُس کی حکومت چار سو میل طول اور ایک سو بیس [۱۲۰] میل عرض کے قطعہ زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور راج تلک کی رسم باقاعدہ اور آزادانہ طور پر بڑی شان و شوکت سے ادا کر کے خود سر راجہ بن چکا تھا۔ جس کو چھٹی جون ۱۶۷۴ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی انگریزی کے کارخانہ بمبئی کے ایک ایجنٹ نے جو مبارکباد دینے کے لئے ایلچی بن کر گیا تھا بچشم خود دیکھا تھا اور اُس نے ایک ایسی مستقل اور دیرپا حکومت قائم کرلی تھی اور اپنی قابلیت اور تدبیروں سے پولٹیکل اغراض کو مذہبی تعصبات کا رنگ چڑھا کر اور سادہ لوح لوگوں کو ایسے اشارے اور کرشمے دکھا کر جس سے معلوم ہو کہ اُس کے حال پر دیوی دیوتاؤں کی طرف سے بھی دیا کی نگہ ہے۔ جیسا کہ دنیا کے اکثر حصوں میں ہوتا رہا ہے اپنے ملک کے بھوکے اور جاہل باشندوں میں ——— سپاہیانہ اُمنگ اور مذہبی جوش پیدا کر دیا اور اپنے ملک کے گم نام باشندوں کا پیش رو بن کر اُن کو بہادر اور جنگ جو قوم مرہٹہ کے نام سے ہندوستان کی تاریخ میں نامور اور مشہور کر دیا۔ اور ایک ایسی بنیاد ڈال گیا جو اُس کے پیچھے آنے والوں کے لئے مغلیہ سلطنت کے ضعف کے زمانہ میں ملک و حکومت حاصل کرنے میں بہت ہی کارآمد ہوئی۔

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہُن۔ بعض راجاؤں کے ہُنوں پر مندر کی صورت مضروب دیکھکر انھوں نے بجائے پہلے ناموں وریا ہا یا ہُن کے عموماً اس کا نام پیگوڈا رکھدیا۔ جس کو بعض انگریزی ڈکشنریوں میں لفظ بت کدہ کی خرابی بتایا ہے۔ لیکن بارٹال میو نامی ایک یورپین محقق سیاح نے جو مدراس میں ۱۷۷۶ء سے لے کر ۱۷۸۹ء تک رہا تھا اُس کی اصل یہ بتائی ہے کہ بعض پر بھگوتی یا بھگودی (دیوی) کی تصویر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اُس کو بھگونیہ یا بھگو دتیہ کہتے تھے تو ان نو واردفرنگیوں نے اس کو پیگوڈا بنا لیا۔ بہرحال حیدر نایک اور اُس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے زمانہ میں بھی ہُن مضروب ہوتے تھے جو بہادری اور سلطانی ہُن کہلاتے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی دکن کی ٹکسالوں میں بھی برابر ۱۸۱۸ء تک پیگوڈا مضروب ہوتے رہے ——— انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔ سرکاری حساب کتاب اور لین دین میں بھی بجائے روپیہ کے پیگوڈا ہی کا چلن تھا مگر ۱۸۱۹ء سے حکام انگریز نے آخر کار بجائے اُس طلائی سکہ کے روپیہ کو تمام ہندوستان کے لئے سکہ رائج الوقت قرار دیدیا اور وریا ہا۔ ہن۔ پیگوڈا۔ سب متروک ہوکر اُن کے نام کتابوں میں لکھنے کو رہ گئے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔

عالمگیر نامہ وغیرہ فارسی تاریخوں میں جو اُس کے مخالفوں کی لکھی ہوئی ہیں جہاں اُس کی مکاری اور غارت گری اور فن و فریب وغیرہ کی ہجو لکھی ہے اُسی کے ساتھ اُس کی چستی و چالاکی اور بے حد دلاوری و جرأت کا بھی اقرار کیا ہے۔ اور الفنسٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بہ لحاظ اُس وقت کے اُس کا ملکی اور فوجی انتظام دونوں عمدہ تھے۔ کہ "اُس کی حکومت کا کل زمانہ مسلسل لڑائیوں اور پولٹیکل سازشوں کا ایک ایسا منظر ہے کہ جس میں وہ ایک نہایت ہوشیار جنرل اور ایک قابل مگر مکار مدبر کی سی لیاقتیں ظاہر کرتا رہا۔ اور ہر ایک خوفناک ضرورت کے وقت خواہ وہ کیسے ہی انتہا درجہ کی اور یکایک پیش آئی ہو اُس کی شجاعت وجرأت میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا۔ بلکہ فی الفور اُس کا ایسا تدارک کرتا جو عین موقع اور وقت کے موافق ہوتا۔ اور کسی جان جوکھوں میں پڑتے وقت موت و زندگی کی اُس کو مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بہادر اور سیواجی مہاراج اپنے اپنے طور پر دونوں ہی عجیب و غریب شخص تھے اور اگرچہ مختلف قالبوں میں ڈھلے ہوئے تھے مگر مادہ ایک ہی تھا۔ س م ح

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہُن۔

ماخوذ از:

خط مولوی چراغ علی خاں صاحب بہادر عہدہ دار گورنمنٹ نظام

چٹھی مسٹر چارلس راجرس صاحب سابق پرنسپل مشنری نارمل سکول امرتسر حال از جیولاجی کل سرویر۔

رسالہ ڈاکٹر بیڈی صاحب سرجن میجر و سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ مدارس مندرجہ جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال مطبوعہ ۱۸۸۳ء جلد ۳۲ حصہ اول نمبر اول۔

س م ح

شاہ جہاں کی وفات میں ابھی گولکنڈا ہی میں تھا کہ شاہجہاں کے انتقال کی خبر سنی گئی اور یہ بھی سننے میں آیا کہ اورنگ زیب نے باپ کے مرنے کا بڑا غم کیا اور سوگ کی وہ تمام رسوم کیں جو بیٹے کو باپ کے ماتم میں کرنی چاہئیں۔ وہ فوراً آگرہ کو روانہ ہو گیا۔ اور وہاں پہنچنے پر بیگم صاحب نے بڑی دھوم سے اُس کا استقبال کیا اور کمخواب کے تھان لٹکا کر بادشاہی مسجد سجائی گئی۔ اور اسی طرح وہ مکان بھی سجایا گیا جہاں قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ اور جب محل میں پہنچا تو شاہزادی نے ایک بڑا سا سونے کا تھال جواہرات سے بھرا ہوا نذر کیا جن میں سے کچھ تو شاہجہاں کے متروکہ تھے اور کچھ اُس نے اپنے پاس سے پیش کش کئے تھے۔ بہن کی طرف سے گرم جوشی اور محبت کا برتاؤ دیکھکر اورنگ کا بھی دل پسیج گیا۔ اور اُس نے اُس کی گذشتہ باتوں سے درگذر کی۔ اور اُس وقت سے اُس کے ساتھ مہربانی اور فیاضی سے پیش آتا ہے[1]

---

[1] شاہجہاں کی وفات کا احوال جو کچھ عالمگیر نامہ میں لکھا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے کہ اس قیدی بادشاہ کو بارھویں رجب ۱۰۷۵ھ کو حبس بول کا وہی پرانا عارضہ جس کو مرض الموت کہنا چاہئے پھر لاحق ہوا۔ حکیم مومنا می شیرازی نے جو اُس وقت کے شاہی طبیبوں میں ایک مشہور شخص تھا۔ ہرچند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ اسہال وغیرہ کئی طرح کے اور عوارض پیدا ہو کر زندگی سے یاس ہو گئی۔ جب یہ خبر عالمگیر کو پہنچی تو باپ کی آخری زیارت کو دلی سے آگرہ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر چونکہ پادشاہی کوچ و مقام کے لئے دستور سلطنت کے موافق نہایت بھاری سامانوں کی ضرورت تھی اس لئے باوجود تاکید اختصار سامان کے بھی چندروز کا توقف ہونا ضروری تھا اس وجہ سے اپنے بڑے بیٹے محمد معظم کو اپنی روانگی سے پہلے احتیاطاً جلدی سے روانہ کر دیا ابھی شاہزادہ آگرہ سے سات کوس اس طرف ہی تھا کہ شاہجہاں پر حالتِ نزع طاری ہو گئی۔ اور چھبیسویں رجب شب یک شنبہ کو آدھی رات سے پہلے انتقال ہو گیا۔ بیچاری مصیبت زدہ بیگم صاحب نے جو باپ کے ایام قید میں ایک وہی اُس کی غمخوار اور رنج و راحت کی شریک تھی رعدانداز خاں قلعدار اور بہلول خواجہ سرا کو، جو قیدی بادشاہ اور قلعہ کے محافظ تھے مکان معروف غسل خانہ میں طلب کر کے اور اُن کی معرفت اُسی وقت قلعہ کے دروازوں کی کھڑکیاں کھلوا کر غسل و کفن کی تیاری کے لئے سید محمد قنوجی کو جو بڑے عالم اور درویش مسلک تھے۔ اور اس قید کے زمانہ

اورنگ زیب میری نظر میں

اب میں اپنی تاریخ کو ختم کرتا ہوں۔ جن جن ذریعوں سے اورنگ زیب نے یہ عروج اور اقتدار حاصل کیا یقیناً ناظرین اُن کو بہت ناپسند کریں گے۔ کیونکہ وہ حقیقتاً بے رحمانہ اور نامنصفانہ تھے۔ لیکن شاید یہ ناانصافی ہوگی کہ ہم اُن کو اُسی سخت نظر سے جانچیں جس سے اپنے ملک یورپ کے شاہزادوں کے افعال کو جانچتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں جانشینی کے لیے معقول قواعد مقرر ہیں اور بڑے بیٹے کے سوا کوئی جانشین نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندوستان میں باپ کے بعد شاہزادوں میں سلطنت کے لیے ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے۔ اور ان دو بے رحمانہ باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یا سلطنت کی خاطر خود قربان ہو جائیں یا بھائیوں کو قربانی بنائیں۔ تاہم اُن لوگوں کو بھی جو ملک کے دستور اور رسم خاندان اور تعلیم و تربیت کے اثر کے عذر کو قبول نہیں کرتے یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ اورنگ زیب کو خدا نے غیر معمولی عقل و فکر اور ذہانت و تدبیر عطا کی ہے اور یہ کہ وہ بڑا ہی مدبر اور عالی شان بادشاہ ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ میں اکثر شاہجہاں کی صحبت میں رہا کرتے تھے مع ملا قربان قاضی دارالخلافہ آگرہ قلعہ میں بلوا لیا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت جب وہ دونوں حاضر ہوئے تو قضائے روزہ و نماز کے عوض (اگرچہ بقول صاحب عالمگیر نامہ اُس کی نماز و روزہ کبھی قضا نہ ہوئے تھے) برسم "اسقاط" ادا بہت سا روپیہ خیرات کیا گیا۔ اور بعد ازاں برج مثمن سے کہ جہاں انتقال کیا تھا لاش کو اٹھا کر ایک قریب کے مکان میں غسل و کفن دے کر صندل کے تابوت میں رکھا گیا۔ اور برج مثمن کے نیچے کا دروازہ جو مسدود کیا ہوا تھا کھلوا کر اُس کے راستہ سے اور فصیل بیرونی کے اس دروازہ سے جو اُس کے محاذی تھا جنازہ کو باہر لائے اور ہوشدار خاں صوبہ دار نے بادشاہی ملازموں کے ساتھ "آئین شائستہ" (یعنی مراسم اعزاز و احتشام شاہانہ کے ساتھ) علی الصباح جمنا کے کنارے جا پہنچایا۔ اور دریا سے پار ہو کر سید محمد قنوجی۔ قاضی قربان وغیرہ علماء و صلحا نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور اُسی کی زوجہ ممتاز الزمانی ارجمند بانو بیگم معروف بہ تاج محل کے مقبرہ میں کہ جس کا حال اس کتاب کے بعض اور مقامات میں مفصل درج ہے دفن کر دیا۔ لکھا ہے کہ اورنگ زیب کو جب باپ کے انتقال کی خبر پہنچی تو بہت رویا اور سوگواری کی اور رسموں کے علاوہ اُس نے اور تمام اہل دربار نے جیسا کہ اب بھی ہندوستانی ریاستوں میں دستور ہے سفید لباس پہنا۔ اور کشتی کے ذریعہ آگرہ پہنچ کر زیارت قبر کے وقت بھی بہت گریہ و بکا کیا۔ اور مجالس مولود و ختم و فاتحہ جیسا کہ بادشاہوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- کی وفات کے موقعہ پر دستور تھا منعقد کر کے دھوم دھام سے خیرو خیرات کی - اور اپنی غمزدہ بڑی بہن بیگم صاحب کے پاس بھی کئی بار قلعہ میں گیا - اور نہایت تسلی و تشفی کی بلکہ اس قدر بڑھکر خاطر و مدارات کی کہ تمام اہل دربار کو حکم دیا کہ اُن کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر نذریں پیش کریں - چنانچہ جب ایسا ہی ہوا تو بیگم صاحب نے بھی جو دریا دلی اور فیاضی میں مشہور اور بڑی ہی سیر چشم شاہزادی تھی تمام اہل دربار کو عموماً ہزاری کے منصب تک بھاری بھاری خلعت مرحمت کئے اور اس کے بعد جب اورنگ زیب پھر ملنے کو گیا تو رسم پا انداز و رسم نثار بجا لا کر ایک نہایت قیمتی پیش کش جس کا برنیر نے اشارہ کیا ہے نذر کیا - اگرچہ صاحب عالمگیر نامہ اس امر کو نہیں لکھ سکتا تھا کہ شاہجہاں کا جنازہ شاہانہ احتشام سے نہیں اُٹھایا گیا - اور ایسے سادہ طور سے دفن کیا گیا جو اس کے مرتبہ کے شایاں نہ تھا اور یہ عمل خواہ عالمگیر کے حکم سے ہوا ہو خواہ قلعہ دار و صوبہ دار کی کم فہمی سے مگر صاحب عمل صالح نے اس امر کو بہت ہی رنج و افسوس کے ساتھ عبرت ناک الفاظ میں جتایا ہے - چونکہ شاہزادہ محمد معظم (دیکھو جب بیان مندرجہ عالمگیر نامہ) شاہجہاں کے انتقال کے وقت آگرہ سے صرف سات کوس کے فاصلہ پر موجود تھا اور ابھی پہنچا بھی نہ تھا کہ جنازہ بہت سویرے ہی دفنا دیا گیا - تو اس سے مصنف عمل صالح کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے - بہرحال اورنگ زیب کے جلوس کے آٹھویں سال ۱۰۷۶ھ کے ماہ رجب میں بیچارے شاہجہاں نے جو ہندوستان کے نہایت نیک نام بادشاہوں میں سے تھا - چھہتر برس تین مہینے ستائیس دن کی عمر میں بحساب قمری اور تین دن کم چوہتر برس کی عمر میں بحساب شمسی قلعہ آگرہ میں آٹھ برس کے قریب قید رہ کر قید ہستی سے رہائی پائی - جس میں سے اکتیس برس دو مہینے تیئیس دن بحساب قمری اور تیس برس چار مہینے اٹھارہ دن بحساب شمسی تخت نشین رہا -

صاحب عالمگیر نامہ نے اس کے سالِ انتقال کی نسبت اپنی تصنیف کی ہوئی ایک تاریخ لکھی ہے جس کو ہم بھی پُر مضمون سمجھکر اس جگہ نقل کرتے ہیں -

چوں شاہجہاں خدیو قدسی ملکات — برخاست بعزم عقبیٰ از تخت حیات
جستم از عقل سال تاریخش را — گفتا خردم "شاہجہاں کردہ فلت"
۱۰۷۵ھ

ضمیمہ

مسیو کول برٹ وزیر فرانس کے نام برنیئر کا خط

خداوند من ممالک ایشیا میں امرا اور حکام کی خدمت میں کوئی شخص خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ چنانچہ شہنشاہ مغل[۲] کے دامن قبا کو بوسہ دینے کا اعزاز جب مجھکو حاصل ہوا تو میں نے بھی نذر کے طور پر جو تعظیم کی ایک علامت ہے آٹھ روپیہ پیش کئے تھے۔ اور ایک نائف کیس[۳] ایک کانٹا اور کہربا کے دستہ کا ایک قلم تراش خان کی نذر کیا تھا۔ کیونکہ یہ نامور شخص

[۱] یہ عالی منزلت شخص جس کا پورا نام جی ان بیپ ٹسٹ کولبرٹ ہے اور مارکوئس آف سگنی سے کے خطاب سے مخاطب تھا فرانس کے وزرا میں ایک ایسا نامور مدبر سلطنت گذرا ہے کہ ایسے لائق وفائق وزیر کم ہوتے ہیں ۱۶۱۹ء میں بمقام پیرس پیدا ہوا تھا اور کہتے ہیں کہ اس کے بزرگ دراصل اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے اور کسی اتفاق سے فرانس میں جا بسے تھے اس کا

[۲] شاہان مغلیہ جو جلال و عظمت اور ترفع کے اظہار کے لئے دیوان عام کے شہ نشین میں زمین سے کئی ہاتھ بلند ہو کر تخت پر بیٹھتے تھے دامن قبا وغیرہ کو بوسہ دینے کی رسم ان کے دربار میں نہ تھی چنانچہ بعض سفیروں کے حاضر دربار ہونے کے چشم دیدہ حالات جو خود مصنف نے اسی کتاب میں لکھے ہیں ان سے بھی یہی ظاہر ہے کہ ایسا دستور نہ تھا اور درحالیکہ برابر کے بادشاہوں کے سفیروں کو بھی اس قدر قرب نصیب نہ ہو تو غریب برنیئر کو یہ رتبہ کہاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس وقت دربار فرانس میں کوئی ایسی تعظیمی رسم ہوگی جس کے لحاظ سے مصنف نے شرف یابی کے اس تمام مطلب کو مجازاً ان الفاظ خاص میں استعمال کیا ہوگا یا ایک ایسے مسلمان بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی رسم کو جس کے درباری آداب و رسوم سے مصنف کے ہم وطنوں کو واقفیت نہ تھی اس وجہ سے ان لفظوں میں بیان کیا ہوگا کہ خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں ان کی آستین

[۳] نائف کیس غالباً پیش قبض کا میان ہوگا۔ س۔ م۔ ح

وزرائے سلطنت میں سے تھا۔ بڑے بڑے کام اس کے متعلق تھے اور طبیبوں کی ذیل میں میری تنخواہ کا تجویز کرنا اسی کی رائے پر منحصر تھا۔ اگرچہ میری یہ مجال نہیں ہے کہ فرانس میں کسی نئی رسم کو جاری کروں۔ لیکن جب کہ میں ہندوستان سے مدت کے بعد ابھی واپس آیا ہوں تو یہ امر خلاف توقع ہے کہ میں اُس دستور کو جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں ایسی جلدی ہی سے بھول جاؤں۔ پس اگر میں اپنے بادشاہ کے حضور میں جس کا ادب میرے دل میں بہ نسبت اورنگ زیب کی تعظیم کے اور ہی قسم کا ہے یا اُس کے وزیر کی خدمت میں جو فاضل خاں کی نسبت بہت زیادہ ادب کا مستحق ہے بغیر ایک حقیر پیش کش کے جو پیش کرنے والے کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی ندرت کے اعتبار سے قابل قدر و قیمت ہے حاضر کرنے میں تامل کروں تو مجھے امید ہے کہ معاف کیا جاؤں گا۔

ہندوستان کا گذشتہ انقلاب جو عجیب و غریب حادثوں پر مشتمل ہے ہمارے عظیم الشان[1] بادشاہ کی توجہ کے لایق ہے۔ اور یہ عریضہ جس میں ایسی بڑی بڑی باتیں مندرج ہیں اُس کا ملاحظہ فرمانا اُس رتبہ کے شایان ہے جو آپ کو دربار شاہی میں حاصل ہے اور بے شک اُس کا ایسے ہی شخص کی خدمت میں پیش کیا جانا زیبا تھا جس کی خوش تدبیری سے سلطنت

---

[1] بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور اس صفحہ کے اُن الفاظ سے جن پر خط ہے۔ اور بادشاہ اور وزیر دونوں کو علیحدہ علیحدہ نذریں دینے کی مندرجہ صدر تمہید سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کا یہ پہلا حصہ جس میں شاہ جہاں کے بیٹوں کی لڑائیاں اور انقلاب سلطنت کے واقعات لکھے ہیں اپنے بادشاہ کو نذر کیا اور یہ خط اُس کے وزیر کو۔ س۔م۔ح

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ نمبرا۔ دادا شراب کا سوداگر تھا۔ مگر اس کا باپ کچھ عرصہ کے بعد یہ شغل چھوڑ کر ملازم پیشہ ہو گیا تھا۔ کولبرٹ نے تحصیل علوم و فنون کے بعد اپنے برادر نسبتی کے ذریعہ جو اس وقت فرانس کا منسٹر آف سٹیٹ (یعنی وزیر السلطنت) تھا۔ امور سلطنت میں دخل پایا۔ اور رفتہ رفتہ حسن لیاقت اور کارگذاری اور ایمان داری کے باعث لوئیس چہاردہم کا جو اُس وقت کے یورپین بادشاہوں میں نہایت ہی نیک نام بادشاہ تھا وزیر ہو گیا۔ اس خوش تدبیر شخص نے اپنے عہد وزارت میں انواع و اقسام کی ایسی عمدہ اصلاحات کیں اور ایسے مفید قاعدے اور قانون جاری کئے کہ جن سے حقیقتاً اُس کی قوم اور سلطنت کو بڑی ناموری اور ترقی حاصل ہوئی۔ (انسائیکلو پیڈیا برطانیہ کا) س۔م۔ح

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ نمبر۲۔ وغیرہ کو بوسہ دینے کی رسم تھی جن کے تاریخی حالات سے اہل یورپ اکثر واقف تھے بنام

کے بہت سے صیغوں کا جو میرے جانے کے وقت ناقابلِ علاج حالت میں پڑے ہوئے تھے نہایت عمدہ طور پر انتظام ہو گیا ہے۔ اور جس نے اپنی کوشش اور محنت سے ہمارے بادشاہ کی شان و عظمت کو تمام عالم میں پھیلا دیا اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ فرنچ قوم اُن باتوں کو کس قابلیت سے عمل میں لاتی ہے جو اُس کے فوائد اور نام آوری کی خاطر تجویز کی جائیں۔

خداوند من۔ میں ہندوستان سے بارہ برس کے بعد واپس آیا ہوں۔ اور میں وہیں تھا کہ فرانس کی خوش حالی اور اُس نیک نامی کی شہرت بخوبی سُن لی تھی جو آپ نے اپنی غیر منقطع توجہ اور نمایاں قابلیتوں سے اس کو ترقی دینے میں حاصل کی ہے۔ اگرچہ فرانس کی خوش حالی اور آپ کی نیک نامی کا دلچسپ مضمون میں بڑے شوق و رغبت سے لکھتا۔ لیکن تمام عالم جن باتوں کا پہلے ہی معترف اور مداح ہو وہ میرے بیان کی محتاج نہیں تھیں اس لیے بہتر ہے کہ اپنے وعدہ کے موافق صرف وہی غیر معلوم اور نئی باتیں لکھکر نذر کر دوں جن سے ہندوستان کی واقعی حالت کا نقشہ کسی قدر آپ کے خیالِ عالی میں آ سکے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی زیادہ تر اسی کو پسند فرمائیں گے۔

ہندوستان کی وسعت

ممالک ایشیا کے نقشوں سے ظاہر ہے کہ سلطنت مغلیہ جو سلطنت ہند کے نام سے مشہور ہے کتنا وسیع ملک ہے۔ اگرچہ ہم نے قواعدِ مساحت کے موافق صحیح طور پر پیمایش نہیں کی لیکن ایک معمولی منزل کی مسافت کا اندازہ کر کے اور یہ دیکھکر کہ گولکنڈے کی سرحد سے غزنین بلکہ اُس سے بھی پرے قندھار کے قریب تک جو سلطنت ایران کا پہلا شہر ہے تین مہینے کا سفر ہے یہ حساب لگایا گیا ہے کہ ان دونوں مقاموں میں ڈیڑھ ہزار میل سے کم فاصلہ نہیں ہے۔ یعنی جس قدر پیرس اور لائنس میں فاصلہ ہے اُس سے پانچ گنا سمجھنا چاہیے۔

ہندوستان کی قدرتی اور مصنوعی چیزیں

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اس ملک کا ایک ثمرا حصہ نہایت زرخیز ہے۔ مثلاً ایک بنگالہ ہی ایسا ہے جو نہ صرف گیہوں اور چاول وغیرہ اشیائے محتاج کی پیداوار کے لحاظ سے مصر سے افضل ہے بلکہ بہ لحاظ ریشم روئی اور نیل وغیرہ بےشمار تجارتی جنسوں کی پیدائش کے بھی جو مصر میں پیدا نہیں ہوتیں اُس سے کہیں بڑھکر ہے اس کے سوا ہندوستان کے اور حصے بھی بخوبی آباد ہیں اور زراعت بھی خاصی ہوتی ہے اور اگرچہ یہاں کے اہلِ حرفہ

بالطبع کاہل ہیں مگر تاہم کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً قالین۔ کمخواب چکن۔ کارچوبی اور زردوزی وغیرہ کے کام اور دوسرے قسم کی ریشمی اور سوتی چیزیں جو ملک کے اندر برتی جاتی یا باہر بھیجی جاتی ہیں بناتے رہتے ہیں۔

غیر ملکوں سے سونے چاندی کی ہندوستان میں درآمد

یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سونا چاندی دنیا میں پھر پھرا کر جب ہندوستان میں پہنچتا ہے تو یہیں کھپ جاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ سے جو روپیہ آکر فرنگستان کے ملکوں میں پھیلتا ہے اُس میں سے کسی قدر تو اُن چیزوں کے مبادلہ میں جو ٹرکی اور روم سے آتی ہیں مختلف ذریعوں سے ٹرکی میں چلا جاتا ہے۔ اور کسی قدر بندرگاہ سمرنا کے راستے سے ایران میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے ریشم فرنگستان میں آتا ہے۔ اب ٹرکی کا یہ حال ہے کہ وہاں کے لوگ قہوہ کے بغیر نہیں رہ سکتے جو یمن سے آتا ہے۔ اور ٹرکی اور یمن اور ایران تینوں کو ہندوستان کی چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ پس اس طرح پر بندر مخا میں جو بحر احمر کے کنارے باب المندب کے قریب ہے اور بصرہ میں جو خلیج فارس کے سرے پر ہے اور بندر عباس میں جو جزیرہ ہرمز کے نزدیک ہے ان ملکوں سے روپیہ آتا ہے اور یہاں سے اُن جہازوں کے ذریعہ سے جو ہر سال ہوائے موافق کے موسم میں ہندوستان کا مال لے کر ان مشہور بندرگاہوں میں آتے ہیں ہندوستان میں پہنچ جاتا ہے یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہندوستانیوں، ڈچوں، انگریزوں اور پرتگیزوں کے تمام جہاز جو ہر سال ہندوستان کا مال پیگو۔ تناسرم (دھناسری)، سیام۔ سیلان۔ آچین۔ مکاسر۔ جزائر مالدیپ موزمبیق وغیرہ مقامات کو لے جاتے ہیں وہ بھی اُس کے مبادلہ میں سونا چاندی ہی لاتے ہیں اور یہ بھی اُس روپیہ کی طرح جو بندر مخا۔ بصرہ۔ اور بندر عباس سے آتا ہے یہیں رہ جاتا ہے۔ اور جو سونا چاندی ڈچ لوگ جاپان کی کانوں سے نکالتے ہیں اُس میں سے بھی تھوڑا بہت کسی نہ کسی وقت یہاں آجاتا ہے اور جو روپیہ براہ راست فرانس اور پرتگال سے آتا ہے وہ بھی شاذ و نادر ہی یہاں سے پھر باہر جاتا ہے کیونکہ اُس کے عوض بھی مال واسباب ہی دیا جاتا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ ہندوستان کو تانبا، لونگ۔ جائپھل۔ دارچینی وغیرہ چیزوں اور ہاتھیوں کی ضرورت رہتی ہے کہ جن کو ڈچ۔ فرنگستان۔ جاپان۔ ملاکا اور سیلان سے لاتے ہیں۔ اور سیسہ بھی باہر ہی سے آتا

ہے ۔ جس میں سے تھوڑا سا انگلستان سے انگریز بھیجتے ہیں اور فرانس سے بانات اور دوسری چیزیں آتی ہیں اور غیر ملک کے گھوڑوں کی بھی ضرورت رہتی ہے ۔ جو ہر سال پچیس ہزار سے زیادہ ملک ازبک (ترکستان) سے اور بہت سے قندھار کے رستے ایران سے ۔ اور بندر مخا اور بصرہ اور بندر عباس کی راہ سے اتھوپیا (حبش)، اور عرب اور فارس سے آتے ہیں ۔ اسی طرح بہت سا تر و خشک میوہ سمرقند ۔ بلخ ۔ بخارا ۔ اور ایران سے آتا ہے مثلاً سردے ۔ سیب ۔ ناشپاتی اور انگور جو کثرت سے دہلی میں خرچ ہوتے ہیں ۔ اور جاڑے بھر بڑی قیمت پر بکتے رہتے ہیں اور بادام ۔ پستہ ۔ فندق ۔ زرد آلو ۔ خوبانی کشمش وغیرہ جو بارہ مہینے ملتے ہیں ۔ اسی طرح کوڑیاں جزائر مالدیپ سے آتی ہیں جو بنگالہ اور دوسرے مقامات میں بجائے پیسے دھیلے وغیرہ کم قیمت سکوں کے مستعمل ہیں ۔ اور عنبر جزائر مالدیپ اور موزم بیق سے آتا ہے ۔ اور گینڈے کے سینگ اور ہاتھی دانت اور غلام اتھوپیا سے اور مشک اور چینی کے برتن چین سے اور موتی بحرین اور ٹوٹی کارن سے جو سیلان کے نزدیک ہے آتے ہیں ۔ مگر باوجود اس کے ان چیزوں کے بدلے سونا چاندی نہیں جاتا کیونکہ جو سوداگر یہ جنسیں لاتے ہیں وہ اس میں زیادہ فائدہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے مبادلہ میں یہاں کی جنسیں ہی اپنے ملک کو لے جائیں ۔ پس اگرچہ ہندوستان میں غیر ملکوں سے قدرتی یا مصنوعی چیزیں آتی ہیں مگر وہ دنیا بھر کے سونے یا چاندی کے ایک بڑے حصہ کی جو بہت سے ذریعوں سے یہاں آتا ہے ۔ یہیں رہ جانے میں روک نہیں ہیں ۔ اور پھر وہ بمشکل ہی یہاں سے کہیں کو واپس جاتا ہے ۔

شہنشاہ مغل کی دولتمندی کے ذرائع

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کوئی امیر و منصب دار چھوٹا یا بڑا مرتا ہے تو اُس کی جائداد سرکار بادشاہی میں ضبط ہو جاتی ہے اور اس سے بڑھکر یہ امر ہے کہ ہندوستان کی تمام زمین مکانات اور باغات کے سوا جن کے فروخت وغیرہ کی اجازت بعض اوقات رعایا کو دیدی جاتی ہے بادشاہ کی ملکیت ہے ۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس تمام بیان سے میں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگرچہ سونے چاندی کی کانیں یہاں نہیں ہیں مگر تاہم سونا چاندی یہاں کثرت سے ہے اور یہ کہ شہنشاہ مغل جو اس ملک کے ایک بڑے حصہ کا مالک ہے اُس کا محاصل بے شمار اور وہ نہایت ہی دولت مند ہے ۔ لیکن باوجود اس کے بہت سے ایسے اسباب

بھی رہتی ہیں جو مقابلتاً اُس کی دولت مندی کے نقصان کے باعث ہیں۔ مثلاً ملک کے بہت سے وسیع حصے جن سے ہندوستان کی شہنشاہی مرکب ہے۔ خشک پہاڑوں اور ریت کے بیابانوں سے کچھ ہی اچھے ہیں۔ طریق زراعت بھی خراب ہے۔ اور آبادی بھی بہت ہی کم ہے۔ اور قابل زراعت زمین کا ایک بڑا حصہ کاشت کاروں کی قلت کی وجہ سے جو اکثر حکام کی بدسلوکی سے تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں خالی پڑا رہتا ہے[1]۔ چنانچہ یہ بیچارے غریب آدمی جب اپنے سخت گیر اور لالچی حاکموں کی خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتے تو نہ صرف اُن کے رزق کا ذریعہ ہی چھین لیا جاتا ہے بلکہ اُن کے بال بچے بھی پکڑ کر لونڈی غلام بنا لیے جاتے ہیں۔ اور یہ بیچارے اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی قدر آرام سے دن کاٹنے کے لئے شہروں یا لشکر گاہوں میں چلے جاتے اور حمالی سقائی یا سائیسی وغیرہ کر کے اپنا پیٹ پال لیتے ہیں اور بعضے کسی راجہ کے علاقہ میں جہاں یہ ظلم و ستم کسی قدر کم دکھائی دیتے ہیں[2]۔ اور یہاں کی نسبت کچھ آرام ملتا ہے بھاگ جاتے ہیں۔ اور اس سلطنت میں بہت سی قومیں ایسی بھی آباد ہیں جن پر بادشاہ

---

[1] جیسا کہ راجپوتانہ میں اب بھی ہے۔ س م ح

[2] یہ بات بالکل سچ ہے۔ چنانچہ اُن اسباب کے بیان میں جن کے باعث کوچ بہار کی فتح کے بعد اُس علاقہ کی رعایا نے بغاوت کی اور اپنے بھاگے ہوئے راجہ بھیم نرائن کو واپس بلا کر پھر قائم کر لیا۔ خود صاحب عالمگیرنامہ نے بضمن واقعات ۱۰۷۲ھ مطابق سال چہارم و پنجم جلوس اورنگ زیب جو کچھ لکھا ہے مزید وثوق کے لئے ہم اس جگہ بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

"و ایں سانحہ بدان جہت وقوع یافت کہ جمعے کہ بہ نظم و نسق مہمات مالی آں ولایت متعین گشتہ بودند باقتضائے مصلحت و تدبیر کار نکردہ بدستورے کہ در ممالک محروسہ بادشاہی معمول است شروع در جمعبندی آں ولایت و مطالبت اموال از رعیت نمودند۔ از آں جا کہ زمینداران مملکت ہندوستان بمقتضائے تدبیر بجہت تسخیر قلوب و استمالت رعایا کہ سر از ربقۂ اطاعت و مال گذاری ہا بر ندارند در محال زمینداری خویش مساہلہ و اغماض بکار می برند و دستور و قانونے کہ در ممالک محروسہ معمول است بعمل نمی آرند و بھیم نرائن نیز برین وتیرہ عمل می کرد کافہ رعایائے آں جا از وقوع آں معاملہ و قرار آں دستور کہ از آئین معہود آں دیار بعید بود و با ہیئت بتنہ بیچ سمت ظہور داشت رم گیر و متوحش و نفور گشتہ خواہان بھیم نرائن شدند و او را بالعزور آمدن از کوہستان و تحریک سلسلہ فساد ترغیب نمودند و بیگی اہل آں دیار باو پیوستند و دیگر بارہ او را بحکومت ریاست برگزیدند و بر سر محمد صالح نام یکے از منصب داران بادشاہی کہ در موضع کتل باڑی بود ریختند۔ س م ح

کی کامل حکومت نہیں ہے اور اکثر اُن میں سے ایسی ہیں جن کا رئیس خود انھیں میں کا ایک شخص ہے اور صرف اُس وقت خراج ادا کرتے ہیں جب کہ سلطنت کی طرف سے کچھ زور ڈالا جاتا ہے۔ اور اُن میں سے اکثر تو بہت تھوڑا خراج دیتے ہیں۔ اور بعض کچھ بھی نہیں دیتے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ دینا تو کیا اُلٹا کچھ لیتے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو سرحدِ ایران پر ہیں شاذونادر ہی ایران یا ہندوستان کو کچھ خراج دیتی ہیں۔ ایسا ہی حال بلوچستان اور اور پہاڑی قوموں کا ہے جو شہنشاہ مغل کو بجز قدرِ قلیل کچھ نہیں دیتیں اور اپنے آپ کو تقریباً خودسر اور آزاد سمجھتی ہیں اور اُن کی خودسری اور آزادی اس سے ثابت ہے کہ شہنشاہ مغل نے جب قندھار کے محاصرہ کی غرض سے کابل جانے کے لئے مقام اٹک سے کوچ کیا (جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے) تو اُن قوموں نے پہاڑوں سے اُن میدانوں میں آب رسانی کے ذریعے مسدود کر دیئے جو شاہراہ سے متصل تھے اور جب تک بادشاہ سے انعام حاصل نہ کر لیا۔ جو خیرات کے نام سے عنایت کیا گیا تھا فوج کا آگے بڑھنا ناممکن سا بنا دیا۔ پٹھان لوگ بھی بڑے سرکش ہیں اور یہ وہ مسلمان قوم ہے جو پہلے بنگالہ کی جانب گنگا کے کنارے آباد تھی اور مغلوں کے[1] ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے اکثر مقامات میں اُن کو بہت قوت حاصل تھی۔ خصوصاً دہلی[2] میں اُن کا بہت ہی زور تھا۔ اور اُس کے قرب و جوار کے بہت سے راجہ اُن کے خراج گذار تھے۔ اس قوم کے ادنیٰ شخص یہاں تک کہ ایسے لوگ بھی جو سقائی کر کے گذران کرتے ہیں دلیر اور سپاہی منش ہیں۔ اور جب کسی بات کی صداقت پر زور دینا چاہتے ہیں تو اُن کا یہ معمولی مقولہ ہے "کہ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو دہلی کا تخت مجھے نصیب نہ ہو" یہ ہندو اور مغل دونوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے پہلے رتبہ اور اقتدار کو یاد کر کے مغلوں سے (جنھوں نے ان کے بزرگوں کو اُن کی بڑی بڑی ریاستوں سے بے دخل کر دیا اور دہلی اور آگرہ سے دور پہاڑوں کی جانب نکال دیا) سخت نفرت کرتے ہیں اور ان میں سے اگرچہ بعض بعض پہاڑوں میں چھوٹے چھوٹے رئیس بن بیٹھے ہیں مگر کچھ زیادہ طاقت ور نہیں ہیں۔

شاہ بیجاپور بھی خراج نہیں دیتا بلکہ اپنے ملک کے بچانے کے لئے شہنشاہ ہندوستان

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ سوری کی سلطنت سے مراد ہے۔

[2] لودھیوں کی سلطنت سے مراد ہے۔

سے ہمیشہ لڑتا رہتا ہے۔ لیکن اُس کے ملک کی حفاظت کا ذریعہ صرف اُس کی فوج ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سی خاص حالتیں ہیں۔ مثلاً اُس کا ملک آگرہ اور دہلی سے جو شہنشاہ مغل کے دار السلطنت ہیں بہت فاصلہ پر ہے۔ اور شہر بیجاپور بذات خود بھی ایک مستحکم مقام ہے اور قرب وجوار کے ملک میں گھاس اور پانی کی کمیابی اور خرابی کی وجہ سے حملہ آور فوج کو آسانی کے ساتھ وہاں تک پہنچنا دشوار ہے۔ اور بہت سے راجہ خود اپنے بچاؤ کی خاطر غنیم کے حملہ کے وقت اپنی اپنی فوجیں لے کر اُس کی مدد کو آجاتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ سیواجی نامی ایک مشہور شخص نے خاص شاہی عملداری میں گھس کر بندر سورت کو جو دولت مندی کے لحاظ سے ایک مشہور جگہ ہے خوب لوٹا اور جلایا۔ اور یہ چال چل کر بیجاپور کو عین ضرورت کے وقت بادشاہی فوجوں کے زور اور غلبہ سے بچالیا۔

ان باتوں کے علاوہ شاہ گولکنڈا بھی جو ایک دولت مند اور طاقتور بادشاہ ہے مخفی طور پر اُس کو روپیہ پیسے سے مدد دیتا رہتا ہے۔ اور سرحد پر ہمیشہ اس غرض سے فوج متعین رکھتا ہے کہ ایک تو اپنے ملک کی حفاظت کرے اور دوسرے اگر بیجاپور پر زیادہ زور پڑے تو اُس کو بھی مدد دے سکے۔ الغرض جو لوگ شہنشاہ مغل کو کچھ خراج نہیں دیتے اُن میں سو سے[1] زیادہ اچھے طاقتور ہندو راجہ بھی شامل ہیں جن کی ریاستیں دہلی اور آگرہ سے کوئی دور کوئی نزدیک تمام سلطنت کے اندر جا بجا پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے پندرہ

---

[1] فی زمانہ تمام ہندوستان کے چھوٹے بڑے ہندو اور مسلمان والیان ملک جو ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ قیصر ہند کے ظل عاطفت شاہنشاہی میں گورنمنٹ ہند کی پولیٹیکل نگرانی کے نیچے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنے اپنے علاقوں میں فرماں روائی کا اختیار رکھتے ہیں چار سو پچاس کے قریب ہیں۔ جن میں بعض سے گورنمنٹ انگریزی قابل برداشت اور معینہ طور پر کچھ سالانہ خراج لیتی ہے۔ اور بعض سے کچھ بھی نہیں بلکہ جن کی ریاستوں کی بقا اور قیام کے لئے اپنی بے نظیر فیاضی سے شہنشاہی سرکار نے اُن کے بے اولاد ہونے کی حالت میں عموماً متبنیٰ کر لینے کا بھی اختیار دیا ہوا ہے۔ باعتبار رقبہ کے پانچ لاکھ میل مربع زمین اور پانچ کروڑ رعایا پر ان کی حکومت ہے۔ اور فوج ان کل ریاستوں کی شمار میں تین لاکھ پینتالیس ہزار ہے۔ مگر باقاعدہ اور کام کے لائق اور مختلف کیفیت ہونے کی وجہ سے کمی زیادہ تر ہے۔ اور بمقابلہ اس کے کل سلطنت ہند کا رقبہ معہ ملک برہما متوسط حدید دیگر باستثناء بلوچستان و نیپال و کھوٹان کی ریاستوں کے جن کی پیمائش اور مردم شماری ابھی

باستولہ تو بہت ہی دولت مند اور زبردست ہیں خصوصًا رانائے اودے پور (جو کسی وقت ان راجاؤں کا شہنشاہ خیال کیا جاتا تھا اور جس کو راجہ پورٹس[1] کی نسل سے بتاتے ہیں) اور جے سنگھ اور جسونت سنگھ ایسے ہیں کہ اگر یہ تینوں اتفاق کر لیں تو شہنشاہ کے لئے بڑے خطرناک ثابت ہوں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک بیس ہزار سوار لڑائی کے لئے ہر وقت مہیا کر سکتا ہے اور وہ بھی ایسے عمدہ کہ ہندوستان میں کوئی اُن کے مقابلہ کا نہیں ہے۔ یہ سوار راجپوت کہلاتے ہیں جس کے معنی ہیں راجاؤں کی اولاد سپاہ گری ان کا آبائی پیشہ ہے اور اس شرط پر اُن کو جاگیریں ملتی ہیں کہ ہمیشہ گھوڑے پر سوار راجہ کی رفاقت میں رہیں۔ یہ لوگ بڑے جفاکش ہیں اور اگر لڑائی کے فن کی تعلیم دی جائے تو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ نہیں ہوئی) پندرہ لاکھ میل مربع اور قریب چھبیس کروڑ کے مردم شماری ہے پس اس حساب سے منجملہ کل رقبہ سلطنت کے مذکورہ بالا ہندوستانی والیانِ ملک کے قبضہ میں ایک ثلث زمین ہے۔ اور کل مردم شماری میں سے پانچویں حصہ سے کچھ کم ان کی رعیت ہے اور گورنمنٹ ہند کی آمدنی جو ۵۶ء کی بجٹ کی رو سے چھتر کروڑ روپیہ ہے اس کے مقابلہ میں ان سب ریاستوں کی آمدنی من کل الوجوہ قریب ایک چوتھائی کے ہے۔ مگر گورنمنٹ انگریزی کی چھتر کروڑ سالانہ آمدنی خزانہ میں وہ کروڑوں روپیہ شامل نہیں ہے جس کو لوکل فنڈ لوکل ریٹ میونسپل فنڈ وغیرہ کہتے ہیں۔ اور جس کا مقصود یہ ہے کہ جس شہر یا ضلع سے جن مقاصد مخصوصہ رفاہ رعایا کے لئے لیا جاتا ہے اُنھیں مقاصد اور اُنھیں مقامات کے سوا اور کسی اور مقام میں صرف نہیں کیا جاتا۔ البتہ چھتر کروڑ روپیہ کی رقم ایسی ہے کہ سرکار جس طرح چاہتی ہے اس کے خرچ کی تفریق کرتی ہے۔ مگر ہندوستانی ریاستوں کی طرح اس میں سے بھی خزانہ سلطنت میں پس انداز اور جمع کچھ نہیں کیا جاتا۔ سال بار جس قدر آتا ہے۔ اسی قدر رعایا کی بہتری اور انتظام سلطنت کے کاموں میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔ اور برخلاف شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانہ کی طرز حکومت کے جس میں ریاستوں کی رعایا شاہی رعیت سے زیادہ آرام پاتی تھی اب گورنمنٹ انگریزی کی رعایا زیادہ خوش حال اور فارغ البال ہے۔ م ح

[1] یہ وہی شخص ہے جس کا نام نظامی نے سکندر نامہ میں پور لکھا ہے جو ایک زبردست راجہ تھا جس کا راج کوہ کمایوں سے لے کر قنوج تک تھا اور جو ستلج کے شمالی کنارہ پر سنہ مسیحی سے تین سو اٹھائیس برس پہلے مقدونیا کے مشہور و معروف بادشاہ سکندر اعظم سے لڑ کر مغلوب ہو گیا تھا۔ اور سکندر کی سلطنت ہندوستان میں قنوج تک ہو گئی تھی۔ م ح۔

نہایت ہی عمدہ سپاہی بن سکتے ہیں۔ یہ بات بھی بتا دینی ضروری ہے کہ شہنشاہ مغل مسلمانوں کے "سنی" فرقہ میں سے ہے جیسے کہ ترک لوگ ہیں جو پیغمبر اسلام کا سچا خلیفہ عثمان کو جانتے اور عثمانی[1] کہلاتے ہیں۔ مگر دربار کے امرا زیادہ تر ایرانی ہیں جن کا مذہب شیعہ ہے اور اس امر کے معتقد ہیں کہ برحق خلیفہ علی تھے۔ ان باتوں کے سوا شہنشاہ مغل اس ملک میں اجنبی ہے۔ کیونکہ وہ تیمور کی نسل سے ہے جو ان مغلوں کا سردار تھا جو ممالک تاتار سے آئے تھے۔ اور جس نے (ایک ہزار چار سو ایک میں ہندوستان کو تاخت وتاراج اور فتح کیا تھا اس لحاظ سے گویا دشمنوں کے ملک میں یا کم سے کم ایسے ملک میں جہاں ایک مغل بلکہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں سیکڑوں ہندو موجود ہیں قوت قائم رکھنے اور سرحد پر ازبکوں اور ایرانیوں کے حملوں کی روک تھام کے لئے اُس کو صلح کے زمانہ میں بھی ایک بڑی فوج تیار رکھنی پڑتی ہے۔ جس میں یا تو اس ملک کے باشندے بھرتی ہیں جیسے راجپوت اور پٹھان۔ یا اصل مغل اور وہ لوگ جو اگرچہ مغل نہیں ہیں اور اسی وجہ سے اُن کی دیسی قدر بھی نہیں ہے۔ مگر پردیسی اور مسلمان اور گورے رنگ کے ہونے کی وجہ سے مغل ہی کہلاتے ہیں لیکن زمانہ سابق کے موافق امرائے دربار اب اکثر مغل نہیں ہیں۔ یا تو ازبک وترکستانی ایرانی۔ عرب۔ ترک (رومی) وغیرہ لوگوں کا مجموعہ ہیں۔ یا ان سب قسم کے لوگوں کی ہندوستان میں پیدا ہونے والی اولاد میں سے ہیں۔ مگر ان سب اقسام کے لوگوں کو ایک عام لقب کے طور پر مغل ہی کہا جاتا ہے۔ مگر ہاں مجھے اس بات کا بیان کر دینا بھی مناسب ہے کہ مذکورہ بالا اقسام کے نووارد مسلمانوں کی اولاد جو تیسری چوتھی پشت میں گندمی رنگ اور ہندوستانیوں کی طرح کاہل مزاج ہو جاتی ہے اس کی قدر تازہ وارد لوگوں کی سی نہیں کی جاتی[2] اور اُن کو شاذ و نادر ہی کوئی عہدہ دیا جاتا ہے۔ اور وہ اُس کو اپنی خوش طالعی سمجھتے ہیں کہ کہیں سواروں یا پیدلوں میں نوکری مل جائے۔

شہنشاہ مغل کی فوجی قوت خداوند من اب اس بات کا موقعہ ہے کہ میں شہنشاہ مغل

[1] سلاطین عثمانیہ کے عثمانی کہلانے کی وجہ اور مصنف کے اس بیان کی غلطی ہم ایک حاشیہ میں اسی جلد کے کسی گذشتہ صفحہ میں لکھ چکے ہیں اُس کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ س م ح

[2] جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بھی بمقابلہ ولایت زاد انگریزوں کے مخلوط النسل اور ہندوستان زاد انگریزوں کی قدر و منزلت کم ہے۔ س م ح

کی سپاہ کا خاص طور سے کچھ ذکر کروں، تاکہ آپ اُن کثیر اخراجات کے متعلق جو انہیں کو فوج کی بابت کرنے پڑتے ہیں اپنی رائے قائم کرسکیں کہ آیا حقیقتاً اس کی فوج کس قدر ہے اور وہ کن لوگوں میں سے بھرتی کی جاتی ہے۔ پس پہلے میں اُس ویسی فوج کا ذکر کرتا ہوں جس کی تنخواہ کا ادا کرتے رہنا بادشاہ پر واجبات سے ہے۔

واضح ہو کہ جے سنگھ، جسونت سنگھ اور دوسرے راجہ جن کو بڑی بڑی رقمیں اس فرض سے ملتی ہیں کہ اپنے ہم قوم راجپوتوں کی ایک خاص تعداد شاہی خدمات کے لئے ہمیشہ تیار رکھیں ان کی فوجیں اسی ذیل میں ہیں۔ اور اُن سے خواہ اُس فوج میں کام لیا جائے جو ہمیشہ حاضر رکاب رہتی ہے خواہ کسی صوبہ میں مگر منصب مسلمان اُمرا کے برابر ہیں۔ اور جن قاعدوں کی پابندی اُن پر واجب ہے۔ ان پر بھی واجب ہے یہاں تک کہ اپنی جمعیت کے ساتھ معمولی چوکی دینے کو حاضر ہوتے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ جب کبھی بادشاہ قلعہ میں ہوتا ہے تو یہ باہر اپنے خیموں ہی میں رہ کر نوکری بجا لاتے ہیں۔ اور چوبیس گھنٹے تک قلعہ کی دیواروں کے اندر محصور رہنے کو گوارا نہیں کرسکتے اور جب تک کہ ان کے جاں باز راجپوت سپاہی ساتھ نہ ہوں کسی قلعہ کے اندر جانا قبول نہیں کرتے۔ راجپوتوں کی جاں بازیوں کا امتحان ایسے موقعوں پر بخوبی ہوچکا ہے۔ جب کہ کسی راجہ کو قید کرلینے کا ارادہ کیا گیا۔

راجپوت راجاؤں کی فوج میں بھرتی کرنے کے اسباب

بادشاہ جو ان راجاؤں کو اپنی ملازمت میں رکھتا ہے اس کے کئی سبب ہیں۔ اول یہ کہ راجپوت نہ صرف عمدہ سپاہی ہیں بلکہ جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں بعض راجہ ایک روز میں بیس ہزار سپاہی لڑائی کے لئے حاضر کرسکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو راجہ پادشاہی ملازم نہیں ہیں اور خراج دینے یا ضرورت کے وقت جنگی خدمات کے بجا لانے کے عوض خود مقابلہ کو تیار ہوجاتے ہیں اُن کی مزاحمت اور تنبیہ و تادیب کا کام ان سے لیا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ شہنشاہ مغل کی یہ پالیسی ہے کہ ان راجاؤں کے درمیان نااتفاقی اور حسد و رشک قائم رہے۔ چنانچہ جب چاہتا ہے کسی ایک کی نسبت اپنی مہربانی و التفات کا اظہار کرکے اُن میں لڑائی کرا دیتا ہے چوتھے یہ کہ راجپوت لوگ پٹھانوں یا کسی باغی امیر یا صوبہ دار کے دبانے کے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔ اور اس کام کے لئے ہمیشہ مستعد اور تیار ملتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ جب کبھی گولکنڈے کا بادشاہ خراج ادا نہیں کرتا یا شاہ بیجاپور

یا اپنے کسی اور ہمسایہ راجہ کی مدد کو جس کو شہنشاہ مغل مطیع کرنا چاہتا ہے تیار ہو جاتا ہے۔ تو اُس کے مقابلہ کے لیئے ان راجاؤں کو اور امرا پر جو اکثر ایرانی اور بادشاہ گولکنڈے کے ہم مذہب ہیں ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ یہ راجہ اُس وقت کام آتے ہیں جب کہ شاہ ایران سے لڑائی کا موقعہ آن پڑتا ہے اور امرائے دربار جو ایران کے رہنے والے ہیں جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے اس خیال سے کانپتے ہیں کہ اپنے اصلی بادشاہ سے لڑیں خصوصاً وہ اُس کو اولاد علیؓ[1] اور اپنا امام اور خلیفہ ماننے کی وجہ سے اُس کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھانے کو نہایت گناہ سمجھتے ہیں۔

اور جن اسباب کے تحت راجپوتوں کی فوج رکھی جاتی ہے اُسی قسم کی وجوہ سے شہنشاہ مغل کو پٹھانوں کی بھی ایک فوج موجود رکھنی پڑتی ہے۔

ولایتی مغل فوج مغلیہ فوج کا (جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں) تیار رکھنا بھی ایسا ہی ضروری ہے۔ چونکہ سلطنت کی اصل فوج یہی سپاہ ہے۔ اور اس پر بڑا روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ آپ کے نزدیک بھی اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جانا بے موقعہ نہ ہوگا۔ اس فوج میں سوار بھی ہیں اور پیادے بھی۔ اور اس کے دو حصے خیال کیئے جا سکتے ہیں جن میں سے ایک تو ہمیشہ حاضر رکاب اور دوسرا مختلف صوبوں میں متعین رہتا ہے۔ فوج حاضر رکاب میں سے پہلے اُمرا پھر منصب دار پھر روزینہ دار اور سب سے اخیر میں معمولی سواروں کا ذکر کر کے اس کے بعد فوج پیادہ اور اس کے ضمن میں بندوقچیوں اور تمام پیدل سپاہیوں کا جو دونوں قسم کے توپ خانوں میں کام دیتے ہیں بیان کرتا ہوں۔

دربارِ مغلیہ کے امرا کی حیثیت یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دربارِ مغلیہ کے امیر بھی امرائے فرانس کی طرح موروثی امیر ہیں۔ کیونکہ سلطنت کی تمام زمین بادشاہ کی ملکیت ہے اور اسی وجہ سے یہاں کوئی ایسی خاندانی ریاست نہیں ہے جیسے کہ ہمارے کسی ڈیوک یا مارکوئیس کی ہوتی ہے اور نہ کوئی ایسا خاندان پایا جا سکتا ہے جو خود اپنی

---

[1] مصنف کے زمانہ میں یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ شاہانِ صفویہ فرماں روائے ایران ذات کے سید تھے مگر اُن کا امام یا خلیفہ مانا جانا بالکل غلط ہے۔ گو سیادت کے باعث سے کیسے ہی واجب الادب سمجھے جاتے ہوں۔ س م ح